اوراقِ سیرت

مولانا سیّد جلال الدین عمری

فہرست مضامین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اوراقِ سیرت — ترتیب جدید

اوراقِ سیرت کے پہلے ایڈیشن پر مولانا حفیظ الرحمٰن عمری مدنی مدیر اعلیٰ ماہ نامہ 'راہ اعتدال' عمرآباد، ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی سابق صدر شعبۂ اسلامیات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور پروفیسر مسعود الحسن سابق صدر شعبۂ انگریزی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے بہت تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب کا مضمون ان کے مجموعۂ مضامین 'نقوش سیرت نبویؐ' میں اور پروفیسر مسعود الحسن کا مضمون ان کے مقالات ومکتوبات کے مجموعہ 'مایۂ خویش' میں شامل ہے۔ اسے محمد حارث بن منصور نے مرتب کیا ہے۔ ان اصحاب نے اپنے مضامین میں بعض مشورے بھی دیے ہیں۔ ترتیب جدید میں انھیں پیش نظر رکھا گیا ہے۔ افسوس کہ پروفیسر مسعود الحسن ۹ / مارچ ۲۰۱۹ء کو اس دارفانی سے رحلت فرماگئے، اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو شرفِ قبولیت بخشے اور لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

کتاب میں سیرت کا مطالعہ خالص دعوتی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔ دعوت کا آغاز کس طرح ہوا، وہ کن مراحل سے گزری، اس کے لیے کیا طریقۂ کار اختیار کیا گیا، مخالفین سے کس طرح کارِ دعوت میں تعاون حاصل کیا گیا؟ اسلام کی عالمی سطح پر تبلیغ و اشاعت کے لیے کیا اقدامات کیے گئے؟ ان تمام امور میں آپ کی حکمت عملی اور دانش مندانہ تدابیر کیا رہیں؟ مضامینِ کتاب میں ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ آپ کے اسوۂ حسنہ کا ایک اہم پہلو ہے۔ اس سے موجودہ حالات میں ہمیں راہ نمائی ملتی ہے۔

کتاب کی جدید ترتیب میں کافی تبدیلی کی گئی ہے اور مضامین میں زیادہ مناسبت پیدا کی گئی ہے۔

آغاز کتاب میں دو مضامین 'رحمۃ للعالمین ﷺ — سیرت اور تعلیمات' اور 'آخری رسول — آخری راہ نما' دعوتی اور تبلیغی مقصد سے لکھے گئے ہیں۔ اس لیے ان کا انداز دیگر مضامین سے مختلف ہے، ان سے آپؐ کی سیرت کا عمومی تعارف ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں شامل کیا گیا ہے۔

کتاب میں بعض علمی مسائل کی تحقیق و تنقیح بھی ہے۔ اس میں راقم نے اپنی رائے پیش کی ہے جو حتمی نہیں ہے۔ اس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سیرت کی اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور اپنی شایانِ شان اس کے اجر سے نوازے۔

سید جلال الدین عمری

۲۰/اکتوبر ۲۰۲۱ء

اوراقِ سیرت
کے مآخذ

قرآن مجید رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا سب سے مستند ماخذ ہے۔ اس میں آپ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف پہلو، کہیں اجمال اور کہیں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ اس سے آپ کی بعثت سے پہلے عرب کی حالت، ان کے عقائد، ان کی روایات اور بعثت کے بعد آپ کی تبلیغ و دعوت اور مخالفین کا ردِعمل سامنے آتا ہے۔ آپ کے اوّلین مخاطب مشرکین عرب کے ساتھ اہلِ کتاب بھی تھے۔ قرآن مجید میں ان کی دینی اور اخلاقی پستی، کتاب اللہ میں ان کی تحریفات، رسول اللہ ﷺ سے ان کی عداوت اور سازشوں کا ذکر ہے اور ان سے بچنے کی تدابیر بیان ہوئی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان میں صالح افراد بھی ہیں جو قابلِ ستائش ہیں۔ اسی طرح مخلص صحابہ کرامؓ کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے تعلق، ان کا اخلاص، ان کی دعوتی جدوجہد اور قربانیاں، دوسری طرف منافقین کا ناپسندیدہ کردار اور ان کی ریشہ دوانیاں بھی زیرِ بحث آئی ہیں۔ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی عبادات، اللہ تعالیٰ سے آپ کا تعلق، آپ کے اخلاق کریمانہ، آپ کی خانگی زندگی اور آپ کے غزوات کی بھی کسی قدر تفصیل موجود ہے۔ اس مجموعہ کے بعض مضامین قرآن ہی کی روشنی میں تحریر کیے گئے ہیں اور دوسرے مضامین میں بھی اس کی تعلیمات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

سیرت کا دوسرا ماخذ کتبِ حدیث ہیں۔ ان کتابوں کا مقصد ہی رسول اللہ ﷺ کے قول وعمل اور تقریر (جس عمل پر آپؐ نے نکیر نہیں کی اور سکوت اختیار فرمایا) کو محفوظ کرنا ہے۔ کتب حدیث میں وحی و رسالت، آپؐ کی دعوتی جدوجہد، آپ کی عبادات، آپ کے شب و روز کے معمولات، آپ کے اخلاق، آپ کا زہد وغنا، آپ کی معیشت، آپ کا لباس اور پوشاک اور وضع قطع کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اسی طرح عبادات، نکاح و طلاق، تجارت اور معیشت، جہاد فی سبیل اللہ، مغازی، امن و صلح، حکومت و سیاست اور حدود وتعزیرات جیسے تمام امور میں آپ کی تعلیمات اور آپ کے اقدامات کی تفصیلات موجود ہیں۔ کتبِ حدیث میں صحیح روایات کے ساتھ ضعیف روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان کی چھان بین کی جو بے نظیر کوشش محدثین نے کی ہے، اس سے ان کی صحت و ضعف کا فیصلہ آسانی سے ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے اسماء الرجال کے وسیع ذخیرہ سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ انہیں درایت کے معیار پر بھی پرکھا جاسکتا ہے۔ ان مضامین میں ممکنہ حد تک سیرت کے سلسلے میں حدیث سے استفادہ کیا گیا ہے اور کہیں کہیں حدیث کے حوالے کے ساتھ روایت و درایت کے پہلو سے اس کے مقام کے تعیین کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے، بعض اوقات یہ عام دلچسپی کا باعث نہ ہو، لیکن توقع ہے کہ اس سے ان مضامین کو استناد حاصل ہوگا۔

سیرت کا ایک اہم ماخذ وہ کتبِ سیرت ہیں جو خاص اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سوانحِ سیرت کے ہمہ جہت احاطہ کی کوشش کی گئی ہے۔ جن واقعات کی طرف قرآن اور حدیث میں اشارے ہیں یا مجملاً ان کا ذکر ہے، کتب سیرت میں ان کی از اوّل تا آخر پوری تفصیل موجود ہے۔ بہ طور مثال ہجرت حبشہ یا ہجرت مدینہ کا ذکر آئے تو کتب سیرت ان افراد کی تعداد، ان کے نام اور سفر کی کیفیت بھی بیان کردیتی ہیں، جنھوں نے ہجرت کی۔ اسی طرح غزوات کا تذکرہ ہوتو چھوٹے بڑے غزوات وسرایا، ان کا پس منظر، ان میں شریک افراد، شہداء اسلام اور فریق مخالف کی ہلاکتوں کی تفصیل بھی کتب سیرت میں مل جاتی ہے۔

اسلامی تاریخ کے دورِ اول میں کتب حدیث اور کتب سیرت کی تالیف و تدوین کا عمل ایک ساتھ شروع ہوا۔ علماء امت کی دونوں ہی کی طرف توجہ رہی۔ پہلی صدی کے بعد جو سیرت نگار نمایاں مقام کے حامل رہے ہیں، جنہوں نے اپنے پیش رو اصحاب کی روایات اور تصانیف سے بھی استفادہ کیا اور خود بھی اپنے ذرائع سے نئی معلومات فراہم کیں۔ وہ یہ ہیں:

۱۔محمد بن عمر الواقدی (م۲۰۷ھ)۔ واقدی نے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا خاص موضوع مغازی رہا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے کی سب سے زیادہ معلومات فراہم کی ہیں۔ سیرت نگاروں نے ان پر اعتماد کیا ہے اور ان کے حوالے دیے ہیں، لیکن محدثین کے نزدیک ان کی شخصیت متنازع رہی ہے۔

۲۔محمد بن سعد بن منیع البصری (۱۶۸-۲۳۰ھ)۔ ابن سعد اہل علم کے نزدیک ثقہ اور قابل اعتماد ہیں۔ ان کی کاتب الواقدی کی حیثیت سے شہرت ہے۔ ان پر اس پہلو سے جرح کی گئی ہے کہ واقدی پر ان کا زیادہ اعتماد رہا ہے۔ ان کی معلومات کا بڑا ذریعہ واقدی کی تصنیفات ہیں[1] اس کے باوجود ان کی کتاب 'الطبقات الکبریٰ' سیرت کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اس میں انہوں نے واقدی کے علاوہ اپنے پیش رو دیگر مصنّفین سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

---

[1] امام نووی فرماتے ہیں:

وطبقات ابن سعد عظیم کثیرالفوائد وھو ثقة لکنّه کثیرالروایة فیه عن الضعفاء منهم شیخه محمد بن عمروالواقدی لا ینسبه بل یقتصر علی اسمه واسم ابیه وشیخه هشام بن محمد بن السائب الکلبی۔

(سیوطی، تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی:۲/۳۸۱)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ طبقات ابن سعد عظیم کتاب ہے۔ اس کے بکثرت فوائد ہیں۔ وہ خود تو ثقہ ہیں لیکن انھوں نے کم زور راویوں سے روایت کی ہے۔ ان میں ان کے شیخ محمد بن عمروالواقدی بھی ہیں۔ وہ ان کی طرف روایت کی نسبت نہیں کرتے، بلکہ ان کے صرف نام پر اور ان کے شیخ ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

۳- محمد ابن اسحٰق (پیدائش: ۸۵ھ وفات: ۱۵۱اور ۱۵۳ کے درمیان)۔ تاریخ اور سیرت پر ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔انہوں نے اپنی کتاب میں سیرت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کی شخصیت اہل علم کے درمیان زیرِ بحث رہی ہے۔ بعض نے انہیں ثقہ اور قابل اعتماد قرار دیا ہے تو بعض نے ان پر جرح کی ہے اور ان کے پیش کردہ مواد اور معلومات پر شک و شبہ کا اظہار کیا ہے۔

۴- ابن ہشام (محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب الحمیری ۲۱۸ھ) نے ابن اسحٰق کی سیرت کی تلخیص و تہذیب کی۔ غیر متعلق مباحث کو حذف کیا اور فروگزاشتوں کی اصلاح کی۔ ابن ہشام کی اس خدمت کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور سیرت ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی سیرت کی جگہ لے لی۔ اس کی شرحیں لکھی گئیں اور تلخیص بھی کی گئی۔ سیرت نگاروں کا اس پر بڑا اعتماد رہا ہے۔

۵- طبری (م ۳۱۰) ان حضرات کے بعد امام ابن جریر طبری نے 'تاریخ الامم والملوک' تصنیف کی۔ اس میں ابتداء آفرینش سے اپنے دور تک کے حالات جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں سیرت کے متعلق معلومات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ طبری مورخ ہی نہیں مفسر اور فقیہ بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے پیش رو سیرت نگاروں کے مواد کو ممکنہ تحقیق کے ساتھ جمع کیا ہے۔

یہ پانچ شخصیات وہ ہیں جو سیرت کے میدان میں سب سے نمایاں مقام کی حامل ہیں اور جن کی تصنیفات کو بنیادی مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے علاوہ بعض اور اصحاب نے بھی سیرت پر براہِ راست معلومات فراہم کی ہیں۔ لیکن متاخرین نے ان ہی پانچ پر زیادہ تر اعتماد کیا ہے۔ ان ہی کی تصنیفات سے اخذ و استفادہ کیا ہے اور ان ہی کے فراہم کردہ مواد کو اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سیرت کے میدان میں ان کوششوں کی قدر و قیمت تسلیم شدہ ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حدیث کی طرح سیرت کے سلسلے میں صحت کا اہتمام

نہیں ہوا۔ ان کی چھان بین اور تحقیق کا حق ادا ہوا اور نہ اس کے لیے اصولِ حدیث کی طرح اصول وضع ہوئے۔ اس وجہ سے ان میں ضعیف اور قوی، قابلِ اعتماد اور ناقابلِ اعتبار، ہر طرح کی روایات جمع ہوگئیں۔ اس لیے اہلِ علم نے توجہ دلائی ہے کہ ان سے واقعاتِ سیرت اخذ کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔[۱]

کتبِ سیرت میں معروف اور مشہور روایات کے ساتھ شاذ روایات بھی ملتی ہیں۔ ان سے جدت اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے اور قاری چونکتا ہے۔ ان کی بنیاد پر مشہور روایات کی تردید کی جاسکتی ہے اور بعض اوقات کی بھی جاتی ہے، جو حزم و احتیاط کے منافی ہے۔ پیشِ نظر مضامین میں کتبِ سیرت سے اخذ و استفادہ میں دو باتوں کا خیال رکھا گیا ہے:

ایک یہ کہ مشہور روایات کو بنیاد بنایا جائے اور شاذ روایات سے احتراز کیا جائے۔ ان کا ذکر ہو تو ان کی حیثیت واضح کردی جائے۔ دوسرے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان ہی روایات کو لیا جائے جنہیں ان سیرت نگاروں نے نقل کیا ہے جو ائمۂ حدیث اور اس فن کے ماہر ہیں، جیسے امام ذہبی، علامّہ ابنِ کثیر، علامّہ ابنِ قیم اور حافظ ابنِ حجر رحمہم اللہ۔ کہیں کہیں اس میں کوتاہی بھی ہوئی ہوگی۔ بہرحال ان مضامین کو اپنی حد تک معتبر بنانے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن انسان کی کوئی بھی کوشش خامیوں سے پاک نہیں ہوسکتی۔ والعصمۃ والعظمۃ للہ وحدہ۔

---

۱ اس کی کسی قدر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۱/ ۳، ۴

دیباچہ

اللہ تعالیٰ کے رسول، سرورِ دو عالم، محمد عربی، فداہ ابی و امی کی حیاتِ طیبہ ہر اس شخص کے لیے اسوۂ حسنہ ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ (الاحزاب:۲۱) اسی سے بے خطا راہ نمائی مل سکتی ہے اور یہی دارین کی سعادت کا ذریعہ ہے۔ اس جہانِ فانی میں بڑے بڑے مفکرین، مصلحین اور دانش ور پیدا ہوئے، لیکن آپ جیسا ہمہ صفت راہ نما اسے نہ مل سکا۔ تاریخ کے ہر دور میں اور ہر قوم میں اللہ کے رسول آئے اور راہِ ہدایت دکھاتے رہے۔ دنیا کو آخری رسول کی آمد کا صدیوں سے انتظار تھا۔ رسولِ خدا حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے یہ طویل عرصۂ انتظار ختم ہوا۔ آپ سلسلۂ رسالت کی آخری کڑی ثابت ہوئے اور ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیے گئے۔ آپ کی شریعت آخری شریعت قرار پائی۔ اس نے تمام سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ اب آپ ہی کی راہ نمائی سب کے لیے ہے اور تا قیامت ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: **لو کان موسیٰ حیًّا لَمَا وَسِعَهُ اِلّا اتباعی**[1] (اگر موسیٰ [علیہ السلام] بھی زندہ ہوتے تو انہیں میری اتباع کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوتا)۔

تاروں سے یہ کہہ دو کوچ کریں، خورشید منور آتے ہیں
قوموں کے پیمبر آ تو چکے اب سب کے پیمبر آتے ہیں

---

(۱) مناوی، فیض القدیر۔ یہ حدیث الفاظ کے فرق کے ساتھ مختلف مناسبتوں سے مسند احمد، دارمی، بیہقی، ابن حبان، مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہے۔

جب کبھی کسی عنوان سے آپ کی سیرتِ مقدسہ کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی تو آپ کی عظمت کے نقوش دل و دماغ پر مرتسم ہوگئے اور یوں محسوس ہوا جیسے اس ناقص اور ادھوری دنیا میں انسان کامل کو پالیا۔ جس پہلو سے دیکھا، آپ کی حیاتِ مبارکہ آفتاب سے زیادہ تاب ناک نظر آئی۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

مطالعۂ سیرت کے دوران میں رہ رہ کر جی چاہتا اور ایک تمنا سی دل میں مچلنے لگتی کہ کاش یہ گناہ گار آپ کی سیرت مقدسہ اپنے الفاظ میں بیان کرتا۔ اس کی دنیائے علم میں کوئی قدر و قیمت نہ ہو تو بھی اس کے لیے باعثِ سعادت اور سرمایۂ آخرت ہوگی، لیکن جب دیکھتا کہ آپ کی رحلت کے بعد ہی سے سیرت نگاری کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ اس پر بڑے بڑے اساطینِ علم اور نام ور سیرت نگاروں کی انتہائی کوششیں صرف ہوئی ہیں اور ہر ایک نے اپنے نہج سے یہ خدمت انجام دی ہے تو اپنی کم مائیگی، بلکہ بے مائیگی کا احساس دامن گیر ہو جاتا اور اس خیال سے ہمت جواب دینے لگتی: 'ھل غادر الشعراءُ من متردّم' (کیا گزشتہ شعراء نے بعد والوں کے لیے کچھ چھوڑا ہے کہ وہ طبع آزمائی کریں) اس کے ساتھ یہ خیال بھی بہت دور ذہن کے کسی گوشے میں ابھرتا جیسے سات سمندر پار سے کوئی آواز آرہی ہو: کم ترک الأول للاٰخر (اگلوں نے بعد والوں کے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے) اس سے امید کی کلی کھلنے لگتی اور آرزوئے دل کے پورا ہونے کی توقع ہونے لگتی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ دل و دماغ پر یہ تصور چھاتا چلا گیا کہ اپنی کم علمی کی وجہ سے سیرت کے بالکل نئے گوشے نہ بھی تلاش کیے جاسکیں تو بعض پہلوؤں کو نمایاں کیا جاسکتا ہے۔ اسی احساس کے تحت کبھی کبھی قلم کو جنبش ہوئی اور متعدد مضامین ضبط تحریر میں آگئے۔ اب ان ہی مضامین کو ضروری حذف و اضافہ کے بعد یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ ان مضامین کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱- آب و تابِ سیرت

رسولﷺ کی سیرت وسوانح پر قدیم وجدید مصنّفین نے اپنے اپنے اسلوب میں پوری تفصیل فراہم کردی ہے۔ راقم نے رحمۃ للعالمین کے عنوان سے بہت ہی اختصار کے ساتھ آسان انداز میں آپ کی سیرت اور اساسی تعلیمات پیش کی ہیں۔اس میں حوالوں کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ اسی مجموعہ کے دوسرے مضامین میں اس کے بیش تر حوالے موجود ہیں۔ اس کے بعد ایک مضمون میں آپ کی دعوت عام کا ذکر ہے۔ قرآن مجید نے مشرکین، اہلِ کتاب اور تمام نوعِ انسانی سے خطاب کیا ہے اور اسلام کی دعوت دی ہے ۔ ان مضامین میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ کارِ دعوت کو جاری رکھنا امت مسلمہ کی ذمہ داری اور اس کا فرض منصبی ہے۔

قرآن مجید نے آپ کی سیرت کو آپ کی رسالت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ (یونس:۱۶) ایک مضمون میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس سلسلے کے ایک مضمون میں ختمِ نبوت اور اس کے دلائل کا ذکر ہے۔

۲- دعوتِ اسلام

اس باب کے تحت رسول اللہﷺ کی دعوت، اس کے مراحل اور آپ کی حکمتِ عملی کا ذکر ہے۔ یہ اس مجموعہ کا سب سے وسیع باب ہے۔ اسے مکی اور مدنی ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مکی دور میں اعلانِ رسالت، اس کا سب سے پہلے استقبال کرنے والوں کا ذکرِخیر، دعوتِ عام، ردعمل اور آزمائشیں، ہجرتِ حبشہ، مواخاتِ مکہ، دعوت کی راہ میں غیر مسلم سرداران قبائل کا تعاون جیسے مضامین آئے ہیں۔ مدنی دور سے متعلق مضامین میں ہجرتِ مدینہ اور اس کی تاریخی اہمیت، صلح حدیبیہ کی ایک دفعہ کی وضاحت، آپ کے تبلیغی احکام و ہدایات، فرماں روایانِ عالم کو دعوتی مکاتیب اور وفودِ عرب کی مدینہ آمد جیسے مباحث شامل ہیں۔ ان میں سے بعض مباحث ایک ہی عنوان کے تحت شائع ہوئے تھے۔

یہاں انہیں الگ الگ عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے اور بعض مضامین میں نئے مواد کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۳- علمی احسانات

اس باب کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی احادیث بھی دین میں حجت ہیں۔ دونوں اساسِ دین ہیں۔ ایک مضمون میں علم کی فضیلت و اہمیت اور اس کی ترغیب وتشویق سے متعلق آپؐ کے ارشادات کی کسی قدر تشریح ہے۔ ایک اور مضمون میں آپ کے علمی احسانات اور فروغ علم کے لیے عملی اقدامات کا بیان ہے۔ مسجد نبوی سے متصل صفہ کی حیثیت درس گاہِ نبوی کی تھی، جہاں سے حاملینِ علوم نبوت تیار ہوئے۔ اس سلسلے کے آخری مضمون میں اس کا تفصیلی ذکر ہے۔

ان مضامین کا زمانۂ تحریر تقریباً نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ مختلف اوقات میں یہ قلم بند ہوتے رہے۔ کبھی کبھی ان کے درمیان طویل وقفہ بھی رہا۔ اس وجہ سے ان میں کہیں کہیں تکرار کا احساس ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر مضمون چوں کہ اپنی جگہ مستقل ہے، اس لیے اسے باقی رکھا گیا ہے۔ اسے مضمون کی ضرورت سمجھنا چاہیے۔ ان مضامین میں کہیں کہیں ضمناً بعض علمی مسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔ امید ہے یہ افادیت سے خالی نہ ہوں گے۔

میں عزیزم ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا شکر گزار ہوں کہ ان مضامین کی جمع و ترتیب میں ان کا تعاون حاصل رہا۔ انہوں نے ان مضامین کی توجہ سے پروف ریڈنگ کی، کہیں کہیں ذیلی عنوانات قائم کیے، جہاں ضرورت محسوس کی حوالے چیک کیے، انہیں جدید نسخوں کے مطابق کیا اور اس کی کتابیات تیار کی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور علم و عمل میں اضافہ فرمائے۔

مجھے خوشی ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ان مضامین کو اہلِ علم نے قدر کی نگاہ سے دیکھا، ان کے بعض عنوانات کو مزید مطالعہ اور تحقیق کا موضوع بنایا اور

انہیں آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ یہ میرے لیے ہمت افزائی کا باعث ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی ذاتِ اقدس ہمہ صفت تھی۔ یہ شاعری نہیں، حقیقت ہے۔

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپؐ کی زندگی کے کسی پہلو کو حیطۂ تحریر میں لانے کے لیے علمی بصیرت اور ژرف نگاہی کے ساتھ طہارتِ قلب ونظر، آپؐ کی ذات سے محبت اور جذبۂ اطاعت کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ بندۂ عاجز ان دونوں خوبیوں سے محروم ہے، لیکن سیرت کا مطالعہ اپنی اصلاح کا بھی بڑا ذریعہ ہے۔ دورانِ مطالعہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ظلمت کدۂ قلب میں روشنی کی کرن پھوٹ رہی ہے اور آپ کے نقوش قدم کی پیروی کا جذبہ ابھر رہا ہے۔ دعا ہے کہ اس طرح دل کی کثافتیں دور ہوں اور جو پاکیزہ جذبہ گاہے گاہے ابھرتا ہے، مستقل ہوجائے۔

اے اللہ! میں نے تیرے حبیب، رہ نمائے عالم محمد عربی ﷺ کی کتابِ سیرت کے چند اوراق پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ اے اللہ! ان بے جان اوراق میں اپنے فضل وکرم سے جان ڈال دے اور قلم کی سیاہی کو جلوۂ عام عطا فرما کہ اس کی تابانی ہر سو پھیلے اور اس سے ہر گوشے میں فائدہ اٹھایا جائے۔ قلم نے جہاں کہیں لغزش کھائی ہے اسے درگزر فرما اور اس کے اثرات سے محفوظ رکھ۔ اے اللہ! یہ جو کچھ ہوا ہے، تیرے کرم سے ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا، تیرے کرم ہی سے ہوگا۔ اے اللہ! تو غنی از ہر دو عالم اور ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ میں تیرے لطف وعنایت کا محتاج ہوں اور تا ابد محتاج رہوں گا۔ اے اللہ! تیرے رسول ﷺ نے زندگی کی جو صراطِ مستقیم دکھائی ہے، اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور استقامت سے نواز دے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ○ وَ تُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔

۲۶ر صفر ۱۴۳۶ھ/ ۱۹ر دسمبر ۲۰۱۴ء جلال الدین عمری

وَ مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ○ [الانبیاء:۱۰۷]

ہم نے آپ کو سارے جہاں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔

آب و تابِ سیرت

بلغ العلٰی بکمالہٖ　　کشف الدُّجٰی بجمالہٖ

حسنت جمیع خصالہٖ　　صلُّوا علیہِ و آلہٖ

- رحمۃ للعالمین ﷺ: سیرت اور تعلیمات
- آخری رسول - آخری رہ نما
- ختم نبوت - وجوہ و اسباب
- سیرت - دلیلِ رسالت

رحمۃ للعالمین ﷺ: سیرت اور تعلیمات

[’آخری رسول-حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم- سیرت اور پیغام‘ کے عنوان سے اس عاجز کا ایک کتابچہ اپریل ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ آپ کی سیرت مطہرہ اور آپ کی بنیادی تعلیمات کے ابتدائی تعارف کے لیے اسے مفید سمجھا گیا اور خاص طور پر سیرت سے متعلق مہمات میں اس سے بڑے پیمانے پر فائدہ اٹھایا گیا۔ اب تک اس کے سات ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ہندی اور بعض علاقائی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ اب کی بار میں نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔ آپ کی تعلیمات کے ذیل میں جن آیات و احادیث کا صرف ترجمہ پیش کیا گیا تھا ان کے اصل الفاظ نقل کردیے ہیں۔ مضمون کی ترتیب اور اس کا عنوان تبدیل کردیا ہے۔ اب یہ کتابچہ ’رحمۃ للعالمین ﷺ -سیرت اور تعلیمات‘ کے نام سے شائع ہورہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اس کی افادیت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو۔ اب مزید نظر ثانی اور کسی قدر حذف و اضافہ کے بعد یہ رسالہ پیش ہورہا ہے۔]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے لیے سامانِ حیات عطا کیا، جس سے وہ زندہ رہتا اور اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ اس کے لیے اس نے زمین اور اس کے چاروں طرف کی فضا میں حیرت انگیز انتظام فرمایااور اس سے استفادے کی راہیں کھول دیں۔ اسی اللہ برتر نے انسان کی ہدایت و رہ نمائی کا بھی اپنی طرف سے انتظام فرمایا، تاکہ وہ سیدھی راہ پر گام زن رہے اور جہالت و نادانی کی وجہ سے گم راہی میں مبتلا

نہ ہو۔ چناں چہ جب سے انسان زمین پر آباد ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیجے اور ان میں سے بعض پر اپنی کتابیں بھی نازل کیں۔ یہ سلسلہ ہزاروں سال تک قوموں اور ملکوں میں جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ کے رسول آتے اور راہِ ہدایت دکھاتے رہے، لیکن جب تمدن نے ترقی کی، قوموں اور ملکوں کے تعلقات نے وسعت اختیار کی اور ایک دوسرے کے خیالات سے واقفیت کے مواقع انہیں حاصل ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کی راہ نمائی کے لیے اور ہمیشہ کے لیے حضرت محمد ﷺ کو آخری رسول کی حیثیت سے بھیجا اور اپنا آخری ہدایت نامہ، قرآن مجید آپ پر نازل فرمایا۔

ابتدائی زندگی

چھٹی صدی عیسوی کا نصف آخر تھا کہ جزیرہ نمائے حجاز کے مشہور شہر مکہ میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیدائش ہوئی۔ (ولادت باسعادت ۲۰/اپریل ۵۷۱ء۔ رحلت ۸/جون ۶۳۲ء) آپ کا تعلق قبیلۂ قریش سے تھا۔ قریش حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد اور ان کے تعمیر کردہ خانۂ کعبہ کے متولی تھے۔ اس وجہ سے عرب میں سب سے معزز سمجھے جاتے تھے۔ آپ کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام آمنہ تھا۔ آپ جب پیدا ہوئے تو سر سے والد کا سایہ اٹھ چکا تھا۔ آمنہ نے اپنے اس یتیم بچے کی پرورش شروع کی۔ ابھی عمر کا چھٹا سال تھا کہ والدہ کا چراغِ حیات گل ہوگیا۔ دادا عبدالمطلب نے آپ کو اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیا اور بیٹوں سے زیادہ پیار اور محبت سے آپ کی نگہ داشت کرنے لگے، لیکن اس پر صرف دو ہی برس گزرے تھے کہ آٹھ سال کی عمر میں دادا اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور آپ کے چچا ابوطالب کی کفالت میں آپ کو دے گئے۔ چچا نے اولاد کی طرح آپ کی پرورش کی۔

عہد اور ماحول

آپ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھا۔

اس میں بڑی اخلاقی خرابیاں اور سماجی برائیاں پائی جاتی تھیں۔ شراب عام تھی، محفلوں میں خم کے خم لنڈھائے جاتے اور اس پر فخر کیا جاتا تھا۔ جوئے اور قمار بازی کا عام چلن تھا۔ فحاشی اور بدکاری کوئی عیب نہ تھا۔ پیشہ ور عورتیں جھنڈے لگا کر اپنے اڈوں پر بیٹھا کرتی تھیں۔ آوارہ لوگ وہاں دادِ عیش دینے جایا کرتے تھے۔ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کا دور دورہ تھا۔ کم زوروں کے حقوق بری طرح پامال ہو رہے تھے۔ عورت حددرجہ مظلوم تھی، اس کے کچھ حقوق نہ تھے۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے واقعات بھی پیش آجایا کرتے تھے۔ یتیموں کا پوچھنے والا کوئی نہ تھا، ان کے وارث ان کو اور ان کے مال کو اپنی ملکیت تصور کرتے تھے۔ غلاموں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ لوگوں کے اندر شدید قبائلی تعصب پایا جاتا تھا۔ بات بات پر انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا اور آمادۂ پیکار ہوجاتے۔ انہیں اپنی زبان دانی اور شاعری پر فخر تھا، لیکن ان کی شاعری میں شراب و کباب اور حسن و عشق کے تذکرے ہوتے، باپ دادا پر فخر کیا جاتا، جنگی کارناموں، گھوڑوں، اونٹوں، تلواروں، نیزوں اور دیگر سامانِ حرب وضرب کا ذکر ہوتا۔ اخلاق اور تہذیب و شرافت کے لیے اس میں مشکل ہی سے جگہ ملتی۔ محمد ﷺ کے شب و روز ان تمام خرابیوں سے پاک گزر رہے تھے۔ آپ کی حیاتِ طیبہ اس گندے ماحول میں صاف شفاف نگینے کی طرح چمک رہی تھی۔ آپ ایک با اخلاق، راست باز اور امانت دار انسان کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔

ابھی آپ کم سن ہی تھے کہ آپ کے چچا ابوطالب نے شام کا تجارتی سفر کیا۔ آپ کے اصرار پر وہ آپ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ راستے میں قافلے نے ایک جگہ قیام کیا۔ بحیریٰ نامی ایک راہب نے آپ کو دیکھ کر کہا کہ اس بچے میں وہ علامات موجود ہیں جو توریت اور انجیل میں آخری پیغمبر کی بیان ہوئی ہیں۔

حضرت خدیجہؓ سے نکاح

حضرت خدیجہؓ مکہ کی ایک شریف اور مال دار خاتون تھیں۔ وہ اپنا مالِ تجارت

کسی نہ کسی کے ذریعے باہر بھیجا کرتیں اور اس کا معاوضہ ادا کرتیں یا منافع میں شریک کرلیتیں۔ رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت، دیانت و امانت اور اخلاق کے چرچے انہوں نے سن رکھے تھے۔ انہوں نے درخواست کی کہ آپ ان کا مال لے جائیں، وہ دوسروں کو جو معاوضہ دیتی ہیں اس سے زیادہ دیں گی۔ آپ ان کا مال لے کر شام کے سفر پر روانہ ہوئے، اسے فروخت کیا اور مکہ کے بازار کے لیے دوسری چیزیں خرید کر لے آئے۔ اس سے دوگنا فائدہ ہوا۔ سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ آپ کے ساتھ تھا۔ اس نے دیکھا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایتیں ہیں۔ اس نے حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر کیا۔ وہ ان سب باتوں سے متاثر ہوئیں اور اپنی دولت و ثروت کے باوجود آپ سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے خاندان کے لوگوں سے مشورہ کیا۔ سب نے اسے پسند کیا اور حضرت خدیجہؓ سے آپ کا عقد ہو گیا۔ حضرت خدیجہؓ اس وقت چالیس برس کی تھیں اور بیوہ تھیں۔ آپ کی عمر پچیس سال تھی اور آپ دورِ شباب سے گزر رہے تھے۔ حضرت خدیجہؓ سے شادی کے دس سال بعد ایک اہم واقعہ پیش آیا، جس سے اہلِ وطن میں آپ کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

قریش میں آپؐ کا اعتبار

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ اس کی بنیادیں کم زور ہو گئیں تو قریش نے اس کی از سرِ نو تعمیر کی۔ اس دوران میں اس امر میں اختلاف رونما ہو گیا کہ حجرِ اسود کو، جو حضرت ابراہیمؑ کی خاص نشانی ہے، کون اس کی جگہ رکھے؟ بات یہاں تک بڑھی کہ کشت وخون کا اندیشہ ہونے لگا۔ اس پر ایک سردار نے مشورہ دیا کہ کل صبح سویرے خانۂ کعبہ میں جو شخص سب سے پہلے داخل ہو اسے حَکَم مان لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کہ دوسرے روز آپ پہلے شخص تھے جو حرم میں داخل ہوئے۔ سب نے آپ کو دیکھتے ہی کہا کہ ہماری قوم کا امین آ گیا ہے، یہ جو فیصلہ کرے وہ ہمیں منظور ہے۔ آپ

نے ایک چادر منگوا کر زمین پر بچھائی اور اس پر حجر اسود رکھ کر مختلف قبائل کے سرداروں سے کہا کہ وہ چادر کا ایک ایک حصہ تھام لیں اور پتھر کو اس کی ٹھیک جگہ پہنچائیں۔ جب پتھر وہاں پہنچا تو آپ نے اسے دستِ مبارک سے اس کی جگہ نصب کر دیا۔ سب اس فیصلے سے مطمئن تھے، اس لیے کہ اس سے کسی کی طرف داری یا کسی کی حق تلفی نہ ہوئی اور ہر قبیلہ اس سعادت میں شریک تھا۔

نبوت سے سرفرازی اور دعوت کا آغاز

رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا چالیسواں سال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز فرمایا۔ آپ مکہ کے قریب غارِ حرا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف تھے کہ آپ نے اللہ کے فرشتے (جبرئیلؑ) کو دیکھا۔ فرشتہ آپ سے قریب ہوا اور آپ کو اللہ کی کتاب قرآن مجید کی چند آیات سنائیں۔ وہ آیات آپ کو اس طرح ازبر ہوئیں کہ دل پر نقش ہوگئیں۔ یہ قرآن مجید کے نزول کا آغاز تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے کو دیکھنے اور اس سے اللہ کا پیغام سننے کا پہلا اتفاق تھا۔ آپ نے فطری طور پر ایک طرح کا خوف اور گھبراہٹ محسوس کی۔ گھر لوٹ کر اپنی اہلیہ حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے جان کا خوف لگ رہا ہے۔ انھوں نے تسلی دی اور کہا کہ ”اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی کسی پریشانی میں نہیں ڈالے گا اور آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔ اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، (باہر سے آنے والوں کی) مہمان نوازی کرتے ہیں، قرض داروں کا قرض ادا کرتے ہیں، جو محتاج اور تنگ دست ہے اس کی اعانت کی کوشش کرتے ہیں اور مشکلات میں دوسروں کے کام آتے ہیں۔“

حضرت خدیجہؓ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا یہ بے اختیار اظہار تھا۔ آدمی کی بیوی اس کی سب سے بڑی رازدار اور اس کے اندرونی حالات

سے سب سے زیادہ واقف ہوتی ہے۔ آپ کے کردار کے بارے میں حضرت خدیجہؓ کی یہ شہادت سب سے معتبر شہادت ہے۔اسی وجہ سے آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کرنے میں انہیں کوئی تأمل نہیں ہوا۔ وہ آپ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ وہ اس وقت کافی عمر رسیدہ تھے، انہوں نے شرک اور بت پرستی کو ترک کر کے عیسائیت قبول کرلی تھی۔ عیسائیت کے عالم تھے۔ عبرانی سے واقف تھے اور انجیل کی تعلیمات سے براہِ راست فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے آپ سے پہلی وحی کا حال معلوم کر کے کہا کہ آپ کے پاس وہی فرشتہ آیا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا کرتا تھا۔ مزید کہا کہ اس میں آپ کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ کی قوم آپ کو یہاں سے نکال دے گی۔آپ نے حیرت سے دریافت کیا کہ کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟ انہوں نے جواب دیا: ”ہاں، جو ہدایت آپ کو اللہ کی طرف سے ملی ہے، جو شخص بھی یہ ہدایت لے کر آیا اس کی قوم اس کی دشمن ہوگئی۔ اگر اس وقت تک میں زندہ رہا تو میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا“۔ لیکن ورقہ بن نوفل کا جلد ہی انتقال ہوگیا۔

اسلام کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے

اللہ کا دین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آہستہ آہستہ نازل ہو رہا تھا۔ موقع و محل کی مناسبت سے آپ کو ہدایات دی جارہی تھیں، لیکن آپ کے ماحول کے لیے وہ اجنبی تھیں۔ آپ نے اپنے بہت ہی قریب کے حلقے میں اس کا تذکرہ کیا اور اسے قبول کرنے کی دعوت دی۔ آپ نے اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر فرمایا۔ انہیں آپ کی صداقت پر ذرہ برابر شبہ نہ ہوا۔ وہ فوراً آپ پر ایمان لے آئیں۔ اس طرح انہیں سب سے پہلے ایمان لانے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد آپ نے ان لوگوں کو، جن سے آپ کی قریبی وابستگی تھی اور جن کے بارے میں اعتماد تھا کہ وہ آپ کی بات توجہ سے سنیں گے، اپنے رسول ہونے کی اطلاع دی۔ ان میں آپ کے قدیم رفیق

حضرت ابوبکرؓ، آپ کے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ اور آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ شامل تھے۔ان میں سے کسی کو آپ کی بات ماننے میں کوئی تردد نہیں ہوا اور وہ آپ پر ایمان لے آئے۔ تین سال تک آپ خاموشی سے اللہ کے دین کی دعوت دیتے اور اللہ کی کتاب قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہو رہا تھا، اسے پیش فرماتے رہے۔ اس کے نتیجے میں اور بہت سے لوگ آپ پر ایمان لے آئے۔

اعلانِ عام اور قوم کا ردِّ عمل

تین سال کے بعد رسول اللہ ﷺ نے عام تبلیغ شروع کر دی اور کھل کر اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دینے لگے۔ آپ نے کفر و شرک کو غلط اور بے بنیاد قرار دیا اور دلائل کے ساتھ اللہِ واحد کی عبادت اور اطاعت کا تصور پیش کیا۔ سماج میں پھیلی ہوئی خرابیوں پر سخت تنقید کی، کم زوروں کے حق میں آواز بلند کی، اپنی غلط تہذیب و معاشرت کو بدلنے، غیر اخلاقی روش کو چھوڑنے اور اخلاق کا پابند ہونے کی تعلیم دی اور بتایا کہ نجات کے لیے اللہ کے دین کو قبول کرنا اور اس کے دائرۂ اطاعت میں آنا ضروری ہے۔آپ کی اس دعوتِ عام کی مخالفت ہونے لگی اور وقت گزرنے کے ساتھ اس میں شدت آتی چلی گئی۔ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو ناقابلِ بیان اذیتیں پہنچائی جانے لگیں۔ حضرت بلالؓ کو تپتی ریت پر لٹا کر گھسیٹا جاتا۔ حضرت عمارؓ کو اتنی تکلیفیں دی گئیں کہ زبان سے اللہِ واحد کا نام لینا مشکل ہو گیا، ان کے والد یاسرؓ کو بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا، ان کی والدہ سمیہؓ کو ابوجہل نے خنجر مار کر ہلاک کر دیا، حضرت خبابؓ کو انگاروں پر لٹا دیا جاتا، پوری پیٹھ پر آبلے پڑ جاتے اور جسم کے بوجھ سے آگ ٹھنڈی ہوتی۔ خود رسول اکرم ﷺ کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا گیا۔

ہجرتِ حبشہ

جب حالات ناقابلِ برداشت ہوتے چلے گئے تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو

حبشہ ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا۔ حبشہ سے اہلِ مکہ کے تجارتی تعلقات تھے، اس لیے وہ ان کے لیے اجنبی ملک نہیں تھا۔ چناں چہ بہت سے صحابہ مکہ چھوڑ کر حبشہ چلے گئے۔ لیکن قریش نے وہاں بھی انہیں چین سے رہنے نہیں دیا۔ اپنے سفرا حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس دوڑائے۔ نجاشی عیسائی تھا اور اپنے مذہب کا بہت بڑا عالم تھا۔ سفیروں نے اس سے کہا کہ یہ لوگ ہمارے ہاں سے فرار ہو کر آئے ہیں۔ یہ ہمارے دین کے بھی مخالف ہیں اور عیسائیت کے بھی خلاف ہیں، انہیں واپس بھیج دیا جائے۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ معلوم کیا تو حضرت جعفرؓ نے اس کی وضاحت کی اور قرآن کی آیات سنائیں۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوا اور کہا کہ حضرت عیسیٰؑ اس سے ذرہ برابر مختلف نہ تھے۔ اس نے سفیروں کو ناکام واپس لوٹا دیا۔

شعبِ ابی طالب میں محصوری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام پریشانیوں کے باوجود مکہ ہی میں رہے اور دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے رہے۔ آپ کے چچا ابوطالب نے اسلام تو قبول نہیں کیا، لیکن آپ کی حمایت جاری رکھی ۔ مخالفین نے بہت کوشش کی کہ وہ آپ کی حمایت سے دست کش ہو جائیں اور آپ کو ان کے حوالے کر دیں۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ جب اس سے انہیں مایوسی ہوگئی تو انھوں نے آپ کے قبیلے بنو ہاشم کا معاشرتی مقاطعہ یا بائی کاٹ کر دیا کہ ان سے لین دین، شادی بیاہ اور کاروبار کا کوئی معاملہ نہیں کریں گے اور نہ ان کی کسی قسم کی مدد کریں گے۔ چناں چہ جناب ابوطالب کی سربراہی میں بنو ہاشم ایک گھاٹی میں محصور ہو کر رہ گئے۔ تقریباً ڈھائی سال اس طرح گزر گئے تو خود ان ہی میں سے بعض لوگوں کی کوششوں سے یہ مقاطعہ ختم ہوا ۔ اس عرصہ میں بھی آپ کا سلسلۂ دعوت و تبلیغ جاری رہا۔

حالات بدتر ہوتے گئے

رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا نواں سال تھا کہ آپ کو معراج حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ

نے آپ کو ایک ہی رات میں بیت المقدس کی زیارت اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کرائی۔ صبح آپ نے اس کا ذکر فرمایا تو آپ کے مخلص صحابہ نے اسے حق سمجھا اور درست مانا، لیکن مخالفین نے اسے مذاق کا موضوع بنا لیا۔ آپ نے جب بیت المقدس اور فلسطین کے حالات تفصیل سے بیان کیے تو مخالفین لاجواب ہو گئے، کیوں کہ سب جانتے تھے کہ آپ فلسطین کبھی نہیں گئے۔ اس کے باوجود مخالفت بدستور جاری رکھی۔ نبوت کے دسویں سال چند دنوں کے وقفے سے ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوگیا۔ حضرت خدیجہؓ صحیح معنوں میں آپ کی ہم درد، معاون اور غم گسار تھیں، ابوطالب زندگی بھر آپ کی حفاظت اور پشت پناہی کرتے رہے۔ ان کی حیات میں قریش آپ کے خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ ان دونوں کا انتقال بہت بڑا حادثہ تھا۔ لیکن آپ نے ہمت اور حوصلے کے ساتھ اسے برداشت کیا اور دعوتی سعی و جہد جاری رکھی۔

طائف کا سفر

جب مکہ میں حالات بد سے بدتر ہونے لگے اور آپ کی مخالفت میں اور زیادہ شدت آگئی تو آپ طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے سرداروں کے سامنے اللہ کا دین پیش کیا ۔ اسے قبول کرنے اور دعوت وتبلیغ کی مہم میں آپ کا ساتھ دینے کی درخواست کی۔ لیکن انہوں نے آپ کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور انہیں مذاق کا موضوع بنا لیا۔ کہنے لگے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو کوئی دوسرا آدمی نہیں ملا جو تم جیسے خستہ حال کو پیغمبر بنا دیا، ہم تم سے بات کرنا بھی نہیں چاہتے۔ حالات اتنے خراب تھے کہ آپ کے لیے مکہ واپسی مشکل تھی۔ مکہ کے ایک سردار نے آپ کو پناہ دی تو آپ مکہ میں داخل ہوئے۔

عرب کے نمایاں افراد جو مکہ آتے تھے رسول ﷺ ان سے ملاقات کرتے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے۔ حج کے زمانے میں مختلف قبائلِ عرب مکہ پہنچتے تھے۔ آپ ان سے ملاقات کرتے، ان کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش فرماتے، اسے قبول کرنے اور اس کی

دعوت و تبلیغ میں تعاون کی درخواست کرتے۔ آپ کے مخالفین آپ کے خلاف لوگوں کو ورغلاتے اور خوف زدہ کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنی سعی وجہد جاری رکھی۔

ہجرتِ مدینہ

حجاز کے ایک بڑے اور معروف شہر مدینہ میں اوس وخزرج دو بڑے قبیلے رہتے تھے۔ رسول ﷺ کی نبوت کا دسواں سال تھا کہ حج کے موقع پر آپ کی خزرج کے چھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے جب ان کے سامنے اسلام پیش فرمایا تو انہیں اس کے حق ہونے کا یقین ہوگیا اور وہ اسلام لے آئے۔ دوسرے سال حج ہی کے موقع پر مدینہ کے بارہ افراد اسلام کے آغوش میں آگئے۔ اس کے بعد مدینہ میں گھر گھر اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ نبوت کے تیرھویں سال اوس وخزرج کے بہتّر (۷۲) افراد کا وفد آیا۔ ان کے نمائندوں نے آپ کو مدینہ آنے کی دعوت دی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ آپ کی ہرطرح سے حفاظت کریں گے، آپ کی نصرت وحمایت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے، جان و مال کی قربانی پیش کرنے، وقتِ ضرورت دشمنوں کا جواب دینے اور مقابلہ کرنے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ اس سے فارغ ہوکر وہ خاموشی سے مدینہ واپس ہو گئے۔

اس کے بعد آپ نے اللہ کے حکم سے مدینہ ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے رفیقِ خاص حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ راتوں رات مکہ سے رخصت ہوگئے اور تین دن تک 'ثور' نام کے ایک غار میں روپوش رہے۔ ادھر اہلِ مکہ نے جب دیکھا کہ آپ مکہ سے رخصت ہو گئے ہیں تو آپ کے سر کی بازی لگا دی اور اعلان کیا کہ جو شخص محمد ﷺ کو گرفتار کر کے لائے گا اسے سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے۔ ایک شخص نے اس لالچ میں آپ کا تعاقب کیا، لیکن اس نے دیکھا کہ اس کے گھوڑے کے قدم بار بار ریت میں دھنس رہے ہیں اور وہ آگے نہیں بڑھ رہا ہے تو اس نے سوچا کہ میں اللہ کے ایک نیک بندے پر ہاتھ اٹھانے کا جو ارادہ کر رہا ہوں، گھوڑا اس کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ آپ سے قریب ہوا اور اسلام لے آیا۔

مدینہ میں آپ کے اوّلین اقدامات

آپ کے مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی اوس وخزرج کے قبائل مسلمان ہو چکے تھے۔ آپ کا بڑی گرم جوشی سے استقبال ہوا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد آپ نے تین اہم اقدامات کیے۔ ایک یہ کہ آپ نے مدینہ میں اسلامی معاشرہ قائم کیا، جس میں اہلِ ایمان آزاد فضا میں اخوت ومحبت اور اسلامی تعلیم کے مطابق زندگی گزار سکتے تھے اور اسے اسلامی ریاست کی شکل دے دی، جہاں اسلامی احکام وقوانین نافذ ہونے لگے۔ دوسرا اقدام آپ نے یہ کیا کہ مکہ سے آنے والے مہاجرین اور انصارِ مدینہ کے درمیان اخوت کا تعلق قائم کرا دیا کہ وہ ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہیں اور ان کے وہ حقوق تسلیم کریں جو بھائیوں کے ہوتے ہیں۔ تیسرا اقدام آپ کا یہ تھا کہ مدینہ کے اطرف میں جو یہود کے قبائل تھے ان سے امن کا معاہدہ کیا کہ وہ اپنے حدود میں اپنے قوانین پر عمل کریں گے، مدینہ کی حفاظت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے، کوئی بیرونی حملہ ہوتو اس کا دفاع کریں گے اور کسی بھی دشمن کا تعاون نہیں کریں گے۔

غزوات اور ان کا پس منظر

اہلِ مکہ نے جب دیکھا کہ مدینہ میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو پناہ حاصل ہوگئی ہے اور مدینہ کا انتظام آپ کی ہدایت اور راہ نمائی میں چل رہا ہے تو انہوں نے اسے ختم کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اس کا مقابلہ ضروری تھا۔ اس کے لیے آپ کو چھوٹے بڑے جنگی اقدامات کرنے پڑے۔ ان میں بدر، احد، خندق اور یہود کے قبیلہ بنی قریظہ اور خیبر کے واقعات اور فتح مکہ زیادہ مشہور ہیں اور اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم ان سے واقف ہے۔ جنگِ بدر سب سے پہلی جنگ تھی، جس میں مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے اور دشمن تقریباً ایک ہزار۔ مسلمانوں کے پاس جنگی ساز وسامان کی بہت کمی تھی اور مخالفین پوری طرح مسلّح تھے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کی تین گنا طاقت پر آپ کو اور

آپ کے ساتھیوں کو کام یابی عطا کی۔اس کے ایک سال بعد جنگِ احد ہوئی، جس میں مسلمانوں کو پہلے مرحلے میں فتح حاصل ہوئی، لیکن اس کے بعد شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ہجرت کے پانچویں سال قریشِ مکہ عرب کے اطراف و اکناف کے قبائل کو اکٹھا کر کے دس بارہ ہزار کی تعداد میں مدینہ پر حملہ کے لیے پہنچ گئے۔آپ نے مدینہ کے راستوں پر خندق کھود کر اس کے دفاع کا انتظام فرمایا۔ایک ماہ تک دشمن مدینہ کے باہر پڑاؤ ڈالے رہے۔اسی دوران میں اس قدر تیز آندھی چلی کہ وہ منتشر ہو گئے اور عملاً یہ جنگ نہیں ہوئی۔

ہجرت کے فوراً بعد یہود سے مدینہ کے دفاع کا معاہدہ ہوا تھا، لیکن انہوں نے اس کی صریح خلاف ورزی کی، مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے قریش کو ابھارا اور ہر طرح ان کی مدد کی۔ اس کے ساتھ رسول ﷺ کو شہید کرنے کی سازش کی۔ اس کے جواب میں ان کے خلاف بعض جنگی اقدامات کیے گئے۔تھوڑی سی مزاحمت کے بعد انہوں نے سپر ڈال دی ۔فریقین کا برائے نام نقصان ہوا۔

فتحِ مکہ

فتحِ مکہ اسلامی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔سن ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ اور قریشِ مکہ کے درمیان دس سال کے لیے ناجنگ معاہدہ ہوا تھا،جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں یہ بھی طے پایا تھا کہ جو قبیلہ جس فریق کے ساتھ جانا چاہے جاسکتا ہے۔اس کے تحت بنو بکر نے قریش کے ساتھ اتحاد کیا اور بنو خزاعہ رسول اللہ ﷺ کے حلیف بن گئے۔ ان دونوں قبائل کے درمیان دورِ قدیم سے عداوت چلی آرہی تھی۔ ایک موقع پر بنو بکر نے بنو خزاعہ پر شب خون مارا اور قریش نے پوری طرح اس کا ساتھ دیا۔رسول اللہ ﷺ اس صریح خلاف ورزی کے جواب میں دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ اچانک مکہ پہنچ گئے۔قریش نے خوف زدہ ہوکر ہتھیار ڈال دیے اور بغیر کسی جنگ کے مکہ فتح ہو گیا اور سارا عرب زیرِ نگیں آ گیا۔

پاکیزہ سیرت ـــــ اعلیٰ کردار

یہ ہے ان جنگوں کی حقیقت جن کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے اور دنیا پر رسولِ خدا حضرت محمد ﷺ کے جو عظیم احسانات ہیں ان سے توجہ ہٹانے اور ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو شخص بھی غیر جانب داری سے آپ کی سیرت کا مطالعہ کرے گا وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ آپ نے عقیدہ و اخلاق، انسانوں کے درمیان مساوات، کم زوروں کے حقوق کی حفاظت اور عدل و انصاف کا اعلیٰ و ارفع تصور ہی نہیں پیش کیا، بلکہ دنیا کو اس سے روشناس کرانے، اسے پھیلانے اور عام کرنے اور عملاً اسے قائم کرنے کے لیے جو مسلسل جد و جہد کی اور قربانی دی اس کی کوئی مثال تاریخ کے اوراق میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملے گی۔ اس راہ میں آپ کا صبر و ثبات، تحمل و برداشت، عفو و درگزر، ایثار وقربانی، اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیرت وہ منارۂ نور ہے جس سے حق وصداقت کی راہ پر چلنے والے رہتی دنیا تک روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔ آپ نے دنیا کو بتایا کہ ایک اعلیٰ نصب العین اور پاکیزہ مقصد کے لیے پاکیزہ سیرت اور اعلیٰ کردار کی بھی ضرورت ہے۔اس کے بغیر وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔

آپ نے جب اعلانِ رسالت کیا اور اللہ تعالیٰ کا جو دین نازل ہو رہا تھا اسے پیش فرمایا تو وہی لوگ جو آپ کے اوصافِ حمیدہ کے گن گا رہے تھے اور آپ کو صادق و امین کے القاب سے یاد کرتے تھے، آپ کے شدید مخالف ہو گئے اور آپ کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا۔ آپ کی تعلیمات کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ یہ محض شاعری ہے، اس سے پہلے بہت سے شاعر ہو گزرے ہیں، یہ بھی دنیا سے چلے جائیں گے، حالاں کہ اس وقت کی شاعری کے موضوعات اور اس کا انداز اور اسلوب سب کو معلوم تھا۔ قرآن مجید اس سے بالکل مختلف تھا۔ آپ اللہ کا جو کلام پیش فرما رہے تھے اس میں غیر معمولی تاثیر تھی اور دل بے اختیار اس کی طرف کھنچتے تھے۔ اس پر وہ آپ کو ساحر اور جادوگر کہا کرتے تھے،

جب کہ جادوگر عقیدے اور اخلاق کی اصلاح کے لیے نہیں کھڑے ہوتے۔آپ کو داستاں گو کہا گیا، حالاں کہ آپ قوموں کے عروج و زوال کے اصول بیان فرما رہے تھے، یہاں تک کہ آپ کو مجنوں اور پاگل کہنے میں بھی انہیں عار نہیں محسوس ہوا۔ ان بے ہودہ باتوں کے جواب میں پلٹ کر آپ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم ہو جو شاعری اور داستاں سرائی کررہے ہو، تمہارے دماغ میں فتور ہے اور تم پاگل ہو کہ حقیقت کا انکار کر رہے ہو، بلکہ اپنی بات مثبت انداز میں پیش فرماتے رہے۔

رسولِ خدا حضرت محمد ﷺ کو ذہنی اذیتیں ہی نہیں پہنچائی گئیں ، بلکہ آپ کو دق کرنے اور پریشان کرنے کی بھی کوشش ہوتی رہتی تھی۔

آپ کے پڑوسی رات میں آپ کے گھر کے سامنے گندگی ڈال دیتے۔آپ صبح باہر نکل کر جب گندگی دیکھتے تو اسے دور پھینک آتے اور اپنے پڑوسیوں سے صرف اتنا کہتے کہ تم میرے ہم سایہ ہی نہیں رشتہ دار بھی ہو۔ آخر یہ کیسی ہم سائیگی ہے؟ دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ آپ نماز میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں سجدہ ریز ہیں اور پشتِ مبارک پر اوجھڑی ڈال دی گئی۔ کبھی صحن میں کھانا تیار ہوتا تو اس میں گندگی ڈال دی جاتی ۔آپ خاموشی سے اسے باہر لے جاتے اور پھینک آتے۔

ایک مرتبہ سرِ مبارک پر مٹی ڈال دی گئی۔گھر تشریف لے گئے تو صاحب زادی حضرت فاطمہ رو رو کر سرِ مبارک دھونے لگیں ۔آپ نے تسلی دی: بیٹی رو ؤنہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارے باپ کی حفاظت کرے گا۔

اس سے بڑا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ میں نماز ادا فرما رہے تھے ۔عقبہ بن ابی معیط آگے بڑھا اور گردن میں چادر ڈال کر بری طرح گلا گھوٹنے لگا ۔حضرت ابوبکرؓ موجود تھے۔ انھوں نے اس ظالم کو دھکا دے کر ہٹایا اور کہا کہ اس شخص کا جرم کیا ہے ؟ کیا محض اس بنیاد پر اسے جان سے مار دو گے کہ وہ اللہ کو اپنا رب کہتا ہے؟اس کش مکش میں حضرت ابوبکرؓ کے سر پر بھی چوٹ آئی۔

طائف کے لوگوں کو آپ نے اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے اسے ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ آپ دل گرفتہ واپس جانے لگے تو وہاں کے نوجوانوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ راستے کے دونوں طرف جمع ہو کر آپ کا ٹھٹول اور مذاق اڑاتے اور جوں ہی آپ آگے بڑھتے، آپ کے پیروں پر پتھر مارتے تھے۔ اس سے آپ کے پیر لہو لہان ہو گئے اور آپ کو بچانے کی کوشش میں آپ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہؓ بھی، جو آپ کے ساتھ تھے، زخمی ہو گئے۔ آپ پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس حالت میں اللہ کا فرشتہ نمودار ہوا اور کہا کہ طائف والوں نے آپ کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اسے اللہ نے دیکھ لیا۔ آپ کہیں تو طائف کی دونوں پہاڑیوں کو اس طرح ملا دوں کہ یہ ان کے درمیان پس کر رہ جائیں۔ آپ نے فرمایا: میں یہ نہیں چاہتا۔ اگر یہ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو امید ہے کہ ان کی اولاد ایمان لائے گی اور اللہ واحد کی عبادت کرے گی۔

مکہ فتح ہوا تو وہ لوگ جنہوں نے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے، اپنا وطن مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا، جو ہمیشہ آپ کے خلاف محاذ آرا رہے اور جن سے آپ کو کئی جنگیں کرنی پڑیں وہ آپ کے سامنے نگوں سار کھڑے تھے۔ آپ چاہتے تو ان میں سے ایک ایک سے انتقام لے سکتے تھے۔ آپ نے ان سے سوال کیا: بتاؤ اب میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ وہ دشمن ہونے کے باوجود آپ کی سیرت و کردار سے واقف تھے۔ انہوں نے کہا: آپ شریف انسان ہیں اور شریف بھائی کی اولاد ہیں۔ آپ نے فرمایا: جاؤ آج تم سب آزاد ہو۔ تم سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ یہ اعلان سنتے ہی انہیں یوں محسوس ہوا جیسے موت کے منہ سے نکل آئے ہوں۔ اس کے بعد وہ سب اسلام میں داخل ہو گئے۔

انسانیت کے سب سے بڑے محسن

یہ تھے اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ۔ جو شخص بھی آپ کی زندگی، آپ کی تعلیمات اور نوع انسانی کی فلاح کے لیے آپ کی جدو جہد کو دیکھے گا، اس کا دل

بے اختیار پکار اٹھے گا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول اور نوع انسانی کے سب سے بڑے محسن تھے۔

حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ پر جو کتاب نازل فرمائی وہ قرآن مجید ہے۔آپ نے اپنے قول و عمل سے اس کی جو تشریح فرمائی اس کا نام سنت ہے۔قرآن و سنت کی تعلیمات اسلام کی اساس ہیں۔ آپ کا دنیا پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپ نے اسے صحیح عقیدہ اور فکر دیا، اعلیٰ اخلاقی اصول عطا کیے، عدل و انصاف پر مبنی قانون دیا، پاکیزہ تہذیب اور معاشرت سے روشناس کرایا اور ایک ایسا نظامِ حیات عطا کیا جس میں انسان کے لیے دنیا اور آخرت کی فلاح اور کام رانی پائی جاتی ہے۔ یہاں آپ کی بعض اساسی تعلیمات پیش کی جا رہی ہیں۔

(ا) انسان کے سامنے ہمیشہ سے یہ سوال رہا ہے کہ یہ دنیا کیسے وجود میں آئی؟ کیا یہ یوں ہی چلتی رہے گی یا کسی وقت ختم ہوجائے گی؟ وہ یہاں زندگی کیسے گزارے؟ اس کا کوئی متعین راستہ ہے یا اسے یوں ہی بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے؟ اس کے صحیح یا غلط اعمال کا فیصلہ کب ہوگا؟ ان کا کوئی نتیجہ کبھی سامنے آئے گا یا نہیں؟ اس سوال کے ٹھیک جواب سے انسان کی زندگی صحیح رخ پر چلنے لگتی ہے اور جواب غلط ہوجائے تو رخِ حیات بھی غلط ہوجاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں اس بنیادی سوال کا دوٹوک جواب ہمیں ملتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ دنیا خود بہ خود وجود میں نہیں آئی اور نہ اسے بہت سی ہستیوں نے پیدا کیا ہے، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، وہی اسے چلا رہا ہے، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی ہم سر اور شریک نہیں ہے۔ وہی انسان کا خالق و مالک اور پروردگار ہے۔ اس نے انسانوں کی ہدایت و راہ نمائی کے لیے اپنے رسول بھیجے۔ جو شخص ان کی اطاعت کرے گا

وہ سیدھی راہ پر گام زن رہے گا اور کام یاب ہوگا اور جو اس سے انحراف کرے گا ناکامی اور نامرادی سے دو چار ہوگا۔ یہ دنیا، جس میں انسان کو عقیدہ وعمل کی آزادی حاصل ہے، ایک روز ختم ہوجائے گی اور ایک غیر فانی اور ہمیشہ رہنے والی دنیا وجود میں آئے گی۔ اس وقت ہر فرد اپنے فکر وعمل کی جزا یا سزا پائے گا۔ جس نے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کو مان کر اس کی اطاعت کی راہ اختیار کی اسے وہ بہترین اجر سے نوازے گا اور جس نے اس سے بغاوت اور سرکشی کی زندگی گزاری اسے وہاں بدترین عذاب سے کوئی چیز بچا نہ سکے گی۔

سورہ المومنون جو قرآن مجید کی تئیسویں (۲۳) سورت ہے، اس میں ان تمام سوالات کا جواب موجود ہے جو اس سلسلے میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں اس کی آخری چار آیات پیش کی جارہی ہیں:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا
لَا تُرْجَعُوْنَ۝۱۱۵ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ۝۱۱۶
وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ
لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا
يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ۝۱۱۷ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ
وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ۝۱۱۸
(المومنون: ۱۱۵-۱۱۸)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں بے مقصد پیدا کیا ہے۔ اور تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں آؤ گے۔ پس اللہ کی ذات برتر ہے جو حقیقی مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ عرش کریم کا مالک ہے۔ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو پکارے اس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، اس کا حساب (ایک وقت) اس کے رب کی طرف سے ہوگا۔ بے شک اللہ کے نافرمان کام یاب نہیں ہوتے۔ کہو، میرے رب میری مغفرت فرما۔ مجھ پر رحم کر، تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔

ان آیات میں اس خیال کی تردید ہے کہ انسان کا وجود بے مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بلند ہے کہ وہ کوئی عبث کام کرے۔ اس سے اس کی عظمت کی نفی ہوتی ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس لیے شرک کا کوئی جواز نہیں ہے۔ خدا کا انکار کرنے والے کام یاب نہیں ہوں گے۔ انسان کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ اس سے عفو و درگزر اور مغفرت طلب کرتا رہے۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔

(۲) اس دنیا میں انسان خاندانوں، قبیلوں، نسلوں اور قوموں میں بٹے ہوئے

ہیں۔ ان کے درمیان اور بھی اختلافات ہیں۔ یہ اختلافات عزت و ذلت کا معیار سمجھے جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ سارے انسان ایک ہیں، اس لیے کہ سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ان کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ غیر حقیقی ہیں،وہ عزت و ذلت کا معیار نہیں ہیں۔ اس کا معیار تقویٰ اور خدا ترسی ہے۔ صاحبِ عزت وہ ہے جو خدا ترس اور اس کے احکام کا پابند ہے۔ آپ نے اللہ کا یہ پیغام سنایا:

يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾ (الحجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھارے مختلف خاندان اور قبیلے بنادیے، تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں سب سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہے۔ اللہ خوب جانتا ہے اور باخبر ہے۔

یہ اس بات کا اعلان ہے کہ دنیا کے کسی بھی انسان کو رنگ، نسل، زبان، ملک و قوم اور اس نوع کے دوسرے اختلافات کی بنیاد پر برتر یا کم تر نہیں قرار دیا جائے گا۔ اس طرح کی ہر تفریق نا قابلِ اعتبار اور نا قابلِ قبول ہے۔

(۳) دنیا میں ہر طرف انسانی حقوق پامال ہو رہے تھے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ انسانی حقوق کے تصور ہی سے وہ بڑی حد تک نا آشنا تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا واضح تصور دیا اور انسان کی جان، مال اور عزت وآبرو کو قابل احترام قرار دیا۔

قرآن مجید نے کہا: ہر انسان کو زندہ رہنے کا حق ہے۔اس کی خلاف ورزی پوری نوع انسانی کے ساتھ زیادتی ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (المائدۃ:۳۲)

جس نے کسی ایک انسان کا بھی قتل کیا، جب کہ اس نے نہ تو ناحق کسی کی جان لی ہو اور نہ فساد کا مرتکب ہوا ہو ، تو اس نے گویا روئے زمین کے تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا۔

آپ نے بتایا کہ ہر انسان محترم ہے، اس لیے اسے معاشی دوڑ دھوپ اور بہتر زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ اسے ذلت وخواری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۝ (بنی اسرائیل:۷۰)

ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے اور انھیں خشکی اور تری پر سواری کی طاقت دی ہے اور پاک چیزوں کی روزی عطا کی ہے اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انھیں فضیلت اور برتری عطا کی ہے۔

یہ اس امر کی صراحت ہے کہ خشکی سے، سمندر سے اور یہاں کی فضاؤں سے فائدہ اٹھانے اور بہتر زندگی گزارنے کا ہر شخص کو حق ہے۔ اس سے اسے محروم نہیں کیا جاسکتا۔

(۴) رسول ﷺ نے سماج کے کم زور افراد اور طبقات پر ظلم و زیادتی سے منع ہی نہیں فرمایا، بلکہ ان کے حقوق متعین کیے اور معاشرہ کو ان حقوق کے ادا کرنے کا پابند بنایا۔

عورتوں کے متعلق آپ کا ارشاد ہے:

أطعموهنّ مما تأكلون و اكسوهنّ مما تكسون و لاَ تضربوهنّ ولاَ تقبّحوهنّ (ابوداؤد)

تم جو کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ، جو پہنو (اس معیار کا) ان کو پہناؤ۔ انھیں زد و کوب نہ کرو اور برا بھلا مت کہو۔

آپؐ نے فرمایا:

خيركم خيركم لأهله (ترمذی، دارمی)

تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں بہتر ہیں۔

غلاموں، محکوموں اور زیردستوں کا کوئی حق ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

اخوانكم جعلهم الله تحت ايديكم فاطعموهم مماتاكلون و البسوهم مماتلبسون ولاَ تكلّفوهم ما يغلبهم فان كلّفتموهم فاعينوهم (بخاری و مسلم)

وہ تمہارے بھائی ہیں جنھیں اللہ نے تمہارے ماتحت کردیا ہے۔ تمھیں چاہیے کہ جو کھاؤ ان کو بھی وہ کھلاؤ، جو پہنو ان کو بھی وہ پہناؤ، ان پر کام کا اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ وہ اسے اٹھا نہ سکیں۔ اگر ان کی طاقت سے زیادہ کام ہو تو اس کے پورا کرنے میں ان کی مدد کرو۔

آپ نے کم زور افراد اور طبقات کے حق میں محض پند و نصیحت ہی نہیں فرمائی،

بلکہ انھیں قانونی حقوق بھی عطا کیے۔

رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تعلیمات پیش کیں ان کا ایک نمونہ یہ ہے:

وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ؕ اِمَّا یَبۡلُغَنَّ عِنۡدَکَ الۡکِبَرَ اَحَدُہُمَاۤ اَوۡ کِلٰہُمَا فَلَا تَقُلۡ لَّہُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنۡہَرۡہُمَا وَ قُلۡ لَّہُمَا قَوۡلًا کَرِیۡمًا ﴿۲۳﴾ وَ اخۡفِضۡ لَہُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَۃِ وَ قُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡہُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیۡ صَغِیۡرًا ﴿ؕ۲۴﴾ رَبُّکُمۡ اَعۡلَمُ بِمَا فِیۡ نُفُوۡسِکُمۡ ؕ اِنۡ تَکُوۡنُوۡا صٰلِحِیۡنَ فَاِنَّہٗ کَانَ لِلۡاَوَّابِیۡنَ غَفُوۡرًا ﴿۲۵﴾ وَ اٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ وَ الۡمِسۡکِیۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِیۡلِ وَ لَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِیۡرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ کَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ ؕ وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوۡرًا ﴿۲۷﴾ وَ اِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡہُمُ ابۡتِغَآءَ رَحۡمَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکَ تَرۡجُوۡہَا فَقُلۡ لَّہُمۡ قَوۡلًا مَّیۡسُوۡرًا ﴿۲۸﴾ وَ لَا تَجۡعَلۡ یَدَکَ مَغۡلُوۡلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَ لَا تَبۡسُطۡہَا کُلَّ الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ رَبَّکَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیۡرًۢا بَصِیۡرًا ﴿۳۰﴾

تمہارے رب کا فیصلہ ہے کہ تم صرف اس کی عبادت کرو گے اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آؤ گے۔ وہ تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف تک نہ کہو، ڈانٹ ڈپٹ نہ کرو اور ان سے تہذیب و شرافت سے بات کرو۔ ان کے سامنے جذبۂ ہمدردی سے جھک کر رہو اور ان کے حق میں دعا کرتے رہو کہ خدایا! ان پر اسی طرح رحم فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں ہماری پرورش کی۔ تمہارا رب بہت خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم نیک رہے تو اللہ اپنی طرف رجوع کرنے والوں کو بڑا معاف کرنے والا ہے۔ قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کے حقوق ادا کرو۔ اسراف سے بچو، اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں۔ اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ بروقت ان کی مدد نہ کرسکو تو بھلے طریقے سے معذرت کرلو۔ اگر اس توقع پر ان سے اعراض کروکہ آئندہ اللہ کی مدد حاصل ہو تو مدد کرسکوگے (تو مایوس مت کرو)۔ اور ان سے نرم انداز میں بات کرو۔ (خرچ میں) نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ اسے پوری طرح کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور خالی ہاتھ ہوکر رہ جاؤ۔ اللہ جس کی روزی میں چاہتا ہے وسعت عطا کرتا ہے اور جسے کم دینا چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ وہ بندوں کے حالات سے باخبر ہے۔

اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ
قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝۳۱ وَ لَا تَقْرَبُوا
الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَ سَاۗءَ
سَبِيْلًا ۝۳۲ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ
اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا
فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي
الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝۳۳ وَ لَا تَقْرَبُوْا
مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى
يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ
كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝۳۴ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ
وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ
وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۳۵ وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ
لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ
الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝۳۶ وَ
لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ
تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ
وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ

اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل مت کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی دیں گے۔ ان کا قتل کرنا بڑا گناہ ہے۔ زنا اور بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یہ بے حیائی کا کام اور برا راستہ ہے۔اللہ نے ہر انسان کو محترم قرار دیا ہے، اس لیے اسے قتل نہ کرو، سوائے اس کے کہ حق و انصاف اس کا تقاضا کرے۔ ناحق اور ظلم کے ساتھ کسی کی جان لی جائے تو اس کے ولی کو قصاص (یا دیت لینے اور معاف کرنے کا حق ہے) لیکن اس میں وہ حد سے آگے نہ بڑھے اس میں اس کی مدد کی جائے گی۔ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ۔ہاں احسن طریقہ سے اپنا حقِ خدمت لے سکتے ہو۔ جب وہ سوجھ بوجھ کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کا مال اس کے حوالے کر دو۔ عہد و پیمان کو پورا کرو۔ اس کے بارے میں اللہ کے ہاں سوال ہوگا۔ناپ تول میں کمی نہ کرو، ناپ کر دو تو پورا پورا دو، وزن کرو تو ترازو ٹھیک رکھو۔ (معاملات میں) یہ طریقہ بہتر اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔ یاد رکھو! کان، آنکھ، دل، ہر ایک کے بارے میں اللہ کے ہاں پوچھا جائے گا۔ زمین میں اترا کر نہ چلو۔تم نہ زمین کو شق کر سکتے ہو اور نہ پہاڑ کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

طُوۡلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنۡدَ رَبِّكَ
مَكۡرُوۡهًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ
مِنَ الۡحِكۡمَةِ‌ؕ وَلَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا
اٰخَرَ فَتُلۡقٰى فِىۡ جَهَنَّمَ مَلُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ﴿۳۹﴾
(بنی اسرائیل: ۲۳-۳۹)

ان میں سے ہر برائی تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ ان حکمت کی باتوں میں سے ہے، جن کی تمہارے رب نے تم پر وحی کی ہے۔ اللہ کے ساتھ کسی کو معبود نہ ٹھہراؤ۔ ورنہ ملامت زدہ اور راندۂ دربار ہوکر جہنم میں پھینک دیے جاؤگے۔

قرآن مجید، جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا، یہ اس کی تعلیمات کی ایک جھلک ہے۔ ان میں اخلاق اور قانون کا جو حسین امتزاج ہے، اس کی کوئی مثال شاید کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔

آخری رسول۔ آخری رہ نما

(اس مضمون میں، دنیا میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی آمد، آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی بعثت، اس وقت اہل عرب کی صدیوں سے جاری گم راہی، اہلِ کتاب کی تحریفات اور ان کا مسلسل بگاڑ، اسلام کی دعوتِ عام اور امت مسلمہ کا مقصد وجود جیسے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کا خاص پہلو یہ ہے کہ یہ پوری گفتگو قرآن مجید کے واضح بیانات پر مشتمل ہے، جو ایک مستند ریکارڈ ہے۔ اس سے رسول اللہ ﷺ اور اس امت کی صحیح حیثیت اختصار کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ اس موضوع پر ناچیز نے بعض دوسری کتابوں میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس مضمون میں ایک طرح سے اس کا خلاصہ آگیا ہے۔ امید ہے، بہ یک نظر اسلام کے موقف کو سمجھنے میں یہ معاون ثابت ہوگا۔)

رسولوں کی بعثت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے:

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ (یونس:۴۷) ہر امت کے لیے ایک رسول (ہوا) ہے۔

محمد ﷺ کا بھی رسولوں کی اسی مقدس جماعت سے تعلق ہے۔ آپؐ اسی کے ایک فرد ہیں:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ (آل عمران:۱۴۴) محمد تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ بے شک ہم ہی نے تم کو حق دے کر، خوش خبری

نَذِيۡرًا ؕ وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ ﴿۲۴﴾ دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ کوئی امت ایسی نہیں گزری، جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ (فاطر: ۲۴)

رسولوں کی دعوت

ان سب رسولوں کی دعوت ایک تھی۔ وہ یہ کہ عبادت کی مستحق صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اسی کی عبادت ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ کسی کو اس کائنات میں الوہیت کا مقام حاصل نہیں ہے، اس لیے اس کی عبادت کے لیے بھی کوئی وجہ جواز نہیں ہے:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۲۵﴾ ہم نے تم سے پہلے جس رسول کو بھی بھیجا ہے اسے یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، پس میری ہی عبادت کرو۔ (الانبیاء: ۲۵)

رسول اللہ ﷺ کی دعوت بھی یہی تھی:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾ اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، امید ہے کہ تم اس کے عذاب سے بچ سکو گے۔ (البقرۃ: ۲۱)

عبادت میں پرستش اور اطاعت دونوں شامل ہیں۔ تمام انبیاء کی دعوت یہ تھی کہ اللہ ہی کے سامنے سر جھکایا جائے اور اسی کے احکام و ہدایات کی پابندی کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب کا حال

محمد رسول اللہ ﷺ جس قوم میں پیدا ہوئے اس کے پاس نہ تو اللہ کی کوئی کتاب موجود تھی اور نہ اس کے رسولوں کی تعلیمات سے وہ واقف تھی۔ بلاشبہ اس کا نسلی تعلق حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ سے تھا، لیکن ان دونوں پیغمبروں کو اس دنیا سے رخصت ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔ انہوں نے جس دین کی تعلیم دی تھی، اس طویل عرصہ میں اس قوم نے آہستہ آہستہ اسے بھلا دیا تھا۔ اب اس کے پاس دین ابراہیمی کے نام سے چند بے جان اور غلط رسوم اور باپ دادا کے طور طریقوں کے سوا کچھ نہ تھا،

اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ اس کو اصل دین کی طرف رجوع کی دعوت دی جائے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اپنی قوم کے سامنے اس کا دین پیش کریں اور صاف الفاظ میں اس کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے نتائج سے آگاہ کردیں۔ قرآن مجید میں مختلف مواقع پر صراحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۝ (یٰسٓ:٦)	تاکہ تم ایک ایسی قوم کو باخبر کرو جس کے باپ دادا خبردار نہیں کیے گئے تھے۔ اس وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ۝ (السجدۃ:٣)	تاکہ تم اس قوم کو باخبر کردو جس کے پاس تم سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا۔ شاید وہ راہ پاجائیں۔

آپ کی قوم فکر و عمل کی بے شمار خرابیوں میں گرفتار تھی۔ آپ نے اس کی ان خرابیوں کو دور فرمایا، اس کے عقائد و افکار درست کیے، اسے عبادات کے صحیح طریقے سکھائے، اس کے اخلاق و عادات سنوارے، حلال و حرام کی تمیز اور حق و باطل کا فرق بتایا، غرض تعلیم و تربیت کے ذریعہ اسے ہر طرح کی بے راہ روی سے نکال کر راہِ راست پر لگایا۔ قرآن مجید کہتا ہے:

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝ (الجمعۃ:٢)	وہی ذات ہے، جس نے امیوں میں ایک رسول خود ان ہی میں سے اٹھایا، جو انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالاں کہ یہ لوگ پہلے سے کھلی گم راہی میں تھے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے احسان کا ذکر ہے کہ جس قوم میں آپ کی بعثت ہوئی وہ ناخواندہ، آسمانی ہدایت سے بے بہرہ اور کھلی ضلالت میں مبتلا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم

کے درمیان آپ کو رسالت سے سرفراز فرمایا۔ آپ پر اپنی کتاب نازل کی۔ آپ یہ کتاب اسے سناتے ہیں، اس کے ذریعے اس کی سیرت و کردار کو سنوارتے ہیں اور اس کے احکام وقوانین اور ان کی معنویت اس پر واضح کرتے ہیں۔

اہلِ کتاب کی کیفیت

رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت جزیرۃ العرب اور اس کے آس پاس یہود و نصاریٰ بھی تھے، جن کو قرآن مجید نے اہل کتاب کہا ہے۔ یہ دونوں قومیں ان آسمانی کتابوں کی حامل تھیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئی تھیں، لیکن انھوں نے اپنی ذاتی خواہشات اور ذلیل اور ناپاک اغراض کے تحت ان مقدس کتابوں کو بدل ڈالا تھا اور ان میں ایسی تحریفات کر ڈالی تھیں کہ یہ معلوم کرنا مشکل بلکہ ناممکن تھا کہ ان کی اصل تعلیم کیا تھی اور اس میں کیا تحریف ہوئی ہے؟ جو لوگ دین کے نام پر دین فروشی اور دنیا طلبی کے کاروبار کے ذریعہ سے عوام کو گم راہ کر رہے تھے، قرآن مجید نے ان کی اس مذموم حرکت کو جابجا نمایاں کیا اور اس پر سخت تنقید کی۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ يَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِيَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ فَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا كَتَبَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۷۹﴾ (البقرۃ:۷۸،۷۹)

ان میں سے بہت سے ناخواندہ ہیں، جو کتاب کا تو علم نہیں رکھتے، بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور وہ محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔ پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے، تاکہ اس کے ذریعے تھوڑا سا فائدہ حاصل کرلیں۔ پس تباہی ہے ان کے لیے اس نوشتہ میں جو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور تباہی ہے اس کمائی میں جو انھوں نے حاصل کی۔

قرآن مجید نے ان کی بہت سی تحریفات کی نشان دہی کی اور ان کو دعوت دی کہ محمد ﷺ پر ایمان لاکر صحیح دین اختیار کریں، جو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل

ہو رہا ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے:

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ؕ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۟ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۟

(المائدۃ:۱۵،۱۶)

اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آ چکا جو تمھارے سامنے بہت سی ان باتوں کو، جنہیں تم اللہ کی کتاب میں سے چھپا دیا کرتے تھے، کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں کو درگزر بھی کر دیتا ہے۔ بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور اور کھلی کتاب آ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے ان لوگوں کو، جو اس کی رضا کے طالب ہیں، سلامتی کے راستے دکھاتا ہے اور اپنے اذن سے اندھیروں سے نکال کر اُجالے کی طرف لاتا ہے اور انھیں سیدھے راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔

اسی سلسلہ میں آگے چل کر فرمایا:

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۟

(المائدۃ:۱۹)

اے اہل کتاب! ہمارا یہ رسولؐ تمہارے پاس آ چکا ہے، جو تمھیں دین کی واضح تعلیم دیتا ہے، ایک ایسے وقت میں جب کہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا، تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ پس تمہارے پاس خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا آ چکا۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یہود و نصاریٰ کا قومی اور مذہبی مزاج ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ یہود دنیاپرست تھے، نصاریٰ کا رجحان ترکِ دنیا کی طرف تھا۔ یہود کھلے محرمات کے ارتکاب سے بھی نہیں چوکتے تھے اور نصاریٰ حلال چیزوں کو بھی حرام سمجھ بیٹھے تھے۔ یہود ذاتی مفاد کے لیے اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حدود کو بہ آسانی توڑ پھینکتے تھے اور نصاریٰ نفس کشی کے جذبے کے تحت اپنے اوپر غیر ضروری پابندیاں عائد کیے چلے جا رہے تھے۔ ایک کا راستہ

دنیا پرستی کا تھا اور دوسری کا ترکِ دنیا کا۔ دونوں گروہوں میں سے ہر ایک دوسرے کو بے دین اور گم راہ اور اپنے آپ کو دین کا حامل اور جنت کا مستحق سمجھتا تھا، حالاں کہ دونوں راہِ اعتدال سے ہٹے ہوئے تھے۔ قرآن مجید نے ایک جگہ ان کی مذہبی نفسیات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ ۪ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

(البقرۃ:۱۱۱-۱۱۳)

اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں ہرگز نہ جائے گا مگر وہ جو یہودی ہے یا نصرانی، یہ ان کی تمنائیں ہیں۔ ان سے کہو: تم اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ صحیح بات یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کردے اور وہ عملاً نیک روش اختیار کرے تو اس کے لیے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف اور اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کی کوئی اساس نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی کسی بنیاد پر نہیں ہیں، حالاں کہ یہ سب کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کی باتیں وہ لوگ بھی کرتے ہیں، جن کے پاس (کتاب کا) علم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان قیامت کے روز ان امور کا فیصلہ کردے گا، جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔

اہلِ کتاب کو اسلام کی دعوت

رسولِ اکرم ﷺ نے دنیا پرستی اور رہبانیت دونوں ہی کو غلط قرار دیا اور اعتدال کی راہ دکھائی۔ مذہب کے نام پر عالموں اور راہبوں نے عوام کو جو بیڑیاں پہنا رکھی تھیں وہ کاٹ ڈالیں، پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیا اور بتایا کہ جس

طرح حرام چیزوں کا ارتکاب غلط ہے اسی طرح حلال چیزوں سے اجتناب بھی کوئی کارِثواب نہیں ہے۔ معروف کا حکم دیا، تاکہ زندگی کی تعمیر اصول فطرت کے عین مطابق ہو اور ہر طرف نیکی کی حکم رانی ہو، منکرات سے منع کیا اور اس بات کی ہدایت کی کہ منکرات سے بچ کر ہی انسان اللہ تعالیٰ سے قریب ہوسکتا ہے۔ قرآن مجید نے آپ کے ذریعہ سے انجام پانے والے اس کارنامہ کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے اور آپ پر ایمان لانے اور آپ کی نصرت وحمایت کرنے کی دعوت دی ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ٘ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۠﴿۱۵۷﴾ (الاعراف:۱۵۷)

وہ لوگ (اس کی) رحمت کے مستحق ہوں گے جو اس رسول نبی امی کی اتباع کرتے ہیں، جن کا ذکر وہ اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہیں اور ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتے ہیں اور ان پر جو بوجھ ہیں انھیں اتارتے ہیں اور جن بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں انھیں کاٹ پھینکتے ہیں۔ پس وہ لوگ جو اس نبی پر ایمان لائے اور جنھوں نے ان کی نصرت اور حمایت کی اور اس نور کی اتباع کی جو آپ پر نازل کیا گیا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

دیگر قوموں کا حال

یہ وہ قومیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے قریب ترین ماحول میں موجود تھیں اور جن کے درمیان آپؐ نے بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد زندگی گزاری۔ ان کے علاوہ دنیا کی دوسری قوموں کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ بعض قومیں وہ تھیں جو عرب جاہلیت کی سی زندگی گزار رہی تھیں اور جن کے پاس اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب

یا اس کی تعلیمات موجود نہیں تھیں۔ بعض قومیں اس بات کی دعوے دار تھیں کہ وہ آسمانی صحیفوں کی حامل ہیں اور ان کے پاس خدائی تعلیمات موجود ہیں، لیکن ان تعلیمات میں اس سے زیادہ تحریف ہوچکی تھی جتنی کہ اہل کتاب کے ہاں تحریف ہوئی تھی۔

عملی طور پر دنیا میں یا تو مادّیت اور دنیا پرستی کی حکومت تھی یا غلط قسم کی روحانیت اور رہبانیت کو انسان کے عروج و کمال کا زینہ اور باطنی ترقی کی معراج سمجھا جاتا تھا۔

نوعِ انسانی کو اللہ کے دین کی دعوت

ظلمتوں کی ماری ہوئی یہ دنیا اس بات کی محتاج تھی کہ اسے اللہ تعالیٰ کے دین سے واقف کرایا جائے اور اسے غلط راستہ سے ہٹا کر راہ راست پر لگایا جائے۔ اس کے لیے رہ نمائے عالم کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی اور آپ کو ایک ایسی کتاب دی گئی، جس میں ساری دنیا کے لیے رہ نمائی کا سامان ہے۔ یہی حقیقت ان آیات میں بیان ہوئی ہے:

۱- تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَاۙ ۝۱ (الفرقان:۱)

بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے یہ فرقان (حق و باطل کو الگ الگ کردینے والی کتاب) اپنے بندے پر نازل فرمائی، تاکہ وہ سارے جہاں والوں کو خبردار کرنے والا ہو۔

۲- كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۙ۬ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِۙ ۝۱ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ وَیْلٌ لِّلْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِۙ ۝۲ (ابراہیم:۱،۲)

یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے، تاکہ آپ لوگوں کو ان کے رب کی توفیق سے ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لائیں۔ اس اللہ کے راستے کی طرف جو غالب اور ستودہ صفات ہے۔ وہ اللہ جو ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور تباہی ہے یعنی سخت عذاب ہے کافروں کے لیے۔

۳- وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝۲۸ (سبا:۲۸)

ہم نے تو آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔

محمد ﷺ تمام انسانوں کے لیے اللہ کے رسول تھے۔ آپ نے کسی خاص نسل، قبیلہ، قوم اور ملک کے فائدے کے لیے سعی و جہد نہیں کی، بلکہ ساری دنیا کا مفاد آپ کے پیش نظر تھا۔ آپ نے بغیر کسی تفریق کے تمام انسانوں کو اسلام کی دعوت دی۔ آپؐ نے ایک بڑی حقیقت سے پردہ ہٹایا جسے انسان بھول چکا تھا۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا دین ہر زمانہ میں اسلام ہی رہا ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ (آل عمران:۱۹) بے شک دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

اسلام کے علاوہ کوئی دین قابلِ قبول نہیں

اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اللہ تعالیٰ نے کبھی نازل نہیں کیا، لیکن انسانوں نے اس دین کو اپنی تحریفات کے ذریعہ سے بدل ڈالا۔ ان کی نجات کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی اسلام کی طرف پلٹ آئیں جو ہمیشہ سے اللہ کا دین رہا ہے۔ اب یہی دین اپنی صحیح اور کامل شکل میں آپؐ پر نازل ہوا ہے۔ یہ نوعِ انسانی کا ایک فراموش کردہ سبق ہے، جس کی آپ کے ذریعہ یاد دہانی ہوئی ہے۔ یہ سب کا سرمایہ اور سب کا دین ہے۔ اس کے سوا جو دین بھی انسان اختیار کرے اور جس نظریہ اور فکر کو بھی اپنائے، اللہ تعالیٰ کی سندِ قبولیت اسے حاصل نہ ہوگی اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝۸۵ (آل عمران:۸۵)

جو شخص اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کرنا چاہے گا اس کا وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔

اسلام کیا ہے؟

اسلام کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو انسان اپنا اور اس

کائنات کا خالق، مالک، حاکم اور معبود سمجھے۔ اپنے تمام جذباتِ عبودیت کے ساتھ اس کے سامنے جھک جائے، اس کے ہر حکم کو بے چوں و چرا ماننے کے لیے تیار ہوجائے، اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ہر اطاعت سے منہ موڑ لے اور کسی دوسرے کو خدائی کا مقام دینے سے انکار کردے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ حقیقت بھی واضح فرمائی کہ ایک وقت آئے گا جب یہ دنیا ختم ہوجائے گی اور آخرت آئے گی۔ وہاں انسان کی پوری زندگی کا حساب کتاب ہوگا، اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندے کام یاب ہوں گے اور جنھوں نے اس کی نافرمانی کی راہ اختیار کی ہوگی وہ سخت ترین عذاب سے دوچار ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کا بہت صاف اور بے آمیز تصور دیا۔ اس کی کوئی بات گنجلک اور غیر واضح نہیں ہے۔ اس راہ کے نشیب و فراز اور اس کے تقاضے آپ نے پوری طرح واضح فرما دیے۔ اللہ تعالیٰ کے نام پر انسان کو جنگل میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ایسی روشنی عطا فرمائی کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ اللہ کی مرضی اور ہدایت کے تحت قدم اٹھا سکتا ہے۔ آپؐ نے زندگی کے ہر معاملہ میں اللہ کی طرف سے رہ نمائی فرمائی اور بتایا کہ کس معاملہ میں اس کی اطاعت کس طرح کی جائے اور اس کی نافرمانی سے کیسے بچا جائے؟ اس طرح آپؐ نے پوری نوعِ انسانی کو ایک مقصدِ حیات دیا، زندگی کی ایک متعین راہ بتائی جس پر چل کر وہ دنیا و آخرت کی فلاح سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔

ختمِ نبوت کا اعلان

اس کے بعد ایک خاص مناسبت سے ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا کہ آپ کے بعد اب کسی دوسرے رسول کی بعثت کی ضرورت نہیں ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾ (الاحزاب:۴۰) نہیں ہیں (ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے) وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے خاتم۔

اسلام کے عقائد میں یہ ایک بنیادی عقیدہ ہے کہ حضرت محمدﷺ کے ذریعہ سے نوعِ انسانی کو اللہ کا دین مکمل شکل میں مل گیا اور سلسلۂ رسالت ختم کر دیا گیا۔ اب تاقیامت کسی رسول کی بعثت نہ ہوگی۔[1]

امت مسلمہ وجود میں آئی

اللہ کے رسولﷺ نے اسلام کی بنیاد پر ایک امت کی تشکیل فرمائی اور اس کے ذریعے سے اسلام کو عبادت اور اخلاق ہی میں نہیں، بلکہ معاشرت، معیشت، قانون، سیاست اور ہر شعبۂ حیات میں اسے نافذ کر کے دکھایا۔ انفرادی زندگی ہو یا حیاتِ اجتماعی، دونوں پر اسلام کی فرماں روائی جاری کردی۔ اب کوئی شخص یہ کہنے کی ہمت نہیں کرسکتا کہ اسلام کی تعلیمات محض خیالی ہیں، دنیا نے عملی روپ میں اسے نہیں دیکھا، یا یہ کہ یہ باتیں نظری طور پر تو اچھی لگتی ہیں، لیکن ناقابلِ عمل ہیں۔ آپؐ نے اس طرح کے ہر عذر کو اپنے مبارک اسوہ سے ختم کر دیا۔

رسول اللہﷺ کے ذریعے سے جو امت برپا ہوئی، قرآن مجید نے اس کا مقصدِ وجود شہادت علی الناس بیان کیا ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرۃ:۱۴۳) اسی طرح ہم نے تم کو ایک امتِ وسط بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ شہادت علی الناس کا جو فرض آپؐ نے اپنی زندگی میں انجام دیا، وہی فرض آپ کی امت کو ادا کرنا ہے اور شہادت علی الناس کی جو وسیع مہم آپ نے انجام دی، آپؐ کے بعد اس امت کو یہ جاری رکھنی ہے۔

---

[1] ختم نبوت پر مستقل مضمون آگے آرہا ہے۔

اُمتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی

شہادت علی الناس کا حق اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے دین کو پوری طرح سمجھے، اسے اپنائے اور ٹھیک ٹھیک طریقے سے دنیا کے سامنے اس کا اظہار کرے۔ جو شخص اس دین ہی کو ٹھیک سے نہ سمجھے، جس پر اس کا ایمان ہو، یا جو اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی اور حذف و اضافہ کر بیٹھے، وہ اس شہادت کی ذمہ داری ادا نہیں کرسکتا۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ یہ امت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے وجود میں آئی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ

تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی اصلاح کے لیے نکالا گیا ہے۔ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ (آل عمران:۱۱۰)

اس امت کا کام یہ ہے وہ حق کو حق کہے اور باطل کو باطل، جو بات اللہ تعالیٰ کے دین کے مطابق ہو اس کی تائید اور جو اس کے خلاف ہو اس کی تردید کرے، خیر کا حکم دے اور شر سے منع کرے، بھلائیوں کی ترغیب دے اور برائیوں سے دور رکھنے کی سعی و جہد کرے، وہ جس دین کی علم بردار ہے وہ ایک دعوت ہے، جو ہر حال میں دی جائے گی، وہ ایک پیغام ہے، جو سب تک پہنچایا جائے گا۔ راحت میں بھی اور تکلیف میں بھی، آسانی میں بھی دشواری میں بھی، بے سر و سامانی میں بھی اور ساز و سامان کے ساتھ بھی۔ اگر اقتدار حاصل ہوجائے تو اقتدار کی طاقت بھی اسی پاک مقصد کے لیے استعمال ہوگی:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں تو نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے، منکر سے منع کریں گے اور

عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴿۴۱﴾ (الحج:۴۱) تمام معاملات کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اس احسان کا حق کون ادا کر سکتا ہے کہ آپؐ نے دنیا میں خیر کے پھیلانے اور شر کے مٹانے کا جو کارنامہ انجام دیا اسے جاری رکھنے کے لیے ایک پوری امت برپا کردی۔ اگر اس امت کے اندر اپنے مقصد حیات کا احساس جاگ اٹھے تو وہ پوری دنیا کی نجات دہندہ ثابت ہوگی اور یہ سب اس محمد عربی ﷺ کے طفیل میں ہوگا، جس کے توسط سے اس امت کو یہ اعلیٰ مقصدِ حیات ملا۔ قرآن مجید نے سچ کہا: وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔

☆☆☆

ختم نبوت۔ وجوہ واسباب

محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور آخری رسول ہیں۔ آپ کی رسالت تمام انسانوں کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ اب نہ تو کوئی رسول آئے گا اور نہ کسی سابق رسول کی اتباع جائز ہوگی۔ جو شخص آپ کو رسول مانتا ہے، لیکن آخری رسول نہیں مانتا، وہ حقیقت میں آپ کی رسالت کا آدھا اقرار اور آدھا انکار کرتا ہے اور یہ انکار ہی کے ہم معنی ہے۔ آپ کی رسالت کے دو جزو ہیں: ایک آپ کا رسول ہونا اور دوسرا آپ کے ذریعہ سلسلۂ رسالت کا ختم ہونا۔ کیوں کہ آپ نے صرف اپنی نبوت ہی کا دعویٰ نہیں کیا تھا، بلکہ ختمِ نبوت کا بھی اعلان فرمایا تھا۔ آپ کی رسالت پر ایمان اسی وقت مکمل ہوگا جب کہ یہ دونوں اجزا تسلیم کیے جائیں۔ ان میں سے کسی بھی جز کو اپنے عقیدے سے الگ کر کے انسان مومن نہیں رہ سکتا۔ قرآن نے ایک خاص موقع پر صاف الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ رسالت کا جو سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوا تھا وہ آپ تک پہنچ کر ختم ہوگیا ہے۔ اب آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا:

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ	لیکن آپ ﷺ اللہ کے رسول اور خاتم النّبیین ہیں۔
(الاحزاب: ۴۰)	

ختم نبوت سے متعلق احادیث

رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس حیثیت کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

یہاں اس سلسلے کے چند ارشادات پیش کیے جا رہے ہیں:

۱- ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتا فاحسنه و اجمله الا موضع لبنة من زاویة فجعل الناس یطوفون بہٖ و یتعجبون له و یقولون هلا وضعت هـذه اللبنة قال فانا اللبنة و انا خاتم النبین[۱]

میرے اور مجھ سے پہلے دوسرے پیغمبروں کے فرق کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک شخص نے ایک مکان تعمیر کیا اور اسے خوب آراستہ پیراستہ کیا، البتہ کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اس مکان کو دیکھ کر حیرت اور تعجب کا اظہار کرتے اور کہتے تھے کہ آخر یہ اینٹ کیوں نہیں لگا دی گئی۔ چناں چہ میں وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم النّبیین ہوں۔

۲- و فی روایة لمسلم جئت فختمت الانبیاء علیهم السلام[۲]

مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ میں آیا اور پیغمبروں کی آمد روک دی۔

۳- کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء کلما هلک نبی خلفه نبی و انه لا نبی بعدی[۳]

بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء علیہم السلام کرتے تھے۔ جب ایک نبی وفات پاتا تو دوسرا نبی آتا۔ لیکن اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

۴- انا العاقب الـذی لیس بعـده نبی[۴]

میرا نام 'عاقب' ہے، یعنی وہ جس کے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں ہے۔

ختم نبوت، آپؐ کی عالم گیر رسالت کا اعلان ہے

ختم نبوت کا اعلان حقیقت میں اس بات کا اعلان ہے کہ آپ کی رسالت

---

۱ بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النّبیین

۲ مسلم، کتاب الفضائل، باب ذکر کونہ خاتم النّبیین

۳ بخاری، کتاب الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل

۴ مسلم، کتاب الفضائل، باب فی اسمائہ ﷺ

عالم گیر رسالت ہے۔ آپ صرف اس دور کے پیغمبر نہیں ہیں جس میں آپ پیدا ہوئے، بلکہ ہر دور میں آپ کی اتباع فرض ہے۔ آپ کی بعثت کسی خاص خطۂ زمین اور کسی خاص قوم کے لیے نہیں ہوئی تھی، بلکہ آپ کو ہر خطۂ زمین اور ہر قوم کے لیے بھیجا گیا تھا۔ آپ تمام عالم کے ہادی و راہ نما ہیں اور آپ ہی سے دنیا راہ راست پاسکتی ہے۔ آپ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی ہدایت آخری بار نازل ہوچکی ہے، اب نہ کسی ہدایت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کے حق میں مفید ہوسکتی ہے۔ ختم نبوت کا تصور اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کہ آپ کو ساری دنیا کا پیغمبر مانا جائے اور آپ کی ہدایت کو عالمی و ابدی ہدایت تسلیم کیا جائے۔

قرآن و حدیث میں بار بار اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ آپ کی رسالت تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اور اب جس کسی کو بھی ہدایت مل سکتی ہے آپ ہی کے ذریعہ سے مل سکتی ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

(الاعراف:۱۵۸)

اے محمد! ان سے کہو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ اس اللہ کا جس کے ہاتھ میں آسمان اور زمین کی سلطنت ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی زندگی عطا کرتا اور مارتا ہے۔ پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول 'نبی امی' پر جو اللہ اور اس کے کلمات کو مانتا ہے، اور اس کی پیروی اختیار کرو، امید ہے کہ تم ہدایت پاؤ گے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

(سبا:۲۸)

ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے (اللہ کے انعامات کی) بشارت دینے والا اور (اس کے عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس عالمی حیثیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے:

کان النبی یبعث الی قومہٖ خاصۃ و بعثت الی الناس عامۃ[۱]	ہر نبی مخصوص طور پر اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، لیکن میری رسالت عام ہے اور مجھے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے:

کان کل نبی یبعث الی قومہ خاصۃً و بعثت الی کل احمر و اسود.[۲]	ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا، لیکن مجھے تمام سرخ و سیاہ انسانوں (عرب وعجم) کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔

ایک اور موقع پر آپؐ فرماتے ہیں:

ارسلت الی الخلق کافۃ و ختم بی النبیون[۳]	مجھے تمام خلقِ خدا کی طرف بھیجا گیا ہے اور میرے ذریعہ سے نبیوں کا سلسلہ ختم کردیا گیا ہے۔

نجات کے لیے آپؐ کی اتباع ضروری ہے

محمدﷺ کو اللہ تعالیٰ کا آخری رسول ماننے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ نجات کے لیے آپؐ کی اتباع کو ضروری قرار دیا جائے۔ لیکن ایک خیال یہ ہوسکتا ہے کہ دنیا کے مختلف ادوار میں اور مختلف علاقوں میں اللہ کے رسول آتے رہے ہیں۔ان میں سے کسی بھی رسول کی اتباع کر کے انسان نجات کا مستحق ہوسکتا ہے۔محمدﷺ نے اپنے دور میں وہی فرض انجام دیا جو آپ سے پہلے دوسرے رسول انجام دیتے رہے ہیں۔ اس لیے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی پیروی اللہ تعالیٰ تک رسائی کا ذریعہ ہے، لیکن یہ دعویٰ صحیح نہ ہوگا کہ آپؐ کے علاوہ کسی دوسرے رسول کی اتباع انسان کو اللہ سے دور کردے گی۔ اللہ کے رسولوں میں سے جس کسی کی بھی کوئی اتباع کرے، وہ ہدایت سے محروم نہیں رہ سکتا۔ ہر پیغمبر اللہ ہی کی راہ دکھاتا رہا ہے۔ اس راہ کا راہی ناممکن ہے کہ اپنی

---

۱ بخاری، کتاب التیمم

۲ مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ

۳ حوالہ سابق

منزل سے بھٹک جائے۔

اس استدلال کی خامی یہ ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا مطالعہ غلط رخ سے کیا گیا ہے۔ آپ نے انسانوں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دی، اور اس میں شک نہیں کہ یہ دعوت کوئی نئی دعوت نہیں ہے، بلکہ یہ نوعِ انسانی کو اس وقت سے مل رہی ہے جب سے وہ اس زمین پر آباد ہے۔ لیکن تمام انسانوں کے لیے آپ کی اتباع کے لازم ہونے کی دو خاص وجوہ ہیں: پہلی وجہ دنیا کی وہ عمومی حالت ہے جو آپ کی بعثت کے وقت تھی۔ آپ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جس میں نہ کوئی آسمانی کتاب اپنی صحیح شکل میں موجود تھی اور نہ کسی پیغمبر کا اسوہ محفوظ تھا۔ دنیا گرفتارِ جہالت تھی اور ہدایت کے چشمے خشک ہو چکے تھے۔ آپؐ نے انسانوں کو اللہ کا پیغام اس وقت سنایا جب کہ اس میں تحریف ہوگئی تھی یا وہ نابود ہو چکا تھا۔ جو شخص اللہ کی مرضی جاننا چاہے اس کے لیے صحیح راہ مفقود تھی، آپ نے اسے صحیح راہ دکھائی۔ انسان اللہ کو بھولا ہوا تھا، آپ نے اس کے اندر اللہ کی یاد پیدا فرمائی۔ اللہ سے بندوں کا تعلق ٹوٹ چکا تھا، آپ نے اس تعلق کو پھر سے مضبوط کیا۔ اب انسان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت صرف آپ ہی کے ذریعہ سے مل سکتی ہے۔ جو شخص اللہ تک رسائی حاصل کرنا چاہے اس کے لیے صرف ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ آپ کی بتائی ہوئی راہ ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

يَآهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٩﴾

(المائدۃ:١٩)

اے اہلِ کتاب! یقیناً اب تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے، جو تمہیں کھول کھول کر دین کی باتیں بتا رہا ہے۔ اس کی آمد ایک ایسے وقت میں ہوئی ہے جب کہ مدت سے اللہ کے رسول نہیں آرہے تھے، تاکہ تم یہ نہ کہو کہ کوئی بشارت دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا ہمارے پاس نہیں آیا۔ لو! اب تمہارے پاس بشارت دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا آگیا۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

آپ کی اتباع کو ضروری قرار دیے جانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کا پیغام آپ کے ذریعے سے انسانوں کو آخری بار ملا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اب وہ تمام شریعتیں منسوخ ہوگئیں جو آپ سے پہلے نازل ہوئی تھیں۔ کیوں کہ اللہ کی طرف سے کسی شریعت کا نفاذ صرف اسی وقت تک کے لیے ہوتا ہے جب تک کہ اس کے بعد کوئی نئی شریعت نہ آجائے۔ اور جب وہ آجاتی ہے تو کسی بھی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ اس نئی شریعت کو چھوڑ کر سابقہ شریعتوں کی اتباع کرے۔ اب جب کہ اللہ تعالیٰ کا آخری رسول آگیا اور اس کی شریعت بھی آخری بار نازل ہوگئی تو پھر کسی دوسری شریعت پر عمل کر کے انسان کیسے نجات پاسکتا ہے؟ چناں چہ رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

و الذی نفس محمد ﷺ بیدہ لَایسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی ولَا نصرانی ثم یموت و لم یومن بالذی ارسلت بہ الّا کان من اصحاب النار۔[1]

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، خواہ کوئی یہودی ہو یا نصرانی، جو بھی میری آمد کے بارے میں سنے اور پھر میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مرجائے تو وہ قطعاً اصحابِ جہنم میں ہوگا۔

ایک اور موقع پر آپ فرماتے ہیں:

و الذی نفس محمد بیدہٖ لو بدأ لکم موسٰی فاتبعتموہ و ترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل و لو کان حیًّا و ادرک نبوتی لا تبعنی۔[2]

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر آج موسیٰ بھی تمہارے سامنے نمودار ہوجائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرنے لگو تو راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔ اگر وہ زندہ ہوتے اور میرے دورِ نبوت کو پاتے تو میری ہی اتباع کرتے۔

۱؎ مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد الی جمیع الناس و نسخ الملل بملتہ

۲؎ رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الایمان بالکتاب والسنۃ)

اسی بات کو آپ نے ان الفاظ میں بھی بیان فرمایا ہے:

والذی نفس محمد بیدہ لو بدأ لکم موسیٰ فاتبعتموہ وترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل ولوکان موسیٰ حیًا وادرک نبوتی لاتبعنی [1]	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر موسیٰؑ تمھارے سامنے نمودار ہوجائیں، تم ان کی اتباع کرو اور مجھے چھوڑ دو تو راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔اگر موسیٰؑ زندہ ہوتے اور میری نبوت پاتے تو میری ہی اتباع کرتے۔

ان تصریحات کا حاصل یہ ہے کہ اب راہِ نجات صرف آپ کی پیروی میں ہے، جو شخص بجائے آپ کی پیروی کے کسی دوسرے رسول کی پیروی کو نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے وہ آپ کی رسالت کا منکر ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ تک رسائی کی تمام راہیں بند ہیں۔

---

[1] دارمی، مقدمہ، حدیث نمبر ۴۴۱

(ماہ نامہ زندگی رام پور، جنوری ۱۹۶۴ء)

سیرت ۔ دلیلِ رسالت

محمد ﷺ کی زندگی آپ کے رسول ہونے کی ایک زبردست دلیل ہے۔آپ کی پختہ سیرت، آپ کے مضبوط عزائم، آپ کا بے لچک کردار، آپ کے بلند حوصلے، آپ کا ایمان و یقین، آپ کا اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اخلاص اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ کوئی عام انسان نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔آپ کے اندر ایسی غیر معمولی صلاحیتیں اور بے نظیر خوبیاں موجود تھیں جو اللہ کے کسی پیغمبر ہی میں پائی جاسکتی ہیں۔ تاریخ میں جتنی بڑی شخصیتیں گزری ہیں ان کی بڑائی ان کی زندگی کے کسی خاص پہلو سے ابھرتی ہے اور پھر وہ ان کی پوری زندگی پر چھا جاتی ہے۔ اگر اس خاص پہلو کو نظرانداز کر دیا جائے تو ان کی بڑائی ختم ہو جاتی ہے۔شیکسپیر اور سعدی کا شمار دنیا کے چوٹی کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں ادب کے علاوہ اور بھی خوبیاں ہوں، لیکن یہ ان کی عظمت کی دلیل نہیں ہیں۔ ان کے جس پہلو نے انہیں عام سطح سے اوپر اٹھایا ہے وہ ان کا ادب ہے۔ اگر آپ ان کے ادب کو ان سے چھین لیں تو وہ عام انسانوں کی صف میں نظر آئیں گے۔اس کے برعکس محمد ﷺ کی زندگی کا مطالعہ ہم جس پہلو سے بھی کرتے ہیں، اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپؐ عظیم شخصیت کے مالک تھے۔آپ نے چالیس سال کی عمر میں رسالت کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد آپ کا کردار منصبِ رسالت کے ساتھ اس طرح مربوط ہے کہ ہم دونوں کو جدا نہیں کر سکتے۔ لیکن اس دعوے سے پہلے بھی آپ کی شخصیت اتنی حیرت انگیز اوراس قدر بلند اور فائق تھی کہ کوئی دوسری

شخصیت اس پایے کی صفحۂ دہر میں نظر نہیں آتی۔ سیرت و کردار اور اخلاق و شرافت کے لحاظ سے آپ کا مقام اتنا اونچا تھا کہ اگر آپ رسول نہ ہوتے تو بھی تاریخ کو لکھنا پڑتا کہ اس سطح کا انسان سوائے پیغمبروں کے اور کوئی پیدا نہیں ہوا۔ آپ کا اخلاق مثالی اخلاق اور آپ کا کردار نمونے کا کردار تھا۔ آپ کے اندر شرافت تھی اور اعلیٰ درجے کی شرافت تھی۔ آپ راست باز اور منصف مزاج انسان تھے۔ آپ کی ہر بات واقعہ کے مطابق ہوتی اور آپ کا ہر فیصلہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرتا۔ آپ کی زندگی اتنی صاف ستھری اور بے داغ تھی کہ کسی نے آپ کے اندر کسی اخلاقی عیب کی نشان دہی نہیں کی۔ آپ کی ذات سے دوستوں ہی کو نہیں، دشمنوں کو بھی فائدہ پہنچا، آپ اپنوں کے لیے بھی رحمت تھے اور غیروں کے لیے بھی۔ آپ تاجر تھے تو دیانت دار تاجر تھے، اپنے وطن کے شہری تھے تو پر امن شہری تھے، پڑوسی تھے تو خیر خواہ پڑوسی تھے، دوست تھے تو ہم درد دوست تھے، بھائی تھے تو مہربان بھائی تھے۔ کسی کے ساتھ آپ نے مکر وفریب کا معاملہ نہیں کیا اور نہ کسی نے آپ سے دھوکا کھایا۔ آپ کی قوم نے بار بار تجربے کے بعد بالا تفاق اعلان کیا کہ یہ 'امانت دار' انسان ہے۔ اس سیرت کا انسان جب اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے جھوٹا کہتے ہوئے شرم آتی ہے اور ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے۔

یہاں محمد ﷺ کی پاکیزہ سیرت کے چند گوشوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو صاف گواہی دے رہے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ اور سچے رسول ہیں، کیوں کہ کسی جھوٹے شخص کی زندگی میں یہ اعلیٰ اوصاف جمع نہیں ہو سکتے۔

سنجیدہ شخصیت

آپ بہت ہی باوقار اور متین انسان تھے۔ آپ کی پوری زندگی اور لوگوں کے ساتھ آپ کے تعلقات گواہ ہیں کہ آپ غیر سنجیدہ نہیں تھے۔ آپ کی قوم آپ کی باتوں کو مذاق نہیں سمجھتی تھی۔ آپ کے اندر متانت اور شائستگی تھی اور آپ کے ہر عمل سے اس کا

اظہار ہوتا تھا۔ کیا آپ اس شخص کو کیسے غیر سنجیدہ اور اس کی باتوں کو مذاق کہیں گے جسے اختلاف میں حَکَم قرار دیا جائے اور جو لوگوں کے معاملات کا دور بینی کے ساتھ فیصلہ کرے؟ دعویِ نبوت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قریش نے کعبہ کی تعمیرِ نو کا ارادہ کیا۔ جب تعمیر ہونے لگی تو اس بات پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا کہ حجرِ اسود کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار ہے، کون اس نئی تعمیر میں اپنی جگہ نصب کرے؟ چار پانچ دن تک اختلاف جاری رہا اور قریب تھا کہ جاہلیت اپنا رنگ دکھاتی اور آپس میں تلواریں چل جاتیں۔ اتنے میں طے پایا کہ اس جھگڑے کا فیصلہ وہ شخص کرے گا جو کل صبح سب سے پہلے خدا کے اس گھر میں داخل ہوگا۔ دوسرے دن لوگوں نے جب سب سے پہلے داخل ہونے والے انسان کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ محمد ہے، یہ امانت دار ہے۔ ہم اسے حَکَم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ چناں چہ اس کے بعد آپ نے جو فیصلہ کیا اسے سب نے بہ خوشی قبول کر لیا[۱]۔

سوچیے! جو شخص اپنی قوم میں لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اپنے اس دعوے کی وجہ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے، قوم کی ملامت کا ہدف بن جاتا ہے۔ وہ اسے دق کرتی اور ستاتی ہے، اس پر طنز و تعریض کے تیر برساتی ہے، اس کی راہ میں کانٹے بچھاتی ہے، اس پر گندگی پھینکتی ہے، اس پر سنگ باری کرتی اور زخمی کر دیتی ہے، اس کا اور اس کے خاندان کا تقریباً تین سال تک مکمل بائیکاٹ کیے رہتی ہے، اس کے قتل کے منصوبے بناتی ہے، اسے وطن چھوڑنے پر مجبور کرتی ہے، اس پر اور اس کے ساتھیوں پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسے ختم کر دینا چاہتی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اس دعوے سے باز نہیں آتا، بلکہ اس میں ایک لفظ اور ایک شوشے کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہے تو ہم کس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی قوم، بلکہ ساری دنیا کے ساتھ مذاق کر رہا ہے؟ اگر یہ مذاق ہے تو اپنی نوعیت کا واحد مذاق ہے۔ ایسا مذاق آج تک نہ تو کسی کے

---

۱ سیرۃ النبی، ابن ہشام: ۱/ ۲۰۹-۲۱۴

ساتھ کیا گیا اور نہ عملاً کیا جا سکتا ہے۔

جو شخص سچائی کو لے کر اٹھے، اسے اپنے بیان میں متین ،باوقار اور سنجیدہ ہونا چاہیے، کیوں کہ حقیقت اور مذاق کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے ۔ حقیقت اپنے اظہار کے لیے ہمیشہ سنجیدگی کی طالب ہوتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوئ رسالت میں بے حد سنجیدہ تھے ۔آپ کے دعوے کی یہ سنجیدگی آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔

راست بازی

آپ اپنی ہر بات میں سچے تھے۔آپ کے بارے میں کبھی جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوا، اس لیے بظاہر آپ کا دعوئ رسالت بھی سچا دعویٰ تھا۔ جو شخص آپ کو جھوٹا کہتا ہے وہ ایک ایسی ہستی پر کذب بیانی کا الزام لگاتا ہے جس کے سچے ہونے کی گواہی اس کے دشمنوں تک نے دی ہے۔آپ نے رسالت کا اعلان کیا تو آپ کی مخالفت کرنے والوں میں نضر بن حارث بہت ہی نمایاں تھا اور ہمیشہ آپ کی اذیت کے درپے رہتا تھا۔ وہ آپ کی قوم سے کہتا ہے: ”اے قریش کے لوگو! محمد ﷺ کی دعوت ایک ایسی مصیبت ہے جس کا تمہارے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ وہ جب جوان تھا تو تمہارے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ، سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑا امانت دار تھا۔ لیکن جب اس کے بال سفید ہو گئے اور وہ بوڑھا ہونے لگا تو اس کے پیش کردہ کلام کی وجہ سے تم اسے جادوگر کہتے ہو۔ ہم جادوگروں کو اور ان کی جھاڑ پھونک کو خوب جانتے ہیں۔ خدا کی قسم! وہ جادوگر نہیں ہے۔“ [1]

روم کے بادشاہ ہرقل کو آپ کے دعوئ رسالت کا علم ہوا تو اس نے چاہا کہ آپ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرے۔ اسی دوران میں اسے اطلاع ملی کہ قریش کے چند تاجر شام آئے ہوئے ہیں۔ چناں چہ اس نے انہیں اپنے دربار میں طلب کیا اور

---

[1] سیرت ابن ہشام: ۱/ ۳۱۹

کہا کہ تمہارے شہر میں جس شخص نے خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، تم میں سے اس کا قریبی رشتہ دار کون ہے؟ حضرت ابوسفیانؓ نے جواب دیا کہ وہ میرے خاندان کا ہے۔ اس کے بعد ہرقل نے حضرت ابوسفیانؓ سے آپ کے متعلق چند سوالات کیے۔ ان میں سے ایک یہ تھا:

بتاؤ، اس دعوے سے پہلے کبھی اس پر دروغ گوئی کا الزام لگا ہے؟

ابوسفیانؓ نے جواب دیا کہ نہیں۔

یہ سن کر ہرقل نے کہا کہ جس شخص نے کسی انسان کے معاملے میں کبھی جھوٹ نہ کہا ہو، یقین نہیں آتا کہ وہ خدائے ذوالجلال کی طرف اتنا بڑا جھوٹ کیسے منسوب کردے گا؟

شاید آپ کہیں گے کہ حضرت سفیانؓ مسلمان تھے، اس لیے ان کی شہادت کا اعتبار ہی کیا؟ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ ابوسفیان، محمد ﷺ کے جانی دشمن تھے اور آپؐ کے مخالفین کی قیادت کر رہے تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ ہرقل کے دربار میں جو قریشی بیٹھے ہیں وہ مجھے جھوٹا مشہور کر دیں گے تو میں اس موقع پر غلط بیانی سے کام لیتا۔[1]

یقینِ کامل

سچائی یقین کا سرچشمہ ہے۔ محمد ﷺ کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت آپ کا وہ بے پناہ یقین ہے جو آپ کو اپنے دعوے پر حاصل تھا۔ سچا انسان واقعات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، اس لیے وہ پورے یقین کے ساتھ بول سکتا ہے، لیکن جھوٹا شخص تذبذب اور بے یقینی کا شکار ہوتا ہے، کیوں کہ وہ واقعات کو چھپاتا ہے۔ محمد ﷺ مسلسل تیئس (۲۳) سال تک اپنے دعوئ رسالت پر قائم رہے، لیکن کبھی بھی آپ کی زبان سے یا آپ کے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ آپ کو اپنے رسول ہونے میں کوئی شک یا تردّد ہے۔ جھوٹا شخص عزم و ارادے سے خالی ہوتا ہے۔ وہ مشکلات میں اپنے مقام پر جم نہیں

۱۔ بخاری، کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پاتا۔ آزمائشیں اس کے چہرے سے جھوٹ کی نقاب اتار دیتی ہیں اور وہ دنیا کے سامنے بالکل ننگا ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نازک ترین مواقع پر بھی محمد ﷺ کے اس یقین میں بال برابر فرق نہیں آتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

آپ نے رسالت کا اعلان کیا تو آپ کی قوم، جو آپ کو امین کہتی تھی، آپ کی دشمن بن گئی۔ آپ کے چچا ابوطالب گو مسلمان نہیں تھے، لیکن آپ کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ قریش کے ذمہ داروں نے سمجھا کہ آپ کا جوشِ دعوت اور زورِ تحریک ابوطالب کے دم سے ہے۔ اگر وہ آپ کو تنہا چھوڑ دیں تو یہ سارا ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔ چناں چہ انہوں نے ابوطالب سے کہا کہ آپ محمد (ﷺ) کو اس کام سے باز رکھیے یا آیئے کہ میدان جنگ میں ہمارا اور آپ کا فیصلہ ہو جائے۔ قوم کی اس دھمکی سے حضرت ابوطالب وقتی طور پر ہی سہی، متاثر ضرور ہوئے۔ انہوں نے آپ سے کہا: بیٹے! میرے حال پر اور خود اپنی ذات پر رحم کرو۔ مجھ پر اتنا بار نہ ڈال دو کہ میں برداشت نہ کر سکوں۔ یہ سنتے ہی آپ سمجھ گئے کہ اب ابوطالب آپ کی حمایت سے دست کش ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش نہیں آئی۔ حالات کی نزاکت کا تصور کیجیے اور پھر ان الفاظ پر غور کیجیے جو اس وقت آپ نے اپنے چچا ابوطالب سے کہے تھے:

"چچا جان! خدا کی قسم، اگر میرے مخالفین میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں اور چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں تو بھی میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ یا تو اللہ تعالیٰ اسے غالب کرے گا یا میں اسی راہ میں ختم ہو جاؤں گا۔"[۱]

دنیا کے اصحابِ عزیمت نے اپنے عزم و ارادہ کو مختلف طریقوں سے ظاہر کیا ہے، لیکن شاید اظہارِ عزیمت کے لیے ان سے زیادہ زور دار الفاظ تاریخ نے کبھی نہیں سنے۔ یقین کا یہ مقام اس عالم ہست و بود میں اسی شخص کو ملتا ہے جس کی زبان سے سچائی بول رہی ہو۔ جھوٹ ایک جرم ہے، اس لیے جھوٹا شخص ہمیشہ اپنے جرم پر پردہ

---

۱ سیرت ابن ہشام: ۱/۲۶۷-۲۷۸

ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے اندر اقدام کا حوصلہ نہیں ہوتا، بلکہ اسے ہر وقت اپنی مدافعت کی فکر رہتی ہے۔لیکن سچائی کی فطرت ہے کہ کھلے اور غالب آجائے ۔وہ پردوں میں نہیں رہ سکتی ، بلکہ ہرآن اپنے اظہار کے لیے بے تاب ہوتی ہے۔

محمد ﷺ کے اندر ایک سچے انسان کی طرح یقین کا ایسا طوفان برپا تھا جو مزاحمتوں کوتوڑ کر ساری دنیا پر چھا جانا چاہتا ہے۔ آپ اپنی قوم کے بارے میں، جس سے آپ کی جنگ جاری تھی، فرماتے ہیں:

اريد منهم كلمة تدين لهم لها العرب و تؤدى اليهم العجم الجزية[1]

میں قریش سے ایک ایسے کلمہ پر ایمان لانے کا مطالبہ کر رہا ہوں کہ اگر وہ اس پر ایمان لے آئے تو سارا عرب اس کا تابع ہو جائے اور عجم اسے جزیہ دینے لگے۔

دعوت الی اللہ کے جرم میں آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں، بے بسی اور مظلومیت کا یہ عالم ہے کہ کوئی شخص اس کے ختم ہونے کا تصور بھی نہیں کر پا رہا ہے،لیکن آپ پورے یقین کے ساتھ صحابہ کرامؓ سے فرماتے ہیں صبر کرو، حالات بدل کر رہیں گے اور ایک نئی دنیا آباد ہوکر رہے گی۔ ایک نیا انقلاب آنے والا ہے اور وہ لازماً آکر رہے گا۔

و الله ليتمّنّ هٰذا الأمر حتٰى يسير الراكب من صنعاء الى حضر موت، لَا يخاف الّا اللّٰه او الذئب علىٰ غنمهٖ و لٰكنكم تستعجلون[2]

اللہ کی قسم! یہ دین غالب آکر رہے گا(ظلم مٹ جائے گا اور سارے عرب میں اس حد تک امن و امان ہوگا) کہ ایک سوار صنعا سے حضرموت تک تنہا سفر کرے گااور اسے سوائے اللہ کے خوف کے یا اپنی بکریوں کے سلسلے میں بھیڑیے کے خطرے کے اور کوئی خوف نہ ہوگا۔ لیکن تم لوگ ہو کہ جلدی کر رہے ہو۔

---

[1] ترمذی، ابواب التفسیر (سورۃ ص ٓ)۔ اس پر تفصیلی گفتگو آگے آرہی ہے۔

[2] بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام

عدی بن حاتمؓ آپ کی خدمت میں موجود تھے کہ ایک شخص آیا اور فقر و فاقہ کی شکایت کرنے لگا۔ اتنے میں دوسرا شخص پہنچا اور شکوہ کیا کہ راستہ غیر محفوظ ہے اور ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی ہے۔ حالات کے اس بگاڑ اور ابتری کو سن کر نہ آپ گھبراتے ہیں اور نہ مایوس ہوتے ہیں، بلکہ پیغمبرانہ وثوق کے ساتھ عدی بن حاتم سے کہتے ہیں کہ یہ حالات باقی نہیں رہ سکتے، وہ لازماً بدل کے رہیں گے۔ آپ نے فرمایا: ''عدی! تم (عراق کے شہر) حیرہ سے واقف ہوگے؟ اگر تمہاری زندگی رہی تو دیکھو گے کہ ایک بڑھیا حیرہ سے چلے گی اور کعبہ کا طواف کرکے لوٹ جائے گی۔ اسے سوائے اللہ کے اور کسی کا خوف نہ ہوگا۔ اگر تمہاری زندگی رہی تو دیکھو گے کہ کسریٰ کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ اگر تمہاری زندگی رہی تو دیکھو گے کہ آدمی اپنا ہاتھ بھر کر سونا چاندی لے کر نکلے گا، تاکہ کسی محتاج کو دے، لیکن اسے کوئی محتاج نہ ملے گا۔''[1]

تاریخ گواہ ہے کہ یہ کسی جھوٹے انسان کی یقین دہانیاں نہیں تھیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی پیشین گوئیاں تھیں، جو بعد میں لفظ بہ لفظ پوری ہوئیں۔ اس پہلو سے ہم انہیں معجزات بھی کہہ سکتے ہیں، جو آپ کی رسالت پر دلالت کرتے ہیں۔

جنگِ احد میں مسلمانوں کو فتح کے بعد شکست کھانی پڑی۔ ستر (۷۰) مسلمان شہید ہوئے اور خود رسول اکرم ﷺ زخمی ہو گئے، حتّٰی کہ ایک وقت آپ کی شہادت کی افواہ بھی پھیل گئی، جس کی وجہ سے بہت سے مسلمان ہمت ہار کر بیٹھ گئے، لیکن اس کے باوجود آپ کے اس یقین نے شکست نہ مانی کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کی مدد آپ کے ساتھ ہے۔ جب مشرکین نے جنگ کا نقشہ دیکھا تو ان کے قائد ابوسفیان نے بتوں کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ اس پر آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم انہیں بتادو کہ ہم بے یارومددگار نہیں ہیں: ''اللّٰہ مولَانا و لَا مولٰی لکم''[2] (ہمارا سرپرست اللہ

---

[1] بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، ۳۵۹۵

[2] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ احد، ۴۰۴۳

ہے اور تمہارا کوئی سرپرست نہیں ہے)۔

اسی طرح جنگِ حنین میں قبیلہ ہوازن کا حملہ اتنا سخت ہوا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، لیکن آپ اس اعلان کے ساتھ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمے رہے کہ ''انا النبی لاَ کذب،، (میں اللہ کا پیغمبر ہوں، یہ سچا دعویٰ ہے، اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے)۔[1]

اللہ تعالیٰ سے مثالی تعلق

اللہ تعالیٰ سے آپ کا بہت ہی گہرا تعلق تھا۔ یہ آپ کے رسول ہونے کی ایک قوی دلیل ہے۔ کیوں کہ جو شخص اللہ کا رسول ہو گا لازماً اللہ سے اس کا رشتہ مضبوط ہوگا۔ انسان کے حقیقی اوصاف کبھی چھپائے نہیں چھپتے اور غیر حقیقی اوصاف کبھی اتنے نمایاں نہیں ہوتے کہ دوسرے انہیں دیکھنے اور محسوس کرنے لگیں۔ اللہ سے آپ کا تعلق اس قدر نمایاں تھا کہ جو شخص بھی آپ سے قریب ہوتا وہ اسے پوری شدت سے محسوس کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو جذبات انسان کے اندر سے ابلتے ہیں وہ اس کی پوری سیرت پر چھاجاتے ہیں اور جن جذبات کے لیے انسان کے اندر کوئی تحریک نہیں ہوتی وہ بہ تکلف ابھرتے ہیں اور بہ آسانی دب بھی جاتے ہیں۔ محمد ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی یاد کوئی مصنوعی چیز نہیں تھی، بلکہ وہ آپ کے باطن میں اتری ہوئی تھی، آپ کی روح اس احساس سے سرشار تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کا حاکم اور معبود ہے۔ آپ کا سرِ نیاز اسی کے سامنے جھکتا، آپ اسی کو موت و حیات اور تکلیف و راحت کا مالک سمجھتے، اسی سے دعائیں مانگتے اور الحاح و زاری کرتے، آسائش میں اسی کے شکر گزار ہوتے اور مصیبت میں اسی سے مدد طلب کرتے۔ کیا اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس مثالی تعلق کو کوئی معقول انسان فریب کہہ سکتا ہے؟ اگر دنیا کو فریب دینے کے لیے آپ نے اللہ سے تعلق کا دعویٰ کیا تھا تو ناممکن تھا کہ اس طرح قدم قدم پر اس کا مظاہرہ ہوتا۔ یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے کہ کسی جھوٹے تعلق کی اتنی زبردست حکومت اس پر قائم ہو جائے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس سے

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب قول اللہ تعالیٰ و یوم حنین..... الخ، ۴۳۱۶

آزاد نہ رہنے پائے۔ آپ نے اپنے رنج و راحت، خوف و اطمینان، مرض وصحت، غرض ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے جس مضبوط تعلق کا اظہار کیا ہے وہ آپ کی صداقت کا کھلا ثبوت ہے۔

حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد مکے میں آپ کی مخالفت اپنی آخری حد کو پہنچ گئی تو آپ طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے سرداروں کے سامنے اپنی دعوت پیش کی،لیکن انہوں نے مکہ والوں سے بھی زیادہ برا سلوک کیا ۔ ان کے اشارے پر طائف کے غنڈوں نے آپ کو سخت پریشان کیا اور سنگ باری کرنے لگے جس کی وجہ سے آپ ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس وقت آپ نے اپنے رب سے ان الفاظ میں فریاد کی:

''اے اللہ! میں اپنے ضعف و ناتوانی، اپنی کم تدبیری اور لوگوں کے نزدیک اپنی سبکی کی تجھ سے شکایت کرتا ہوں۔ اے سب سے بڑے مہربان! کم زوروں کا سہارا تو ہی تو ہے۔ اے میرے رب! مجھے کس کے حوالے کرتا ہے؟ کسی غیر کے حوالے، جو میرے ساتھ بدخلقی سے پیش آئے؟ اے اللہ کیا تو میرے معاملات کسی دشمن کو سونپ رہا ہے؟ اگر تو مجھ سے خوش ہے اور مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے کسی بھی چیز کی پروا نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں ہر حال میں تیری عافیت کا طالب ہوں۔ اے اللہ! میں تیرے چہرے کے نور کے ذریعہ، جس سے ظلمتیں چمک اٹھتی ہیں اور جس سے دنیا و آخرت کے معاملات سنور جاتے ہیں، اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو اور تو مجھ سے ناخوش ہو جائے۔ اے اللہ! مجھے تجھ ہی کو خوش کرنا ہے تا آنکہ تو خوش ہو جائے۔ گناہ سے بچنے کی طاقت اور اطاعت و بندگی کی قوت کا خزانہ تیرے ہاتھ میں ہے اور یہ اسی کو ملتا ہے جسے تو نوازے۔''[1]

انسان کو اپنی مصیبتوں اور مشکلات میں کسی حقیقی سہارے کی تلاش ہوتی ہے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام: ۲/ ۲۹ - ۳۰

جس شخص کا دل صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ سے لگا ہوا نہ ہواس کے بارے میں اتنے گہرے جذبات اس کے اندر نہیں ہو سکتے اور وہ مصیبت کے وقت اللہ کو اس طرح سے نہیں پکار سکتا۔

ایک مرتبہ جنگل میں آپ اپنی تلوار درخت میں لٹکا کر اس کے نیچے تنہا سو رہے تھے کہ ایک شخص آیااور اس نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کے بعد آپ کو جگایا اورسوال کیا: بتاؤ، اب تمھیں کون بچائے گا؟ آپ نے پورے اطمینان کے ساتھ جواب دیا: 'اللہ'! اس لفظ کے سنتے ہی اس نے تلوار نیام میں رکھ دی اور خاموش بیٹھ گیا۔[۱]

یہ اس بات کی ناقابل تردید شہادت ہے کہ آپ اللہ کو اور صرف اللہ کو موت و حیات کا مالک سمجھتے تھے۔ دشمن کی ننگی تلوار آپ کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہی تھی، لیکن اس کے باوجود آپ نے اللہ پر اپنے اعتماد کا ایسا ثبوت پیش کیا کہ کسی بھی دلیل سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے اس اعتماد کو غیر حقیقی کہنا، انسان کی نفسیات کی تکذیب ہے۔ دشمن کی تلوار میں وہ زور وقوت نہیں ہے جو آپ کے اس لفظ 'اللہ' میں موجود ہے۔ تلوار چوک سکتی ہے، لیکن اس یقین کی کاٹ سے دشمن بچ نہیں سکتا، جو اس ایک لفظ سے ابل رہا ہے۔ اس کے زبان سے نکلتے ہی وہ بے اختیار پکار اٹھے گا کہ یہ شخص اپنی بات میں سچا ہے اور میں لوہے کے ٹکڑے سے سچائی کا مقابلہ کر رہا ہوں۔

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے:

كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا حزبه امر صلّى [۲]	نبی ﷺ کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی یا کوئی اہم کام درپیش ہوتا تو نماز پڑھتے۔

جو شخص پریشانی میں اللہ تعالیٰ کی طرف لپکے اور اس کے دربار میں ہاتھ پھیلا دے، ہم کس دلیل سے اس کے تعلق باللہ کو جھوٹ اور تصنع قرار دیں؟ یہ کتنی بڑی بدگمانی

---

۱ بخاری، کتاب الجہاد، باب من علّق سیفہ بالشجر فی السفر عند القائلۃ۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب توکلہ علی اللہ تعالیٰ وعصمۃ اللہ تعالیٰ لہ من الناس۔

۲ مسند احمد: ۵/ ۳۸۸۔ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب وقت قیام النبی من اللیل

ہے کہ اللہ سے اس انسان کے تعلق کے بارے میں ہم شک و شبہ کا اظہار کریں جو اسے اپنی آخری پناہ سمجھتا ہے اور اپنی تمام توقعات اسی سے وابستہ کیے ہوئے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے عمل سے تعلق باللہ کا ایسا ثبوت فراہم کیا ہے کہ اس کا انکار ہٹ دھرمی تو ہوسکتا ہے، اسے دلیل و برہان نہیں کہا جاسکتا۔

آدمی غیروں سے اپنی شخصیت پوشیدہ رکھ سکتا ہے، لیکن اس کے حقیقی جذبات بیوی بچوں اور بے تکلف صحبتوں میں چھپے نہیں رہ سکتے۔ آپ کی بیوی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے آپ کو بستر پر نہیں دیکھا تو خیال ہوا کہ شاید آپ کسی دوسری بیوی کے گھر ہوں گے، لیکن میں نے دیکھا کہ آپ رکوع یا سجدے کی حالت میں ہیں اور اللہ کی حمد و ثنا کر رہے ہیں:

سبحانک و بحمدک لَا اِلٰہَ اِلّا انت	میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کے لیے تیری تعریف کرتا ہوں، تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

یہ الفاظ سنتے ہی حضرت عائشہؓ نے کہا: ”میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں کس خیال میں تھی اور آپ کس عالم میں ہیں؟“[1]

حضرت عائشہؓ ایک دوسری شب کا حال بیان کرتی ہیں کہ میں نے آپ کو بستر سے غائب پا کر اندھیرے میں ادھر ادھر تلاش کیا تو میرا ہاتھ قدمِ مبارک سے چھو گیا۔ آپ سجدے میں تھے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

اللّٰھم انی اعوذ برضَاک من سخطک و بمعافاتک من عقوبتک و اعوذ بک منک لاَ احصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علیٰ نفسک[2]	خدایا! میں تیری رضا کے ذریعہ سے تیرے غضب سے اور تیرے عفو و کرم کے ذریعہ سے تیرے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں اور خود تجھ سے تیری پناہ چاہتا ہوں ـ میں تیری حمد و ثنا کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ تو بالکل ایسا ہے جیسا کہ خود تو نے اپنی تعریف میں کہا ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب الصلوۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود

[2] حوالہ سابق

رات کی تنہائی ہے اور ایک شخص اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے میں سر رکھے ہوئے ہے، اس کی عظمت و تقدیس کا اعتراف کر رہا ہے، اس سے درد بھرے انداز میں التجائیں کر رہا ہے اور اس سے اپنی مغفرت کا طالب ہے۔ بتائیے کہ اسے ہم کس زبان سے افترا پرداز اور اللہ پر جھوٹ باندھنے والا کہیں؟ اگر وہ بھی جھوٹا ہے تو کسی کی صداقت کو جانچنے کا آخر کیا معیار قرار دیا جا سکتا ہے؟

عبد اللہ بن شخیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا، نبی کریم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سینے سے آہ و زاری اور خوف و خشیت کی آواز اس طرح نکل رہی تھی جیسے چولھے پر ہانڈی کھول رہی ہو، یا چکی چل رہی ہو[1]

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے:

ان کان النّبی صلّی اللّٰہ علیہ و سلم لیقوم حتی ترم قدماہ او ساقاہ فیقال لہ فیقول افلا اکون عبداً شکوراً[2]	نبی ﷺ اتنی لمبی نماز پڑھتے تھے کہ آپ کے پیروں پر ورم آ جاتا۔ جب آپ سے کہا جاتا کہ آپ اتنی تکلیف کیوں برداشت کر رہے ہیں تو فرماتے: کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس شخص کے احساسات کے صحیح ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے جو اس کے روبرو کھڑا ہو تو اس کے خوف سے کانپ رہا ہو اور جس پر اللہ کے انعامات کا احساس اس قدر غالب ہو کہ عبادت کرتے کرتے پیروں میں ورم آ جائے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرے کہ ابھی حقِ نعمت ادا نہیں ہوا ہے۔

عملی نمونہ

جھوٹے شخص کی پہچان یہ ہے کہ اس میں نفاق کا مرض ہوتا ہے۔ اس کے

---

1. نسائی، کتاب الافتتاح۔ ابو داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب البکاء فی الصلوٰۃ
2. بخاری، کتاب التہجد، باب قیام النبی حتی ترم قدماہ

پاس عمل کی پونجی نہیں ہوتی ہے، بلکہ صرف کھوکھلے دعوے ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ الفاظ کے جادو سے دنیا فریب کھا جائے۔ مگر ایک نفسیات شناس اس کی باتوں میں اس کے دل کی کھوٹ کا بہ آسانی پتہ چلا سکتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کے قول وعمل میں کامل یکسانیت ہے۔آپ ٹھیک اس طرف چل رہے تھے جس طرف دنیا کو بلا رہے تھے۔آپ نے انسانوں سے جو کچھ کہا وہ آپ کے کردار میں موجود تھا۔آپ نے اللہ کا دین دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ خود اس کا عملی نمونہ بن گئے۔ کسی نے آج تک یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ آپ کے قول وعمل میں تضاد ہے اور آپ کے عمل سے آپ کی باتوں کی تردید ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اگر آپ کا علم سب سے زیادہ تھا تو آپ کے اندر سب سے زیادہ خوف وخشیت بھی تھی۔ آپ فرماتے ہیں:

و اللّٰہ انی لَاَعلمھم باللّٰہ و اشدھم لہٗ خشیۃ [1]

قسم خدا کی، مجھے سب سے زیادہ اللہ کی معرفت حاصل ہے اور میں سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں۔

سعد بن ہشام نے حضرت عائشہؓ سے آپ کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ آپ کا اخلاق تو بعینہٖ قرآن تھا[2] مطلب یہ کہ قرآن کو دیکھ کر تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ آپ کے اخلاق کیا تھے؟ قرآن اور آپ کی زندگی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ جو اوصاف قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہی محمد ﷺ کی شخصیت میں جلوہ گر تھے۔

نوعِ انسانی کی خیر خواہی

تاریخ شہادت دیتی ہے کہ آپ نوع انسانی کے بہت بڑے خیر خواہ تھے۔ آپ نے کسی کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا، کسی سے بد عہدی نہیں کی، کسی کو دھوکا نہیں دیا، کسی کا خون نہیں بہایا، کسی کا مال نہیں کھایا۔ غرض یہ کہ آپ سے کسی بھی شخص کو کوئی نقصان

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب من لم یواجہ الناس بالعتاب۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب علمہ ﷺ باللہ تعالیٰ

[2] رواہ مسلم و ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی صلوۃ الیل

نہیں پہنچا، بلکہ ہمیشہ آپ ہر ایک کی کام یابی کی فکر میں رہے ۔آپ نے مکے سے ہجرت کی تو آپ کے کسی بھی مخالف کو اس کا علم نہ ہو سکا، لیکن جاتے ہوئے آپ نے اس دشمن قوم کی امانتوں کو، جو صحیح معنوں میں آپ کے خون کی پیاسی تھی، حضرت علیؓ کے حوالے کر دیا، تاکہ جن لوگوں کی یہ امانتیں ہیں وہ انہیں پہنچا دیں۔

یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ جس قوم نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا، جو قدم قدم پر لڑتی رہی اور جس نے آپ کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا وہ اپنی زبان ہی سے نہیں، بلکہ اپنے عمل سے اس بات کا اعتراف کر رہی ہے کہ یہ شخص دیانت دار ہے، یہ کسی کو فریب نہیں دے سکتا۔

لیس بمکة احد عنده شیء یخشٰی علیه الاّ وضعه عنده لما یعلم من صدقه و امانته[1]

مکے میں جس کسی کے پاس بھی کوئی ایسی چیز ہوتی جس کے بارے میں اسے کسی قسم کا اندیشہ ہوتا تو اسے وہ آپ کے پاس رکھ دیتا، کیوں کہ ہر ایک آپ کی سچائی اور امانت سے واقف تھا۔

ہجرت کے دس سال بعد مکہ فتح ہوا تو آپ کے دشمن دست بستہ آپ کے سامنے کھڑے تھے۔ اگر آپ چاہتے تو ان سے چن چن کر انتقام لیتے۔ لیکن آپ نے ان سے پوچھا: '**یامعشر قریش ما ترون انی فاعل فیکم**' (قریش کے لوگو! بتاؤ، اب میں تمھارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟) انھوں نے جواب دیا: آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کی اولاد ہیں، اس لیے آپ سے اچھے سلوک ہی کی توقع ہے۔ آپ نے فرمایا: '**اذھبوا فانتم الطلقاء**' (جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو)۔[2]

آپ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ سے فرمایا: **لقد لقیت من قومک ما لقیت و کان اشد ما لقیت منھم یوم العقبة** (مجھے تمھاری قوم سے جو سخت تکلیفیں پہنچیں وہ تو تھیں ہی، لیکن ان میں سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی جو عقبہ (طائف) کے

---

[1] سیرت ابن ہشام: ۲/ ۹۸

[2] حوالہ سابق: ۴/ ۲۳

دن پہنچی)۔ انسانیت کے ساتھ خیر خواہی کی اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے اس دن بھی طائف والوں کے حق میں دعا فرمائی کہ اے اللہ! تو انہیں ہلاک نہ فرما۔ گو آج وہ تیرے دین کو قبول نہیں کر رہے ہیں، لیکن شاید کہ ان کی اولاد تجھے ایک ماننے اور تیری بندگی کرے۔[۱]

ایک شخص نے دعا کی: ''اے اللہ! تو مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی تیسرے کو اپنی رحمت میں شریک نہ کر۔'' اس کی یہ دعا آپ کو ناگوار گزری۔ آپ نے فرمایا: ''اللہ کی رحمت وسیع ہے، تم نے اسے محدود کر دیا ہے۔''[۲]

آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! میں نے تجھ سے ایک وعدہ لیا ہے (مجھے یقین ہے کہ) تو کبھی اس کے خلاف نہیں کرے گا۔ وہ یہ کہ میں انسان ہوں۔ اس لیے بہ تقاضائے بشریت میں نے جس مسلمان کو بھی تکلیف دی، یا برا بھلا کہا، یا لعنت کی یا جسمانی گزند پہنچائی ہے تو میری اس حرکت کو اس کے حق میں رحمت بنا دے، اس سے اس کے گناہوں کو معاف کر دے اور قیامت کے روز اسے اپنی قربت کا ذریعہ بنا لے جس کی وجہ سے تو اس بندۂ مسلم کو اپنے سے قریب کر لے۔[۳]

غور کیجیے! جس شخص نے کبھی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں کسی کو دھوکا نہ دیا ہو، اس کے بارے میں ہم کیسے سوچ سکتے ہیں کہ وہ اللہ کے بارے میں دنیا کو فریب دے گا؟ جس نے موقع پانے کے باوجود اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا ہو اس کے بارے میں ہم کیسے باور کر سکتے ہیں کہ وہ ایسا بے حقیقت فتنہ کھڑا کر دے گا، جس میں دشمنوں ہی کے جان و مال کا نہیں، بلکہ دوستوں کے جان و مال کا بھی عظیم 'نقصان' ہو؟ جس نے اپنے مخالفین کی امانتوں میں خیانت نہ کی ہو اس کے بارے میں ہم کیسے مان لیں کہ وہ

۱؎ بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذ قال احدکم آمین الخ۔

۲؎ بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبہائم

۳؎ بخاری، کتاب الدعوات، باب قول النبی من آذیتہ الخ، مسلم، کتاب البر والصلۃ باب من لعنہ النبی الخ

انسانیت کے ساتھ اتنی بڑی بے وفائی کرے گا کہ لوگ اس پر اللہ کے معاملے میں اعتماد کریں اور وہ انہیں اس کی راہ سے بھٹکا دے؟ جس نے دعائیں کی ہوں کہ انسانوں کے ساتھ اس کی سخت کلامی بھی اللہ سے ان کے تقرب کا ذریعہ بن جائے اور جسے یہ بات بھی ناگوار گزرے کہ اللہ کی رحمت تنہا اس کے حصے میں آئے، اس کے بارے میں ہم کیسے تصور کریں کہ وہ ضلالت کا علم بردار ہوگا اور وہ انسانوں کو اللہ سے دور کر دے گا؟ یہی بات شاہ ہرقل نے ابوسفیانؓ سے کہی تھی۔ اس نے آپ سے پوچھا:

بتاؤ، کیا اس مدعیِ رسالت نے کبھی کسی کو دھوکا دیا ہے؟

ابوسفیان نے جواب دیا: ”ابھی تک دھوکا نہیں دیا ہے۔ آیندہ کا حال ہم نہیں جانتے۔“

یہ سن کر ہرقل نے کہا: تمہارا جواب ظاہر کرتا ہے کہ وہ واقعتاً پیغمبر ہے، کیوں کہ پیغمبروں کی نشانی یہ ہے کہ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔[1]

نام ونمود سے اجتناب

شہرت کی بھوک بہت سخت ہوتی ہے۔ اس کے لیے انسان بڑی بڑی قربانیاں دیتا ہے۔ محمد ﷺ کی سیرت کو ہم اس کمزوری سے پاک دیکھتے ہیں۔ کم ظرف انسان جب دوسروں کی بھلائی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انجام دیتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ہر طرف اس کی عظمت کے قصیدے پڑھے جائیں، اس کی یادگاریں قائم ہوں، لوگ اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوں اور اس کی تعظیم بجا لائیں، اس کی تصویریں شائع ہوں اور دنیا انہیں بہ نظر تحسین دیکھے۔ اس کے مقابلے میں محمد ﷺ ہیں کہ آپ نے دنیا کو باطل سے حق کی طرف موڑ دیا اور شیطان کے تخت کو الٹ کر اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کر دی، لیکن اس کے باوجود آپ کبھی شہرت اور نام آوری کے طالب نہیں

---

[1] بخاری، کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ہوئے۔ آپ کے غیر معمولی کارناموں کو دیکھ کر انسان سوچنے لگتا ہے کہ شاید یہ شخص سطحِ بشریت سے بلند اور مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہے، لیکن آپ نے اس کی تردید فرمائی ہے۔ صحابہ کرام کی زبان سے کبھی کبھی اس طرح کے جملے نکل جاتے تھے کہ ہوگا وہی جو اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ چاہیں گے۔ آپ نے فرمایا: یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ یوں کہو کہ اللہ جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے[۱]

آپؐ نے بار بار اس کی صراحت کی ہے کہ:

اِنَّما انا بشر مثلکم أنسٰی کما تنسون فاذا نسیت فذکّرونی[۲]	میں تم ہی جیسا انسان ہوں۔ تم سے جیسے بھول ہوتی ہے ایسے ہی مجھ سے بھی بھول ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کبھی بھول جاؤں تو یاد دہانی کر دو۔

آپؐ نے اس جذبہ کی سخت مخالفت کی کہ انسان دوسروں سے داد کا طالب ہو اور انھیں اپنا محکوم سمجھے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: ”جو شخص چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں وہ جہنم کو اپنا ٹھکانا بنالے۔“[۳] اس کے ساتھ آپؐ نے اپنے عمل سے بھی دنیا کو مساوات کا درس دیا۔ چناں چہ جب کبھی آپؐ دیکھتے کہ لوگ آپؐ کی تعظیم میں حد سے آگے بڑھ رہے ہیں تو سختی سے منع کر دیتے۔ ایک مرتبہ آپؐ تشریف لائے تو صحابہ کھڑے ہوگئے۔ آپؐ نے فرمایا: ”لوگوں کی تعظیم میں کھڑا ہونا عجم کا طریقہ ہے، تم اس کی پیروی نہ کرو۔“[۴]

بنو عامر کا وفد آپؐ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ آپؐ ہمارے سردار ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: سردار تو اللہ ہے، میں سردار نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپؐ ہم میں سب سے افضل ہیں اور آپؐ کا مقام سب سے اونچا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ”جو بات صحیح ہے وہی کہو

---

۱ مسند احمد: ۵/ ۷۲

۲ بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب التوجہ نحو القبلۃ حیث کان

۳ ابوداؤد، کتاب الادب، باب الرجل یقوم للرجل یعظمہ بذلک

۴ حوالہ سابق

اور غلط باتیں چھوڑ دو، اس کا خیال رکھو کہ کسی کی تعریف میں شیطان حد سے آگے نہ پہنچادے۔"[1]

آپؐ نے فرمایا:

لاَ تطرونی کما اطری عیسٰی بن مریم وقولوا عبد اللّٰه و رسوله[2]

میری تعریف میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح عیسیٰ بن مریم کی تعریف میں ان کے ماننے والوں نے مبالغہ کیا اور انھیں خدا بنا ڈالا، میرے بارے میں بس یہ کہو کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔

قیس بن سعدؓ نے آپؐ سے کہا کہ میں نے عراق میں دیکھا ہے کہ لوگ اپنے بڑوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں تو کیوں نہ ہم آپؐ کو سجدہ کریں، جب کہ آپؐ اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم میری قبر پر سے گزروگے تو اسے بھی سجدہ کروگے؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تو تمھیں چاہیے کہ میری زندگی میں بھی مجھے سجدہ نہ کرو۔[3] مطلب یہ کہ سجدہ تو اس ذات کا ہونا چاہیے جو حی و قیوم ہے۔ فانی انسان اس قابل نہیں ہے کہ اسے سجدہ کیا جائے۔

آپؐ نے اپنی امت کو نصیحت کی: "**لاَ تجعلوا قبری عیدًا**" (میری قبر پر میلہ نہ لگاؤ)۔[4]

یہ چند واقعات بہ طور مثال پیش کیے گئے ہیں۔ جس کسی نے بھی آپؐ کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ کہنے کی کبھی جرأت نہیں کرسکتا کہ آپؐ نے شہرت اور نام وری کے لیے اپنی رسالت کا اعلان کیا۔ سوچیے! دنیا اس شخص کو کیسے جاہ طلب اور عزت و شہرت کا خواہاں کہے گی جو انسان کی اس توہین کو برداشت نہ کرے کہ اس کا سر اللہ واحد

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی کراہیۃ التمادح

[2] بخاری، کتاب استتابۃ المرتدین الخ، باب رجم الحبلی من الزنا اذا احصنت۔

[3] رواہ ابوداؤد و رواہ احمد عن معاذ بن جبل (مشکوۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب عشرۃ النساء وما لکل واحد من الحقوق)

[4] ابوداؤد، کتاب المناسک، باب زیارۃ القبور۔ مسند احمد: ۲/ ۲۴۲

کے سوا کسی اور کے آگے جھکے؟ جس کی بے نفسی کا یہ عالم ہو کہ لوگ اسے سجدہ کرنے کی اجازت چاہیں اور وہ اجازت نہ دے، جو اپنے ساتھیوں کو اس سے بھی منع کرے کہ اس کی آمد پر کھڑے ہوں اور جس کی نصیحت ہو کہ میری تعریف وتوصیف میں مبالغہ نہ کیا جائے کہ یہ گم راہ قوموں کی علامت ہے اور جو خدا سے دعا کرے: "**اللّٰھم لَا تجعل قبری وثناً**" (اے اللہ میری قبر کو بت نہ بننے دے کہ لوگ اس کو پوجنے لگیں)۔[1] حقیقت یہ ہے کہ بے غرضی اور بے نفسی اسی سینے میں پرورش پاسکتی ہے جو سچائی سے معمور ہو، جھوٹا شخص کبھی نام ونمود سے بے نیاز اور اخلاص کا حامل نہیں ہوسکتا۔

دنیا سے بے رغبتی

آپؐ دنیا دار نہیں تھے۔ آپؐ کی زندگی بے حد سادہ اور عیش وعشرت سے خالی تھی۔ آپؐ پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ دعویٰ رسالت کے ذریعہ آپؐ مال و دولت حاصل کرنا چاہتے تھے، یاحکومت و ریاست اور عہدہ و منصب کے خواہاں تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپؐ نے رسالت کے نام پر قوم سے کبھی سرمایہ نہیں جمع کیا، بلکہ اپنی تمام دولت اس راہ میں لٹادی۔ منصبِ رسالت سے پہلے آپؐ مکے کے ایک کام یاب تاجر تھے اور آپؐ کے نکاح میں حضرت خدیجہؓ جیسی عرب کی دولت مند بیوی تھیں، لیکن رسالت کی ذمہ داریوں نے آپؐ کی تجارت اور حضرت خدیجہؓ کی دولت دونوں کو ختم کرکے رکھ دیا اور آپؐ کو اس سلسلے میں اتنی مصیبتیں اٹھانی پڑیں کہ ان کے بیان کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ آپؐ فرماتے ہیں: "مجھے اللہ کی راہ میں اس قدر ڈرایا اور ستایا گیا کہ کسی کو اتنا ڈرایا اور ستایا نہیں گیا۔ مجھ پر تیس شب وروز ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلال کے لیے کھانے کی کوئی ایسی چیز، جسے کوئی جان دار اپنی غذا بنا سکے، بس اتنی مقدار میں ہوتی کہ بلال اسے اپنے بغل میں چھپا رکھتے۔"[2]

---

[1] مسند احمد: ۲/۲۴۲

[2] ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، باب نمبر ۳۴ (بلاعنوان)

آپؐ نے یہ قربانیاں اس لیے پیش کیں تا کہ اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچ جائے۔ ورنہ آپؐ چاہتے تو دولتِ دنیا کا بڑے سے بڑا سرمایہ اپنے لیے جمع کر سکتے تھے۔ آپؐ کو اپنی دعوت سے باز رکھنے کے لیے قریش کی طرف سے عتبہ یہ پیش کش لے کر آپؐ کی خدمت میں پہنچا کہ ''بھتیجے! اگر اس دعوت کے ذریعہ تم مال ودولت چاہتے ہو تو ہم اتنا مال جمع کر دیں کہ تم سب سے بڑے مال دار بن جاؤ۔ اگر اس سے سرداری مطلوب ہے تو آؤ، ہم تمھیں اپنا سردار مان لیں اور تمھارے فیصلے کے بغیر کوئی کام انجام نہ دیں، اگر سلطنت کی خواہش ہے تو ہم تیار ہیں کہ تمھیں اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں۔ لیکن اگر واقعہ یہ نہیں ہے اور تم اپنے اندر جنون کی کیفیت پاتے ہو اور تمھیں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جنھیں تم دور نہیں کر سکتے ہو تو بخوشی ہم تمھارا علاج بھی کرا سکتے ہیں۔'' عتبہ کی یہ تقریر آپؐ خاموشی سے سنتے رہے۔ اس کے بعد آپؐ نے قرآن کی چند آیتیں اسے سنائیں اور فرمایا: ''یہ ہے میرا جواب، اب تم جانو اور تمھارا کام۔'' [۱]

اس طرح آپؐ نے اپنی دعوت اس کے سامنے پیش کردی، تا کہ وہ اچھی طرح جان جائے کہ آپؐ کا مقصد کیا ہے؟ اور آپؐ دنیا سے کیا چاہتے ہیں؟

مدینہ میں آپؐ ایک ریاست کے مالک تھے، لیکن اس کے باوجود صحیح روایات بتاتی ہیں کہ آپؐ نے ایک فقیرِ بے نوا کی زندگی گزاری۔ حضرت عمرؓ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں آپؐ کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ آپؐ بغیر قمیص کے چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے اور آپؐ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ایک طرف تین چمڑے پڑے ہوئے ہیں، ایک کونے میں کچھ چھال اور دوسرے کونے میں قریب قریب ایک صاع جو ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں بے اختیار رو پڑا۔ آپؐ نے پوچھا: روتے کیوں ہو؟ میں نے عرض کیا: قیصر وکسریٰ کو تو دنیا کی دولت حاصل ہے اور آپؐ اللہ کے رسول اس حال میں ہیں؟ یہ سنتے

---

[۱] سیرت ابن ہشام: ۱/ ۳۱۴

ہی آپؐ بیٹھ گئے اور فرمایا: ''عمر! آخر تم کس خیال میں ہو؟ کیا تم نہیں چاہتے کہ ان کو دنیا ملے اور آخرت ہمارے حصے میں آئے؟ اللہ نے انھیں اپنی نعمتیں دنیا ہی میں دے دی ہیں اور آخرت کی نعمتوں سے انھیں محروم کر رکھا ہے[1]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دو دو مہینے گزر جاتے تھے، لیکن نبی ﷺ کی بیویوں کے مکانات میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ عروہ نے پوچھا: تو آپ لوگوں کی غذا کیا تھی اور آپ کیسے زندہ رہتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: کھجور اور پانی ہماری غذا تھی، اس کے علاوہ بعض انصار دودھ بھیج دیا کرتے تھے[2]

حضرت عائشہؓ کی ایک دوسری روایت ہے کہ محمد ﷺ کے مدینہ آنے کے بعد کبھی آپؐ کے گھر والوں نے مسلسل تین دن تک گیہوں کا استعمال نہیں کیا اور اسی حالت میں آپؐ دنیا سے رحلت کر گئے[3]

آپ ﷺ کے خادم خاص حضرت انسؓ فرماتے ہیں: مجھے نہیں معلوم کہ نبی ﷺ نے کبھی اپنی آنکھوں سے پتلی روٹی اور بھنا ہوا بکری کا گوشت دیکھا ہو[4]

ایک مرتبہ چٹائی پر لیٹنے کی وجہ سے جسم مبارک پر نشانات پڑ گئے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے دیکھا تو عرض کیا کہ اگر آپؐ حکم دیں تو ہم کوئی نرم بستر تیار کر دیں اور آپؐ کی آسائش کا خیال کریں ۔ آپؐ نے فرمایا: مجھے دنیا سے اور دنیا کو مجھ سے کیا تعلق؟ یہ دنیا میری منزل نہیں ہے، میں یہاں ایک مسافر ہوں۔ مسافر راہ سفر میں کسی درخت کے نیچے کچھ دیر سایہ میں رہتا ہے اور پھر اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ اسے اپنی منزل

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب موعظۃ الرجل ابنتہ لحال زوجہا۔ مسلم، کتاب الطلاق، باب بیان ان تخییر امراتہ لا یکون طلاقاً الا بالنیۃ

[2] بخاری، کتاب الھبۃ وفضلہا والتحریض علیہا

[3] بخاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی واصحابہ

[4] حوالہ سابق

نہیں بناتا[۱]

آپ ﷺ کی بیوی حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں کہ گھر میں ایک کمبل تھا، جسے ہم دو تہہ کر کے بچھا دیتے تھے، اسی پر آپؐ آرام فرماتے۔ ایک مرتبہ خیال ہوا کہ اگر اسے چار تہہ کر کے بچھا دیا جائے تو آپؐ کے لیے زیادہ آرام دہ ہوگا۔ چناں چہ میں نے اسے چار تہہ کر کے بچھا دیا۔ آپؐ نے فرمایا: یہ ٹھیک نہیں ہے۔ جیسے پہلے بچھایا کرتی تھیں، اسی طرح بچھا دیا کرو، کیوں کہ بستر نرم ہونے کی وجہ سے رات میری نمازِ تہجد ادا ہونے سے رہ گئی[۲]

عتبہ بن حارث کہتے ہیں کہ ایک دن عصر کی نماز کے فوراً بعد آپؐ غیر معمولی سرعت کے ساتھ مکان میں داخل ہوئے اور پھر باہر تشریف لائے۔ اس سے ہمیں بہت تعجب ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ گھر میں صدقے کا کچھ سونا رکھا ہوا تھا، مجھے یہ بات ناپسند ہوئی کہ وہ رات بھر میرے پاس پڑا رہے، اس لیے میں نے ابھی اسے تقسیم کر دیا[۳]

حضرت عائشہ مرض الموت کا حال بیان کرتی ہیں کہ آپؐ نے چھ سات دینار حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کے لیے مجھے دیے تھے، لیکن آپؐ کی علالت کی وجہ سے مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ آپؐ نے اس کے بارے میں پوچھا تو میں نے معذرت کی کہ ابھی یہ خدمت انجام نہیں دے سکی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: وہ دینار لاؤ، اس کے بعد آپؐ نے انھیں اپنے ہاتھ میں رکھ کر کہا: محمد کا اللہ کے بارے میں یہ کتنا پست تصور ہوگا، اگر وہ اس سے اس حال میں ملے کہ یہ دنیا اس کے پاس ہو، جاؤ انھیں خرچ کر دو[۴]

آپ ﷺ نے اس طرح زندگی گزاری کہ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنی

---

۱ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق بحوالہ احمد، ترمذی، ابن ماجہ

۲ شمائل الترمذی، باب ما جاء فی فراش رسول اللہ

۳ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب من احب تعجیل الصدقۃ من یومہا۔

۴ مسند احمد: ۶/ ۱۰۴ و ۱۸۲

ازواج اور اولاد کے لیے کچھ نہیں چھوڑا، نہ دینار، نہ درہم، نہ بکری، نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔[۱] آپ ﷺ نے فرمایا: "**نحن معاشر الأنبياء لاَ نورث ماتركنا صدقة**" (میرا تعلق پیغمبروں کے گروہ سے ہے، ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ خیرات کر دیا جاتا ہے)۔[۲]

جس شخص کے سامنے حکومت و ریاست، دولت و ثروت اور حسن و جمال اس شرط پر پیش کیا جائے کہ وہ اللہ کا پیغام پہنچانے سے باز آجائے اور وہ اس پیش کش کو بے نیازی سے ٹھکرا دے، اس پر بہت بڑا بہتان لگاتا ہے جو کوئی اسے دنیا کا بھوکا کہتا ہے اور اس کے دعوئ رسالت کو دنیا کمانے کی تدبیر سمجھتا ہے۔

جس شخص کے پاس اقتدار ہو، حکومت ہو اور جو چاہے تو اپنے لیے عیش و عشرت کی ایک دنیا آباد کر سکتا ہو، اس کے باجود اس کے گھر دو دو مہینے چولھا نہ جلے، جس کا احساس ہو کہ نرم بستر اللہ سے غافل کر دیتا ہے اور جو دنیا کو آرام کی جگہ نہ سمجھے، بڑی ناانصافی ہوگی اگر اس کے بارے میں کہا جائے کہ وہ دنیا کی خاطر نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے؟ کیا کوئی دنیا کا چاہنے والا ایسا بھی گزرا ہے جو عیش کے سارے سامان کے باوجود فقر و فاقے کی زندگی گزار دے اور دنیا سے اتنا فائدہ اٹھانا بھی پسند نہ کرے جتنا فائدہ ایک بے حیثیت آدمی اٹھا لے جاتا ہے؟

وہ ہستی، جس کی موت اس حال میں آئے کہ اس کی زرہ رہن رکھ کر غلہ حاصل کیا گیا ہو[۳] جو نہ صرف اپنے لیے دعا کرے کہ "اے اللہ! تو مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکینی کی حالت میں موت دے اور قیامت کے دن مسکینوں کے زمرے میں اٹھا۔"[۴]

---

۱ مسلم، کتاب الوصیۃ، باب ترک الوصیۃ لمن لیس شئ یوصی فیہ

۲ بخاری، کتاب فرض الخمس۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب حکم الفئ

۳ بخاری، کتاب الجہاد، باب ما قیل فی درع النبی

۴ مشکوٰۃ، کتاب الرقاق بحوالۂ ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی

بلکہ اپنی اولاد کے لیے بھی جس کی دعا ہو کہ ”اے اللہ! تو میری اولاد کو قوت لایموت دے۔“[۱]
جو ہستی اپنے ذاتی مال میں بھی اپنے گھر والوں کا حصہ نہ قرار دے۔ دل کہتا ہے کہ وہ دنیا دار نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے خاندان اور قبیلے کی خاطر اللہ تعالیٰ پر کبھی تہمت نہیں باندھ سکتی۔

یہ بے غرضی اور اخلاص اور یہ بے مثال قربانیاں ہمارے سامنے سوال بن کر آتی ہیں کہ وہ انسان، جو اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مالک ہے، جو اگر چاہے تو اپنی دنیا بہتر سے بہتر طریقے سے بنا سکتا ہے، وہ کیوں عسرت و تنگی برداشت کر رہا ہے؟ عیش و عشرت اس کا استقبال کرتی ہے تو کیوں وہ ٹھکرا دیتا ہے؟ آخر وہ کتنا بلند مقصد ہے جس کے لیے یہ بہترین قوتیں اور صلاحیتیں صرف ہو رہی ہیں؟ اگر آدمی تعصب کا مارا ہوا نہ ہو اور حق کے لیے اس کے دل کے دروازے کھلے ہوں تو وہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ جو شخص واقعتاً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نہ کھڑا ہو، اس کے اندر یہ بے غرضی اور بے نفسی کبھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ جس وقت اس کے اندر یہ احساس ابھرے گا اس کو رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کا گرویدہ بنا دے گا۔

انقلاب آفریں سیرت

رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں زبردست قوتِ تاثیر تھی۔ چناں چہ بڑی بڑی شخصیتوں نے اس سے گہرا اثر قبول کیا۔ جن افراد کو آپؐ کا فیضِ صحبت نصیب ہوا وہ آپؐ کے عکسِ کامل بن گئے۔ آپ ﷺ میں اللہ کی یاد، آخرت کا خوف، ضبطِ نفس اور ایثار و قربانی کے جذبات تھے تو یہ جذبات ان کے اندر بھی ابھر آئے۔ آپ ﷺ کے اخلاق و سیرت میں جو طہارت اور پاکیزگی تھی وہ ان کے اخلاق و سیرت میں بھی منتقل ہوگئی۔ دین حق کے لیے ان میں بے پایاں اخلاص تھا اور باطل کے مقابلے میں ان کے اندر استقامت اور پامردی تھی۔ وہ بے یقینی کے عالم سے نکل کر یقین کے اس مقام تک پہنچ گئے جس سے اونچے مقام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے آپ ﷺ

---

[۱] بخاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی الخ، مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فی الکفاف والقناعۃ

کو رسول مانا اور اس طرح مانا کہ اس میں شک وشبہ کی کوئی آمیزش نہیں تھی۔ انھیں جس طرح اپنے وجود پر یقین تھا، ٹھیک اسی طرح یہ بھی یقین تھا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ ان کے اس یقین سے دنیا نے قدم قدم پر ٹکر لی، لیکن اسے متزلزل نہ کرسکی۔ وہ آزمائشوں میں ڈالے گئے، ہرطرح ستائے گئے، قید و بند کی تکلیفوں سے گزرے، مال و دولت سے محروم کیے گئے، لیکن ان کے یقین نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔

حضرت بلالؓ نے جب اعلان کیا کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو مکے کے لڑکے ان کے پیروں میں رسی باندھ کر گلیوں اور کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے تھے[۱] ان کا مالک امیہ بن خلف تپتی ہوئی ریت پر انھیں لٹا کر سینے پر پتھر رکھ دیتا کہ اگر محمد کا انکار نہ کروگے تو اسی حال میں مرجاؤگے۔ لیکن اس کے باجود محمد ﷺ نے توحید کا جو کلمہ انھیں پڑھایا تھا اس کے سوا کوئی دوسرا کلمہ پڑھنے سے انھوں نے انکار کردیا[۲]

حضرت خبابؓ کو انگاروں پر لٹا دیا جاتا جس سے ان کے جسم کی چربی پگھلنے لگتی۔ اس عذاب سے دہکتے ہوئے انگارے ٹھنڈے پڑجاتے ،لیکن ان کے یقین کی وہ آگ نہ بجھتی جسے محمد ﷺ نے روشن کیا تھا[۳]

نبوت کے جھوٹے مدعی مسیلمہ نے حضرت حبیب بن زیدؓ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، لیکن ان کے دل کی دنیا جس ایمان و یقین سے آباد تھی اسے نہ نکال سکا۔ وہ ان سے پوچھتا کہ کیا محمد اللہ کے رسول ہیں؟ تو پورے یقین کے ساتھ جواب دیتے کہ ہاں، محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جب وہ یہ سوال کرتا کہ کیاتم مجھے اللہ کا رسول مانتے ہو تو صاف کہہ دیتے کہ تمہاری ان خرافات کے سننے سے میرے کان بہرے ہیں[۴]

حضرت صہیبؓ کو اس جرم میں کہ وہ آپؐ کو اللہ کا رسول مانتے تھے، مکہ چھوڑنا

---

۱ مسند احمد: ۱/ ۴۰۴

۲ سیرت ابن ہشام: ۱/ ۳۳۹

۳ الاستیعاب فی اسماء الاصحاب

۴ حوالہ مذکور

پڑا تو انھوں نے اس شان سے ہجرت کی کہ اپنا سارا مال و متاع مشرکین کے حوالے کر دیا اور خالی ہاتھ مدینہ پہنچ گئے[۱]

جن لوگوں نے محمد ﷺ کے دعویٔ رسالت کو تسلیم کیا تھا ان کے نزدیک کسی بات کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ آپؐ کی زبان سے نکلی ہے۔ ان کے یقین کا یہ عالم تھا کہ غیب کی جن حقیقتوں کو آپؐ بیان کرتے وہ ان پر اس طرح ایمان لے آتے جیسے کہ انھوں نے ان حقیقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آپؐ نے معراج کا ذکر فرمایا کہ شب کے چند لمحات میں اللہ تعالیٰ آپؐ کو مکے سے بیت المقدس لے گیا، وہاں آپؐ نے نماز پڑھی اور پھر آپؐ مکہ واپس لوٹ آئے۔ آپؐ کے مخالفین کے نزدیک اس واقعہ کی روایت ہی آپؐ کی تکذیب کے لیے کافی تھی، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے سنا تو کہا: ''واللہ لئن کان قالہ لقد صدق'' (خدا کی قسم، اگر آپؐ نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو سچ بیان کیا ہے)[۲]

حضرت یاسرؓ خدا کی راہ میں مارے گئے، ان کی بیوی سمیہؓ کو ابوجہل کے نیزے نے شہید کر دیا اور ان کے بیٹے عمار کو لوہے کی زرہ پہنا کر چلچلاتی دھوپ میں ڈال دیا گیا[۳] وہ یہ سب کچھ جھیل گئے، کیوں کہ ان کے سامنے آپؐ کا یہ ارشاد تھا: صبرًا یا اٰل یاسر فان موعدکم الجنۃ[۴] ''صبر کرو اے آل یاسر! تم سے ملاقات جنت میں ہوگی۔''

حضور اکرم ﷺ نے جنگ بدر میں فرمایا کہ ''دوڑو جنت کی طرف جو آسمان و زمین کی طرح وسیع ہے۔'' یہ سنتے ہی عمیر بن حمام بے تاب ہو گئے اور جلدی جلدی اپنے جھولے سے چند کھجور کھانے لگے، پھر کچھ سوچ کر کہا کہ ان کھجوروں کے ختم ہونے تک

---

۱ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، تذکرہ حضرت صہیبؓ

۲ سیرت ابن ہشام: ۲/ ۵۔ یہاں واقعۂ معراج کی ان تمام تفصیلات سے بحث نہیں جو صحیح حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں۔

۳ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، تذکرہ مذکورہ اصحاب

۴ مستدرک حاکم: ۳/ ۳۸۳

زندہ رہوں تو یہ بڑی لمبی حیات ہوگی، چناں چہ فوراً ہاتھ کی کھجوریں پھینک دیں اور میدان جہاد میں جان دے دی۔[۱]

جنگِ احد میں انس بن نضرؓ حضرت سعدؓ سے فرماتے ہیں: خدا کی قسم، مجھے احد پہاڑ کے پیچھے سے جنت کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ کہا اور پھر اسی وقت دشمن سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ بعد میں لوگوں نے دیکھا کہ ان کے جسم پر نیزے اور تلوار کے اسّی (۸۰) سے زیادہ زخم تھے۔[۲]

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا تو حضرت عمرؓ گھر گئے اور اپنا آدھا مال لے آئے۔ حضرت ابو بکرؓ گئے اور اپنا کل سرمایہ لاکر سامنے رکھ دیا اور کہا کہ بیوی بچے اب اللہ اور اس کے رسول کے حوالے ہیں۔[۳]

غزوۂ تبوک کے موقع پر لشکر کے لیے ساز و سامان کا کوئی انتظام نہیں ہو رہا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس لشکر کو مسلح کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس کا اجر دے گا۔ ان الفاظ کے سنتے ہی حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے اور لشکر کی ایک ایک ضرورت کا اس طرح انتظام کیا کہ اونٹوں کے لیے رسیاں اور نکیلیں تک فراہم کر دیں۔[۴]

رسول اکرم ﷺ نے اللہ کا حکم سنایا کہ انسان نیکی کا مقام اسی وقت پا سکتا ہے جب کہ وہ اپنی بعض محبوب چیزوں سے دست بردار ہوجائے اس پر حضرت ابو طلحہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرا فلاں باغ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے، اسے میں اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اسی سے مجھے اس کے اجر و ثواب کی توقع ہے۔[۵]

---

۱ مسلم، کتاب الامارۃ، باب ثبوت الجنۃ للشہید

۲ بخاری، کتاب الجہاد، باب قول اللہ من المومنین رجال الخ

۳ ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی الرخصۃ فی ذالک

۴ ترمذی ونسائی، ابواب المناقب، مناقب عثمان بن عفان۔ نسائی، کتاب الجہاد، باب فضل من جہز غازیاً

۵ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ علی الاقارب

دو آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں ایک مقدمہ لے کر پہنچے، لیکن دونوں میں سے کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ "میں انسان ہوں، تم اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو، ممکن ہے، تم میں سے کوئی شخص اپنے دعوے کو دوسرے سے زیادہ وضاحت اور ہوشیاری کے ساتھ پیش کرنے میں کام یاب ہوجائے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ لیکن یاد رکھو، اگر اس طرح میں کسی کو اس کے بھائی کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی دوں تو وہ اسے ہرگز نہ لے۔ کیوں کہ میں جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا اس کے حوالے کر رہا ہوں۔" اس تقریر کا اتنا اثر ہوا کہ دونوں بے اختیار رونے لگے اور اپنے اپنے دعوے سے دوسرے کے حق میں دست بردار ہو گئے[1]

محمد ﷺ کو رسول ماننے والوں کا یہ یقین، یہ ایمان اور یہ قربانیاں میرے نزدیک آپؐ کے برحق ہونے کی زبردست دلیل ہیں، کیوں کہ آج تک اس کی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی جھوٹے نے دوسروں کو صداقت کا پابند بنادیا ہو، کسی خدا سے بے خوف انسان نے اپنے ساتھیوں کے اندر اس کا خوف اور خشیت پیدا کردی ہو اور کسی پست سیرت آدمی کی صحبت سے لوگوں کی سیرت بلند ہوگئی ہو۔ جھوٹ، انسان کو کم زور کردیتا ہے، اس لیے جھوٹے شخص میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ کسی کو سہارا دے سکے۔ اس کا مقام مصلحِ اخلاق کا نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ ظاہر ہے، جو خود دوسروں کی مدد کا محتاج ہو، وہ کسی کی دست گیری کیا کرسکتا ہے؟ میدانِ عمل میں جس کے قدم لڑکھڑا رہے ہوں، ناممکن ہے کہ وہ کسی کم زور اور ناتواں جسم میں استقلال اور ثابت قدمی کی روح پھونک دے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب القضاء، باب ماجاء فی قضاء القاضی اذا اخطأ

(یہ مضمون ماہ نامہ 'زندگی' رام پور، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ راقم کی کتاب 'خدا اور رسول کا تصور — اسلامی تعلیمات میں' یہ شامل ہے۔ اب وہیں سے اس کتاب کا حصہ بنایا جا رہا ہے)۔

☆☆☆

مکی دور

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۭ
وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝٢٤ [فاطر:٢٤]

ہم نے آپ کو دین حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے، جس میں ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

دعوتِ اسلام

(بعثت، دعوت اور اس کے مختلف مراحل)

ابتدائیہ

- دورِ جاہلیت میں دین حق کے متلاشی

مکی دور

- نبوت سے سرفرازی اور دعوت کا آغاز
- السابقون الاولون (اسلام ان کے دل کی آواز تھا)
- دعوتِ عام (اہل خاندان سے خطاب)
- مکی دورِ ابتلا – وہ اس طرح آزمائے گئے
- اسلام کی پیش قدمی اور مخالف صفوں سے حمایت
- مواخاتِ مکہ
- ہجرتِ حبشہ
- تبلیغ دین میں غیر مسلم سردارانِ قبائل کا تعاون

ابتدائیہ

دورِ جاہلیت میں دینِ حق کے متلاشی

مکہ کے سخت ترین حالات اور آزمائشوں کے طوفان میں اسلام آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ کفر وشرک کو چھوڑ کر اسلام کے دامن میں آنے والے آرہے تھے۔ ان کے لیے اسلام میں کشش کا ایک ہی پہلو نہیں تھا۔ کوئی ایک زاویے سے متاثر ہورہا تھا تو کوئی دوسرے زاویے سے، کسی کے لیے اسلام میں کشش کے دو ایک نہیں، بہت سے اسباب تھے اور وہ بے ساختہ اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ آیئے، ان اسباب کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے مکہ اور حجاز پورا کا پورا شرک اور بت پرستی میں غرق تھا۔ لیکن اسی ماحول میں چند وہ افراد بھی تھے جو اسے خلافِ عقل اور خلافِ فطرت سمجھتے تھے۔ اور اس سے دامن کش تھے، لیکن ان کے سامنے کوئی واضح راستہ نہیں تھا۔ کسی نے عیسائیت کے دامن میں پناہ لی اور کوئی تلاشِ حق میں حیران وسرگرداں گھومتا رہا۔ مورخین نے اس طرح کے افراد میں ورقہ بن نوفل، عبید اللہ بن جحش، عثمان بن حویرث اور زید بن عمرو بن نفیل کا ذکر کیا ہے۔ ان میں عبیداللہ بن جحش نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا دور دیکھا۔ باقی سب کا زمانہ بعثت سے کچھ پہلے کا ہے۔

ان چاروں افراد نے آپس میں کہا کہ ہماری قوم دین ابراہیم کو ترک کر چکی ہے اور پتھر کے بتوں کی پرستش کرنے لگی ہے، حالاں کہ یہ پتھر کے بت نفع وضرر کی کوئی

طاقت نہیں رکھتے، ہمیں کوئی دوسرا دین تلاش کرنا چاہیے۔ چناں چہ وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے[۱]

ان افراد میں زید بن عمرو بن نفیل کی اس پہلو سے شہرت ہے کہ وہ بت پرستی کے شدید مخالف تھے، اس سے اجتناب کرتے تھے، بتوں کے نام پر جو جانور ذبح کیے جاتے وہ نہیں کھاتے تھے۔ کہتے تھے: بکری کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، اسی نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے لیے چارہ اگایا اور تم ہو کہ اسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہو۔ انھوں نے دین حق کی تلاش میں شام کا سفر کیا، یہود و نصاریٰ کے علماء سے ملاقات کی، مگر انہیں اطمینان نہیں ہوا۔ وہ اپنے طور پر اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ آج میرے علاوہ کوئی دین ابراہیم پر قائم نہیں ہے۔ جو اشخاص جہالت کی وجہ سے اپنی بچیوں کو زندہ دفن کرنے کا ارادہ کرتے، ان بچیوں کو ان سے لے کر ان کی پرورش کرتے۔ وہ بڑی ہو جاتیں تو ان کے سرپرستوں سے کہتے کہ چاہو تو تم انہیں لے جاؤ، ورنہ میں خود ان کے اخراجات برداشت کروں گا[۲]

ابن ہشام کہتے ہیں کہ زید بن عمرو بن نفیل نے یہودیت یا نصرانیت نہیں اختیار کی، اپنے قوم کے دین (شرک) کو بھی چھوڑ رکھا تھا، بتوں کی پرستش سے دور رہتے، مردار، خون اور بتوں کے نام پر ذبح کیے گئے جانور نہیں استعمال کرتے تھے۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع کرتے تھے، قوم میں جو خرابیاں تھیں انہیں کھل کر بیان کرتے تھے[۳]

عامر بن ربیعہ کا بیان ہے کہ زید کہا کرتے تھے کہ میں حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل کے دین پر عمل کر رہا ہوں۔ مجھے بنو اسمٰعیل میں سے ایک نبی کا انتظار ہے۔ نہیں

---

[۱] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۵۹

[۲] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل

[۳] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۶۱

معلوم، اس کی بعثت تک میں زندہ رہوں گا یا نہیں؟ اگر تمہاری حیات باقی رہے تو میرا سلام ان تک پہنچانا۔ بعثت سے پہلے رسول اللہ ﷺ اور زید کی ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق آپ کی بعثت سے پانچ سال قبل ان کا انتقال ہوا۔[۱]

زید بن عمرو بن نفیل کو ایمان کی دولت نہیں ملی، لیکن ان کے صاحب زادے حضرت سعید بن زید کا شمار 'السابقون الاولون' میں ہوتا ہے، جنھوں نے اعلانِ رسالت کے بعد ایمان لانے میں تاخیر نہ کی۔

ورقہ بن نوفل بھی بت پرستی سے متنفر اور بے زار تھے۔ انہوں نے نصرانیت اختیار کرلی۔ عبرانی زبان سے واقفیت حاصل کی۔ اس میں بخوبی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ عبرانی سے عربی میں ترجمہ کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت حیات تھے، لیکن ایمان نہ لا سکے۔[۲]

عبید اللہ بن جحش، شش و پنج میں پڑے رہے۔ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ بعثت کے بعد اسلام لائے۔ مسلمانوں نے حبشہ ہجرت کی تو اپنی بیوی ام حبیبہؓ کے ساتھ انہوں نے بھی ہجرت کی۔ وہاں پہنچ کر اسلام سے منحرف ہو گئے اور نصرانیت قبول کر لی۔ وہیں نصرانیت ہی کی حالت میں انتقال کر گئے۔[۳]

عثمان بن الحویرث کو قیصر نے تاج پہنایا اور مکہ کا بادشاہ قرار دیا، لیکن مکہ کے قبائل حریت پسند تھے۔ انہوں نے کسی کی بادشاہت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شام ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔[۱]

---

۱ ابن حجر، فتح الباری: ۷/ ۵۲۵-۵۲۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ذہبی، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۸۵-۹۲۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۱۵۳-۱۵۹

۲ بخاری، کتاب بدء الوحی۔ اس کا ذکر آغاز وحی کے ذیل میں آرہا ہے۔ علامہ طبری اور علامہ بغوی وغیرہ نے ورقہ بن نوفل کو صحابہ میں شمار کیا ہے۔ اس لیے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسلام کی حالت میں انتقال ہوا، لیکن یہ روایات کم زور ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۴/ ۴۸۶-۴۸۵۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۵/ ۴۱۶-۴۱۷

۳ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۶۰

سعید روحیں

۱- یہ چار افراد ہی نہیں بلکہ اور بھی افراد تھے جو بت پرستی سے مجتنب تھے۔ علامہ ابن جوزیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت ابوبکر، زید بن عمرو بن نفیل، عبیداللہ بن جحش، عثمان بن حویرث، ورقہ بن نوفل، رباب بن البراء، اسعد بن کریب الحمیری، قس بن ساعدہ الایادی، ابوقیس بن صرمہ نے دور جاہلیت میں بھی کبھی بت پرستی نہیں کی۔[۱]

علامہ حلبیؒ اسے نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ان میں سے کسی کے بت پرستی نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ سب اصطلاحی معنی میں مومن و مسلم تھے۔[۲]

اس طرح کے اور بھی لوگ رہے ہوں گے جن کی فطرت شرک سے ابا کر رہی ہوگی، جنھیں اسلام کی دعوتِ توحید دل کی آواز محسوس ہو رہی ہوگی اور اس کا استقبال اور اس کی طرف پیش قدمی ان کے لیے سکون قلب اور راحت جان کا باعث ہوتی ہوگی۔ چناں چہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے اسلام آیا تو انہیں اس کے دین حق ہونے میں ذرا تامل نہ ہوا اور انہوں نے اسے لپک کر قبول کیا۔ اس طرح کے افراد کا معاشرے میں معروف ہونا ضروری نہیں ہے لیکن دعوت توحید کے اٹھنے کے بعد وہ خود بخود سامنے آنے لگتے ہیں۔

۲- اس نازک دور میں جن اصحاب نے اسلام قبول کیا وہ معاشرہ کی اخلاقی گندگیوں سے بڑی حد تک پاک تھے، اخلاق و کردار کے پہلو سے نمایاں اور ممتاز مقام کے حامل تھے۔ ان کی نیکی اور شرافت معاشرہ میں مسلّم تھی۔ انہیں اسلام کی دعوت، خیر اور بھلائی کی دعوت محسوس ہوئی۔ اسلام کی تعلیمات ان کے مزاج اور سیرت سے اس قدر ہم آہنگ تھیں کہ وہ اس سے دامن کش نہیں رہ سکتے تھے۔

---

۱ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ مع التعلیق: ۱/۲۶۱

۲ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۱/۴۳۵

مکی دور

نبوت سے سرفرازی اور دعوت کا آغاز

محمد رسول اللہ ﷺ حجاز کے مشہور شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ چالیس سال کی عمر میں منصب رسالت پر سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد تیرہ [۱۳] سال آپ کا قیام مکہ ہی میں رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ مدینہ ہجرت کر گئے اور دس سال مدینہ میں جلوہ افروز رہے۔ ترسٹھ [۶۳] سال کی عمر میں آپ اس دارفانی سے رحلت فرما گئے[۱]

دوشنبہ ۱۷/ رمضان المبارک کی تاریخ تھی کہ غارِ حرا میں آپ پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی۔[۲] یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا پر بارانِ رحمت کا نزول تھا۔ اس کا سلسلہ وقفہ

---

[۱] بخاری، مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبی و اصحابہ الی المدینۃ۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب قدر عمرہ و اقامتہ بمکۃ و المدینۃ۔ یہ روایت حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ہے۔ علماء نے اسی بیان کو صحیح اور مستند مانا ہے۔ حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ اور خود حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس سے کسی قدر مختلف روایات آئی ہیں، لیکن ان سب کی توجیہ کی گئی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان ہی صحابہ کرام سے سابقہ بیان کی تائید میں بھی روایات موجود ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، مسلم مع شرح نووی، ج ۵، جزء ۱۵، ص۹۹-۱۰۰۔ ابن حجر، فتح الباری: ۸/ ۱۵۰-۱۵۱۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۱۹۰-۱۹۱۔ حاکم نے بھی اسی کی تائید میں حضرت علیؓ کا بیان نقل کیا ہے اور مخالف روایات کو رد کر دیا ہے۔ المستدرک علی الصحیحین: ۳/ ۳۰

[۲] ابن سعد، طبقات: ۱/ ۱۹۳-۱۹۲۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۷۶-۲۷۷۔ اس سلسلہ میں ۷/ رمضان، ۲۴/ رمضان، ۸/ ربیع الاول اور ۲۷/ رجب کی روایات بھی ملتی ہیں۔ ملاحظہ ہو زرقانی علی المواہب اللدنیہ: ۱/ ۳۸۶-۳۹۰۔ قرآن میں صراحت ہے کہ اس کا نزول ماہ رمضان میں ہوا۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرۃ:۱۸۵) البتہ تاریخ نزول میں اختلاف ہے۔ جمہور کی رائے ۱۷/ رمضان کی ہے۔

وقفہ کے ساتھ حسبِ حال تیئیس [۲۳] سال تک جاری رہا۔ اس کے اثرات پھیلنے شروع ہوئے اور بہت جلد سرزمین حجاز اس سے سیراب ہوگئی۔ پھر اسے وہ قوت وتوانائی حاصل ہوئی کہ ایک مختصر سی مدت میں حجاز سے اٹھ کر یہ بادل دنیا کے بڑے حصے پر برسنے لگا۔

تاریخ کے اس انقلابی سفر کا آغاز مکہ مکرمہ سے ہوا۔آیئے دیکھیں کہ مکہ میں یہ کن حالات اور مراحل سے گزرا اور ان میں کیا رہ نمائی فراہم کی گئی۔

آغازِ وحی

غارِ حرا میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے فرشتہ حضرت جبرئیلؑ کو اس کی حقیقی شکل میں دیکھا تو لرزہ براندام ہو گئے اور آپ پر خوف اور دہشت کی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ ایک نیا مشاہدہ اور ایک نیا تجربہ تھا۔ آپ نے اس کا کبھی تصور بھی نہیں فرمایا تھا۔ فرشتہ نے آپ سے پڑھنے کے لیے کہا۔ آپ نے فرمایا: میں اُمّی ہوں، پڑھ نہیں سکتا۔ فرشتہ نے آپ کو بار بار سینے سے لگایا اور اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ⑤ (العلق:۱-۵)

پڑھو اپنے رب کے نام سے، جس نے سب کو پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے۔ پڑھو! تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔ ان چیزوں کی تعلیم دی جنہیں انسان نہیں جانتا تھا۔

فرشتہ چلا گیا اور آپ اس پیغام کو لے کر گھر پہنچے اور خوف سے چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ اس بالکل نئی اور غیر متوقع صورت حال سے آپ کو اپنی جان کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔

رسول اللہ ﷺ نے غار حرا میں جو کچھ دیکھا اور جو سنا، سب سے پہلے اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ سے بیان فرمایا۔ حضرت خدیجہؓ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ وہ توریت اور انجیل کے عالم اور وحی و رسالت کی حقیقت سے واقف تھے۔ اس لیے ان سے توقع تھی کہ وہ اس معاملہ میں کوئی صحیح راہ نمائی کرسکیں گے۔ ورقہ نے پورا واقعہ سننے کے بعد کہا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰؑ کے پاس اللہ کا پیغام لایا کرتا تھا۔ بے شک

آپ بھی انہی کی طرح اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن جس منصب پر آپ کو فائز کیا گیا ہے، اس میں مشکلات اور پریشانیاں ہیں۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں، جب کہ آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی۔ آپ نے حیرت سے سوال کیا کہ کیا میری قوم مجھے میرے وطن سے نکال دے گی؟ انہوں نے کہا: ہاں، جب بھی کوئی شخص وہ پیغام لے کر آیا جو آپ کے پاس آیا ہے، لوگ اس کے دشمن ہو گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا: آپ کی تکذیب ہوگی، آپ کو اذیت دی جائے گی، آپ کو یہاں سے نکالا جائے گا اور آپ سے جنگ ہوگی۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو میں پوری طرح آپ کا ساتھ دوں گا۔ لیکن ورقہ بن نوفل کی حیات نے ساتھ نہ دیا۔ وہ جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔[1]

اس کے بعد ایک عرصہ تک وحی کی آمد رکی رہی۔ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ یہ وقفہ اس لیے تھا تا کہ آپ کی بے چینی اور اضطراب دور ہو اور آپ دعوت الی اللہ کی عظیم ذمہ داری اٹھانے کے لیے پوری طرح تیار ہو جائیں۔[2]

---

[1] بخاری، کتاب بدء الوحی۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ۔ ایک روایت میں ہے کہ پہلے حضرت خدیجہؓ خود ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں اور آپ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتا تھا۔ بے شک یہ بھی اس امت کے نبی ہیں۔ ان سے کہو کہ ثابت قدم رہیں۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو اس کی اطلاع دی۔ اس سے آپ نے ایک طرح کا اطمینان محسوس فرمایا۔ اس کے بعد آپؐ حسب معمول کعبہ کا طواف فرما رہے تھے کہ اسی دوران میں ورقہ نے آپ سے ملاقات کی اور کہا کہ مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا اور کیا سنا؟ آپ نے ساری تفصیل بیان کی تو انہوں نے وہ جواب دیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ابن ہشام: ۱/ ۲۷۴، ۲۷۵۔ طبری نے بھی اسی تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ الامم والملوک: ۱/۵۳۳، نیز ملاحظہ ہو ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۸۶

[2] یہ وقفہ کتنا رہا، اس کے بارے میں روایات میں اختلاف ہے۔ بعض روایات سے اس کی مدت ڈھائی سال معلوم ہوتی ہے، بعض روایات میں یہ مدت چھ ماہ بیان ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ وقفہ چند دن کا تھا۔ ابن حجر، فتح الباری: ۱/۴۰

انذار کا حکم

جب وحی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا تو آپ نے فرمایا: میں نے اسی فرشتے کو دیکھا جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا کہ وہ زمین اور آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔اس سے میں نے اپنے اندر لرزہ اور کپکپی محسوس کی اور گھر جا کر کہا کہ مجھے چادر اوڑھا دو۔اس وقت سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں:

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ (المدثر:۱-۷)

اے چادر اوڑھنے والے اٹھو اور خبر دار کرو اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو ،اپنے کپڑے پاک رکھو اور گندگی سے دور رہو اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔

اس کے بعد وحی تسلسل کے ساتھ آنے لگی[۱]

یہ 'انذار' کا پہلا حکم تھا۔یہ اس بات کا حکم تھا کہ لوگوں کو ان کے انجام سے آگاہ کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ کفر و شرک، جس میں وہ مبتلا ہیں اور جس روشِ حیات پر وہ چل رہے ہیں، وہ ان کے لیے تباہ کن ہے۔نجات کا راستہ ان کے لیے صرف یہ ہے کہ اللہ واحد کی بندگی اختیار کریں، آخرت پر یقین رکھیں اور آپ کی رسالت کو تسلیم کریں۔اس طرح باقاعدہ آپ کی دعوت وتبلیغ کا کام شروع ہو گیا۔

علامہ مقریزیؒ کہتے ہیں:

---

[۱] بخاری، کتاب بدء الوحی۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بدء الوحی الی رسول اللہ۔ایک روایت میں ہے کہ فترۃ وحی کے بعد والضحیٰ نازل ہوئی تھی، لیکن صحیح بخاری کی روایت کو ترجیح حاصل ہے۔ سورہ والضحیٰ کا شانِ نزول یہ ہے کہ علالت کی وجہ سے آپ دو تین دن قیام نہ کر سکے تو ایک عورت نے طنز کیا کہ شاید (نعوذ باللہ) تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔اس پر یہ سورت نازل ہوئی اور کہا گیا کہ آپ کو آپ کے رب نے نہیں چھوڑا ہے۔ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ:۱/۴۱۴

ثم أمره اللّٰه تعالٰى فى هذه الأية (قُمْ فَاَنْذِرْ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ)ان ينذر قومه و يدعوهم الى اللّٰه عز وجل فشمر رسول اللّٰهﷺ ساق الاجتهاد و قام فى طاعة اللّٰه اتم قيام يدعو الى اللّٰه تعالٰى الصغير و الكبير، و الحر و العبد، الرجال و النساء، الاسود و الاحمر[۱]

پھر اللہ تعالیٰ نے آیت قُمْ فَاَنْذِرْ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ (کھڑے ہو جاؤ اور انہیں ان کے انجام سے ڈراؤ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو) میں رسول اللہﷺ کو حکم دیا کہ آپ اپنی قوم کو آگاہ کریں اور انہیں اللہ عز وجل کی طرف دعوت دیں۔ اس کے بعد آپ نے کمر کس لی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں پوری طرح کھڑے ہوگئے اور اللہ کی طرف چھوٹے بڑے، آزاد، غلام، مرد، عورت اور گورے اور کالے سب کو بلانے لگے۔

اس طرح آپ کی دعوت وتبلیغ کا کام باقاعدہ شروع ہوگیا۔ یہ کام مختلف مراحل سے گزرا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور اس کی عطا کردہ بصیرت سے رسول اللہﷺ نے جو تدابیر اور حکمت عملی اختیار کی، اس کے بڑے دور رس نتائج نکلے۔ اللہ کے دین کے لیے جاں نثار افراد ملے، اسے استحکام نصیب ہوا اور نازک ترین حالات سے گزر کر وہ فتح و کامرانی سے ہم کنار ہوا۔[۲]

۱۔ مقریزی، امتاع الاسماع: ۱/ ۱۵

۲۔ علامہ ابن قیم آپ کی دعوت کے بارے میں لکھتے ہیں: لها مراتب، المرتبة الاولٰى: النبوة، الثانية :انذار عشيرته الاقربين، الثالثة: انذار قومه، الرابعة: انذار قوم ما اتاهم من نذير من قبله و هم العرب قاطبة، الخامسة: انذار جميع من بلغته دعوته من الجن و الانس الى اٰخر الدهر" زادالمعاد: ۱/ ۸۶ (دعوت کے کئی مراحل تھے۔ پہلا مرحلہ خود نبوت کا تھا، دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ آپ اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈرائیں۔ تیسرا مرحلہ آپ کی قوم کے درمیان انذار کا فرض انجام دینا تھا۔ چوتھا مرحلہ ان لوگوں کے درمیان انذار کا تھا جن کے پاس آپ سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نذیر نہیں آیا تھا۔ اس میں سارا عرب آجاتا ہے۔ پانچواں مرحلہ ان تمام جن و انس کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا تھا جن تک آپ کی دعوت پہنچے۔ قیامت تک یہ جاری رہے گا۔)

انفرادی دعوت

نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد آپ نے پہلے ہی مرحلہ میں عام مجمعوں اور کھلے جلسوں میں اللہ تعالیٰ کا پیغام نہیں پہنچایا، بلکہ انفرادی طور پر ان لوگوں کو اللہ کے دین کی دعوت دی جن سے آپ قربت اور یگانگت محسوس فرماتے تھے اور جن سے کم از کم بات سننے کی توقع تھی یہ ایک طرح سے خاموش تبلیغ تھی۔اس کا سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔ابن سعد کی روایت ہے:

كان يدعو من اول ما نزلت عليه النبوة ثلاث سنين مستخفياً الى ان امر بظهور الدعاء[1]	نبوت کے نازل ہونے کے بعد سے تین سال تک آپ خفیہ طریقہ سے دعوت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کو کھل کر دعوت دینے کا حکم دیا گیا (اور آپ کھل کر دعوت دینے لگے)۔

اس کا تذکرہ عروہ بن زبیر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

لَا يظهر الدعوة فى تلك المدة الَّا للمختصين ثم أعلن و صدع[2]	اس مدت میں آپ صرف مخصوص لوگوں ہی کے سامنے دعوت پیش فرماتے تھے۔اس مدت کے ختم ہونے کے بعد آپ نے دعوت کا اظہار و اعلان کیا۔

اس کے بعد دعوت عام کا آغاز ہوا۔

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ:۱/ ۱۹۹

[2] حوالہ سابق

السابقون الاوّلون

گھر کے محاذ پر کام یابی

رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی جاں نثاروں کا ایک حلقہ وجود میں آ گیا اور گھر کے محاذ پر کام یابی حاصل ہوئی۔

حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ نے تصدیق کی

رسول اللہ ﷺ نے فرشتہ کو دیکھنے اور وحی کے نازل ہونے کا ذکر سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ سے کیا اور جو کلام فرشتہ سے سنا تھا وہ سنایا۔ انہیں جب اطمینان ہو گیا کہ آپ کے پاس فی الواقع خدا کا فرشتہ ہی آیا ہے اور ورقہ بن نوفل نے بھی اس کی تائید کی تو آپ ایمان لے آئیں۔ اس طرح سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ کو ایمان کی دولت ملی۔ یہ دعوت و تبلیغ کی راہ میں پہلی اور بہت بڑی کام یابی تھی۔ یہ زندگی بھر کے رفیق کا ہم خیال و ہم سفر ہونا تھا۔ بعد کے ادوار میں اسلام کی دعوت کی وجہ سے بہت جلد چاروں طرف سے آپ کی تردید و تکذیب ہونے لگی، قدم قدم پر مخالفت شروع ہوگئی، ڈرایا دھمکایا جانے لگا اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی جانے لگیں۔ یہ سب کچھ باہر ہو رہا تھا، لیکن جب آپ گھر پہنچتے تو حضرت خدیجہؓ آپ کی ہر بات کی تصدیق و تائید کرتیں۔ باہر ہونے والی مخالفت کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش فرماتیں۔ آپ کو اطمینان اور تسلی دیتیں اور ہر اذیت اور دکھ کا مداوا بن جاتیں۔ ابن ہشام لکھتے ہیں:

لَا یسمع شیأ مما یکرھه من رد علیه و تکذیب له فیحزنه ذلک الّا فرّج اللّٰہ عنه بھا اذا رجع الیھا تثبته و تخفّف علیه و تصدّقه و تھوّن علیه أمر الناس، رحمھا اللّٰہ[1]

رسول اللہ ﷺ اپنی تردید و تکذیب میں جو ناگوار باتیں سنتے وہ فطری طور پر آپ کے لیے غم وحزن کا باعث ہوتیں، لیکن جب آپ حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچتے تو اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے اس حزن و ملال کو دور فرما دیتا۔ وہ آپ کو ثابت قدمی کی تلقین کرتیں، آپ کے غم کو ہلکا کرتیں، آپ کی تصدیق و تائید کرتیں اور لوگوں کے رویہ کو بے وزن اور خفیف بنا کر پیش کرتیں۔ رحمہا اللہ۔

حضرت خدیجہؓ ایک دولت مند خاتون تھیں۔ رسول اکرم ﷺ کی زوجیت میں آنے سے پہلے ہی ان کی تجارت بہت پھیلی ہوئی تھی۔ آپ پر ایمان لانے کے بعد انھوں نے اپنی ساری دولت آپ کے حوالے کردی کہ اس کو اللہ کے دین کی راہ میں جس طرح چاہیں اور جہاں ضرورت محسوس ہو، صرف کریں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کی خاطر مال کی محبت سے اس طرح دست بردار ہوجانا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہؓ کو یہی بڑا دل عطا کیا تھا۔ دعوت اسلامی کے بالکل ابتدائی اور نازک دور میں، جب کہ آپ اس کے لیے پوری طرح سے وقف ہو گئے تھے، آپ کی تجارت عملاً ختم ہوچکی تھی اور آپ کا کوئی مستقل ذریعہ معاش نہ تھا، حضرت خدیجہؓ کی دولت سے آپ کو بڑی مدد ملی۔ یہی بات آپ نے ایک موقع پر اس طرح بیان فرمائی:

قد اٰمنت بی اذ کفر بی الناس و صدقتنی اذ کذبنی الناس و واستنی بما لھا اذ حرمنی الناس[2]

وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائیں جب کہ لوگوں نے میرا انکار کیا، اس وقت میری تصدیق کی جب کہ لوگوں نے مجھے جھٹلایا اور اس وقت اپنے مال کے ذریعہ میری دل جوئی اور غم خواری کی جب کہ لوگوں نے مجھے اس سے محروم کر دیا تھا۔

ایک اور روایت کے الفاظ اس سے زیادہ واضح ہیں:

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۷۷

[2] مسند احمد: ۶/ ۱۱۸۔ ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، تذکرۃ خدیجہؓ

و اللّٰہ لقد اٰمنت بی اذ کفر بی الناس و اٰوتنی حین طردنی الناس و اعطتنی مالھا فأنفقتہ فی سبیل اللّٰہ[۱]	خدا کی قسم، وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائیں جب کہ لوگوں نے میرا انکار کیا اور اس وقت جگہ دی جب کہ لوگوں نے مجھے دور کر دیا اور اپنا مال مجھے دے دیا اور میں نے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔

آپ کی چاروں صاحب زادیاں حضرات زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہؓ بھی آپ پر ایمان لے آئیں[۲] اس سے آپ کو وہ خانگی سکون حاصل رہا، جس سے کارِدعوت میں تقویت ملی۔

حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ ایمان لائے۔ یہ گھر کے محاذ پر آپ کی مزید کام یابیاں تھیں۔ حضرت علیؓ آپ کے چچا زاد بھائی تھے، لیکن ان کی حیثیت آپ کی اولاد کی سی تھی۔ وہ آپ کے پروردہ اور آپ کے گھر کے فرد تھے۔ نبوت سے پہلے کی بات ہے کہ مکہ میں سخت قحط پڑا تھا۔ ابوطالب چوں کہ کثیرالاولاد تھے اور معاشی لحاظ سے کچھ زیادہ آسودہ نہیں تھے، اس لیے فطری طور پر سخت پریشان تھے۔ ان کی یہ پریشانی آپ سے دیکھی نہیں گئی۔ آپ نے حضرت عباسؓ سے کہا کہ اس وقت ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔ اس کی آسان صورت یہ ہے کہ ان کی اولاد میں سے ایک

۱؎ علی المتقی، کنز العمال: ۱۲ / ۱۶۷

۲؎ رسول اللہ ﷺ کی چاروں صاحب زادیاں اور صاحب زادوں میں قاسم، طاہر اور طیب حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھے۔ بعض حضرات کے نزدیک نبوت سے پہلے آپ کے دو صاحب زادے تھے، ان کا مکہ ہی میں کم سنی میں انتقال ہوگیا۔ آپ کے تیسرے یا چوتھے صاحب زادے ابراہیم مدینہ میں ماریہ قبطیہ سے پیدا ہوئے۔ ان کا بھی تین سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ البتہ صاحب زادیاں نبوت کے بعد باحیات رہیں، مدینہ ہجرت کی اور وہیں وفات پائی۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۱ / ۱۲۴، ۷ / ۸۲، السیرۃ الحلبیہ ج ۲ ص ۴۶۰-۴۶۱

کا بوجھ میں اٹھاؤں کروں اور ایک کا آپ برداشت کریں۔ حضرت عباسؓ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ ابوطالب سے مشورہ کے بعد حضرت عباسؓ اپنے ساتھ حضرت جعفرؓ کو لے گئے اور آپ حضرت علیؓ کو اپنے گھر لے آئے۔[1]

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ نزول وحی کے بعد جلد ہی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کو وضو اور نماز کی تعلیم دی۔ آپ نے حضرت خدیجہؓ کو اس کا طریقہ بتایا۔ لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر دونوں نماز ادا فرماتے تھے۔ دو ایک ہی دن گزرے تھے کہ حضرت علیؓ نے دیکھ لیا اور دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے اور اسی کو لے کر اس کے پیغمبر دنیا میں آتے رہے ہیں۔ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لا شریک پر ایمان لے آؤ اور لات وعزیٰ کا انکار کردو۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: یہ وہ بات ہے جو اس سے پہلے میں نے نہیں سنی۔ جب تک میں اپنے باپ ابوطالب سے اس کا ذکر نہ کروں، کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ آپ نے فرمایا: علی! اگر تم میری بات نہیں مان رہے ہو تو مجھے اصرار نہیں ہے، لیکن اسے خفیہ رکھو۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ اس مرحلہ میں کسی کے علم میں یہ بات آئے کہ آپ کا طریقۂ عبادت دوسروں سے مختلف ہے۔ حضرت علیؓ اس رات خاموش رہے۔ پھر اسی اثنا میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں اسلام کی طرف رجحان پیدا فرما دیا۔ صبح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ نے مجھ سے کل کیا فرمایا تھا؟ آپ نے اپنی پہلی بات دہرائی کہ 'لا الٰہ الا اللہ لا شریک لہ' کا اقرار اور لات وعزیٰ کا انکار کرو۔ اللہ تعالیٰ کے جھوٹے شریکوں سے براءت ظاہر کرو۔ چناں چہ اس کے بعد حضرت علیؓ ایمان لے آئے۔ لیکن ابوطالب کے ڈر سے اس کا اظہار نہیں کیا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نماز کے اوقات میں سب سے، حتّٰی کہ اپنے چچاؤں سے بھی

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۸۳

[2] ذہبی، تاریخ الاسلام (السیرۃ النبویۃ): ۱/ ۱۳۵۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۲۸

مخفی رکھ کر حضرت علیؓ کے ساتھ مکہ کی کسی گھاٹی میں نماز پڑھتے تھے۔ ایک روز ابوطالب نے دونوں کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: بھتیجے! یہ کون سا دین ہے جس پر تمہیں عمل کرتے دیکھ رہا ہوں؟ آپ نے فرمایا: چچا جان! یہ اللہ کا دین ہے، اس کے فرشتوں کا دین ہے، اس کے رسولوں کا دین ہے، یہی ہمارے باپ ابراہیم کا دین تھا۔ اسی دین کے ساتھ اللہ نے مجھے اپنے بندوں کی طرف بھیجا ہے۔ چچا جان! میری نصیحت اور خیر خواہی کے اور میری اس دعوت کے، جو میں دے رہا ہوں، آپ سب سے زیادہ حق دار ہیں اور آپ سب سے زیادہ اس کے مستحق ہیں کہ اسے قبول کریں اور میری مدد فرمائیں۔ ابوطالب نے فرمایا: ابن عم! میں اپنے باپ دادا کے دین اور ان کے طریقہ کو چھوڑ نہیں سکتا، البتہ جب تک میں زندہ ہوں ،خدا کی قسم تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور تمہارے ساتھ کوئی ناگوار واقعہ نہیں پیش آئے گا۔

روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ ابوطالب نے حضرت علیؓ سے پوچھا: یہ کون سا دین ہے جس پر تم عمل کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: اباجان! میں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان لے آیا ہوں، آپؐ پر جو دین نازل ہوا ہے، میں نے اس کی تصدیق کی ہے، آپؐ کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہوں اور آپؐ کی اتباع کر رہا ہوں۔ اس پر ابوطالب نے کہا کہ وہ تمہیں خیر ہی کی طرف لے جائیں گے، ان کا ساتھ نہ چھوڑو[1]

حضرت زید بن حارثہ کو آٹھ سال کی عمر میں زبردستی غلام بنا کر بازار عکاظ میں فروخت کر دیا گیا۔ حکیم بن حزام نے انہیں حضرت خدیجہ کے لیے خریدا اور حضرت خدیجہ نے رسول اللہ ﷺ سے نکاح کے بعد انہیں آپ کو ہبہ کر دیا۔ وہ آپ کے پاس ہی تھے کہ ان کے خاندان والوں کو اس کا علم ہوا تو ان کے والد اور چچا آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رہائی کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا: اگر وہ آپ لوگوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو تو بہ خوشی جا سکتا ہے، لیکن اگر وہ جانا نہ چاہے تو میں اسے زبردستی اپنے سے

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۸۴

جدا نہیں کروں گا۔ چناں چہ آپ نے حضرت زیدؓ کو بلایا اور پوچھا: کیا ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں! یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا ہیں۔ آپ نے فرمایا: تمہارے ساتھ میرا جو برتاؤ ہے، اس سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ اب تمہیں اختیار ہے، چاہو تو میرے ساتھ رہو یا ان لوگوں کے ساتھ چلے جاؤ۔ حضرت زید نے فوراً جواب دیا کہ میں آپ کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ آپ میرے لیے باپ اور چچا دونوں کے برابر ہیں۔ اس پر ان دونوں نے کہا کہ زید! افسوس ہے تم نے آزادی کے مقابلے میں غلامی کو پسند کیا۔ حضرت زید نے فرمایا: یہ صحیح ہے۔ میں نے اس شخص میں وہ خوبیاں دیکھی ہیں کہ کبھی کسی دوسرے کو ان پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد آپ نے قریش کے درمیان اعلان فرمادیا کہ آپ لوگ گواہ رہیں کہ زید میرا بیٹا ہے۔ وہ میرا وارث ہوگا اور میں اس کا وارث ہوں گا۔ چناں چہ اس کے بعد لوگ ان کو زید بن محمد ہی کہتے تھے[1]

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ (بالغ) مردوں میں حضرت زیدؓ سب سے پہلے اسلام لائے اور حضرت علیؓ کے بعد دوسرے شخص تھے جنہوں نے نماز شروع کی[2]

حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ نہ صرف یہ کہ آپ کے گھر کے افراد تھے، بلکہ آپ ان سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:

اَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنکَ[3] تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

انت اخی فی الدنیا والاٰخرة[4] تم میرے بھائی ہو دنیا اور آخرت میں۔

---

1. ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، تذکرۃ زید بن حارثہ۔ ابن الاثیر، اسدالغابۃ: ۲/ ۲۸۲۔ اس واقعہ کی تفصیلات میں کسی قدر اختلاف بھی ہے۔ ملاحظہ ہو امام نوویؒ کی تہذیب الاسماء واللغات: ۱/ ۲۰۲
2. ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۸۴
3. بخاری، کتاب الصلح، باب کیف یکتب ہذا ما صالح فلان بن فلان۔
4. ترمذی، ابواب المناقب، روایۃ عبداللہ بن عمر

حضرت زیدؓ سے آپ اسی طرح محبت فرماتے جس طرح باپ اپنی حقیقی اولاد سے محبت کرتا یا کرسکتا ہے۔ حضرت زید سے محبت کی وجہ سے ان کے صاحب زادے حضرت اسامہ بھی آپ کو بے حد محبوب تھے۔آپ نے اس کا اظہار ایک مرتبہ ان الفاظ میں فرمایا:

ان کان لمن احبّ الناس الیّ و ان هذا لمن احبّ الناس الیّ بعده [1]	بلاشبہ زید لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب تھے اور یہ (اسامہ)ان کے بعد سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہؓ کا وظیفہ حضرت اسامہؓ سے کم مقرر کیا تو انہوں نے شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ’اسامہ کا وظیفہ تم سے زیادہ اس لیے ہے کہ رسول اللہ تم سے زیادہ انہیں چاہتے تھے اور تمہارے باپ سے زیادہ ان کے باپ سے محبت کرتے تھے۔[2]

یہ روایات نبوت کے بعد کی ہیں۔لیکن ان سے بہر حال یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ آپ کو کتنے عزیز تھے اور ان سے آپ کو کس قدر قلبی تعلق تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے ایمان لانے سے آپ کی خانگی زندگی میں جو سکون و ہم آہنگی اور توافق حاصل تھا،ان دونوں کے ایمان لانے سے اس کو زبردست تقویت پہنچی۔ اس طرح آپ کے ساتھ آپ کے گھر کے قریب ترین افراد کو ایک مقصد اور نصب العین نے جوڑ دیا اور سب آپ کی اتباع میں ایک منزل کی طرف چل پڑے۔حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ اس وقت ابھرتے ہوئے نوجوان تھے۔ اس لیے اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اس کے غلبے و سربلندی کے سلسلے میں ان سے بڑی توقعات کی جا سکتی تھیں۔ چناں چہ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ نے جس معاملے میں ان سے جو توقع کی، پوری ہوئی اور ان دونوں کے ذریعے سے دین کی بڑی خدمات انجام پائیں۔

---

[1] بخاری،کتاب المناقب، باب مناقب زید بن حارثہ ۔مسلم،کتاب الفضائل، فضائل زید بن حارثہ

[2] ترمذی،ابواب المناقب ،باب مناقب زید بن حارثہ

حضرت ابوبکرؓ اسلام لے آئے

نزولِ وحی کے فوراً بعد ہی مذکورہ بالا شخصیتوں کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ بھی ایمان لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اللہ کا دین ان کے سامنے پیش کیا تو ایک لمحے کے لیے بھی انہیں آپ کے سچے اور اس دین کے دین حق ہونے میں شک نہیں ہوا اور بغیر کسی تردد کے اسے قبول کرلیا۔ رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

ما دعوت أحدًا الى الاسلام الّا كانت فيه عنده كبوة و نظر و تردد الّا ما كان من أبي بكر بن ابى قحافة مـا عكم عنه حين ذكرته له و ما تردد فيه[۱]	میں نے جس کسی کو بھی اسلام کی دعوت دی اسے پس وپیش اور تردد ہوا، سوائے ابوبکر بن قحافہ کے۔ میں نے جب ان سے اسلام کا ذکر کیا تو انہوں نے اسے قبول کرنے میں نہ تاخیر کی اور نہ کسی تردد کا اظہار کیا۔

اللہ کے دین کے معاملے حضرت ابوبکرؓ کا زندگی بھر یہی رویہ رہا۔انہوں نے اس کے ہر حکم کا والہانہ انداز میں اور آگے بڑھ کر استقبال کیا۔[۲]

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور دریافت کیا کہ قریش آپ کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہیں، کیا وہ صحیح ہے کہ آپ نے ہمارے معبودوں کو ترک کر دیا ہے، ہمیں بے وقوف بتا رہے ہیں اور ہمارے باپ دادا کی تکفیر کر رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا رسول اور نبی بنایا ہے، تاکہ اس کا پیغام پہنچاؤں، میں تمہیں حق کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ اس کی ذات برحق ہے۔ اے ابوبکر! میں تمہیں 'اللہ واحد لا شریک لہ' کی طرف دعوت دے رہا ہوں، یہ کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور اس کی اطاعت و فرماں برداری کی بنیاد پر تمہاری دوستی اور تعلقات ہوں۔ پھر آپ نے انہیں قرآن سنایا۔

---

۱ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۸۸

۲ اس مفہوم کی روایات کے لیے ملاحظہ ہو کنز العمال: ۱۲/ ۱۶۷

انہوں نے زبان سے اقرار کیا اور نہ انکار۔ خاموشی سے اسلام لے آئے۔ بت توڑ پھینکے، اللہ تعالیٰ کے مزعومہ شرکاء سے علاحدگی اختیار کر لی، اسلام کا حق ہونا تسلیم کرلیا اور مومنِ صادق کی حیثیت سے لوٹے[۱]

اس روایت سے رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور اس کا انداز تو سامنے آرہا ہے، لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو یہ دعوت اس وقت دی جب کہ کفر وشرک پر کھل کر تنقید شروع کر دی اور اس کی وجہ سے لوگوں کو شکایت ہونے لگی تھی۔ اس لیے کہ معتبر روایات کے مطابق حضرت ابوبکرؓ اوّلین اسلام لانے والوں میں شامل ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد ان بزرگوں نے کس ترتیب سے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی، اس سلسلہ کی روایات میں اختلاف ہے۔ ان سب کی روشنی میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی یہ رائے زیادہ صائب نظر آتی ہے کہ آزاد مردوں میں حضرت ابوبکرؓ، عورتوں میں حضرت خدیجہؓ، موالی میں حضرت زید بن حارثہؓ اور بچوں میں حضرت علیؓ سب سے پہلے ایمان لائے[۲]

حضرت ابوبکرؓ کی شخصیت اپنے ماحول میں بہت نمایاں تھی ۔ان کا شمار قریش کے سرداروں میں ہوتا تھا۔ اپنی قوم میں ہر دل عزیز تھے۔ سب کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ انسابِ قریش کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے، ان کی اچھی اور بری تاریخ سے پوری طرح واقف تھے۔ بااخلاق تھے۔ ہر ایک کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے[۳] قریش اپنے نازک سے نازک معاملات میں بھی ان پر بھروسہ کرتے تھے۔ مثلاً جب کسی کے قتل کی دیت کی ذمہ داری وہ قبول کر لیتے یا کوئی دوسرا قبول کرتا اور وہ اس میں شریک ہو جاتے تو قریش کو اس کے نفاذ میں تامل نہ ہوتا۔ لیکن اگر وہ کنارہ کش

---

[۱] ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۳۲-۴۳۳

[۲] حوالہ سابق: ۱/ ۴۳۷

[۳] حوالہ سابق: ۱/ ۲۸۶

رہتے تو کسی دوسرے کی ذمہ داری پر انہیں اعتماد نہ ہوتا[۱]

حضرت ابوبکرؓ کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے ان کے اسلام قبول کرنے کو اہلِ مکہ نے خاص اہمیت دی۔ چناں چہ حضرت طلحہؓ کہتے ہیں:

حضور اکرمؐ کی جب بعثت ہوئی تو میں بصرہ میں تھا۔ وہاں مجھ سے ایک راہب نے کہا کہ تمہارے یہاں ایک پیغمبر ظاہر ہونے والا ہے، بلکہ وہ ظاہر ہو چکا ہوگا۔ چناں چہ واپسی پر میں نے لوگوں سے پوچھا؛ کیا شہر میں کوئی نئ بات پیش آئی ہے؟ لوگوں نے کہا:

نعم، محمد بن عبد اللّٰه الّامين قد تنبأ و قد اتبعه ابو بكر بن ابی قحافه[۲]	ہاں، محمد بن عبداللہ امین (ﷺ) نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور ابو قحافہ کے بیٹے ابوبکرؓ نے ان کی پیروی شروع کر دی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کا اسلام لانا دعوت کی راہ میں رسول اللہ ﷺ کی بہت بڑی کام یابی تھی۔ یہ مکہ کی ایک محترم شخصیت کی رفاقت تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ حضرت ابوبکرؓ کے اسلام لانے سے اس قدر خوش تھے کہ مکہ میں آپ سے زیادہ کوئی دوسرا خوش نہیں تھا[۳]

حضرت ابوبکرؓ نے اسلام قبول کرتے ہی اپنے تعلقات کے دائرہ میں، جو بہت وسیع تھا، اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں:

فلما اسلم ابوبكر اظهر اسلامه و دعا الی اللّٰه و رسوله[۴]	ابوبکر جب اسلام لائے تو انہوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دی۔

اس ابتدائی دور میں، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی یہ

---

۱ ابن عبدالبر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، تذکرۃ عبداللہ بن ابی قحافہ (ابوبکر)

۲ ذہبی، تاریخ الاسلام (السیرۃ النبویۃ): ۱/۱۳۹-۱۴۰۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۲/۲۲۹۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/۴۳۸

۳ ابن الاثیر، اسد الغابۃ: ۳/۳۱۳۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/۴۳۹

۴ ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ: ۱/۲۸۶

تھی کہ دعوت وتبلیغ کا کام خاموشی کے ساتھ جاری کھا جائے اور اس کا اظہار واعلان نہ ہو۔ یہی طریقۂ کار حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنایا۔ چناں چہ محمد بن اسحٰق نے اس ددور میں حضرت ابوبکرؓ کا طریقۂ تبلیغ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

کان رجال قومه یأتونه و یألفونه لغیر واحـد من الأمر لعلمـه و تجارته و حسن مجالسته، فجعـل یدعو الی اللّٰہ و الی الاسلام من وثق به ممن یغشاه و یجلس الیه[۱]

آپ کے علم وتجارت اور آپ کی بہترین صحبت کی وجہ سے آپ کی قوم کے لوگ ایک سے زیادہ معاملات میں آپ کے پاس آتے تھے اور آپ سے انس اور یگانگت محسوس کرتے تھے۔ جو لوگ آپ کو گھیرے رہتے تھے اور آپ کے پاس اٹھتے بیٹھتے تھے ان میں سے جس کے بارے میں آپ کو اعتماد ہوتا اسے اسلام کی دعوت دیتے۔

آپ کی اس دعوت کے نتیجہ میں بہت جلد حضرت عثمان، حضرت زبیر بن العوام، حضرت طلحہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللّٰہ عنہم) جیسی شخصیتیں دائرۂ اسلام میں آگئیں۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ کے بعد ان ہی اصحاب نے اسلام قبول کیا۔ یہ السابقون الاولون ہیں[۲]

یہ وہ شخصیتیں ہیں جن کا شمار اپنی دینی خدمات اور قربانیوں کی وجہ سے ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کو دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی تھی۔[۳]

---

۱ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۲۹۹

۲ حوالہ سابق: ص ۲۸۷-۲۸۹۔ بعض سیرت نگاروں نے ان پانچ افراد کے ساتھ حضرت ابوعبیدہؓ کا بھی ذکر کیا ہے۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۱/۴۴۹۔ حضرت ابوبکرؓ کے ذریعہ سے اسلام لانے والوں میں بعض اور صحابہ کرام کے نام بھی آتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/۴۵۳-۴۵۴

۳ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی روایت ہے: ان النبیﷺ قال: ابوبکر فی الجنة و عمر فی الجنة و عثمان فی الجنة و علی فی الجنة و طلحة فی الجنة والزبیر فی الجنة و عبد الرحمن بن عوف فی الجنة و سعد بن أبی وقاص فی الجنة و سعید بن زید فی الجنة و ابو عبیده بن الجراح فی الجنة۔ رواہ الترمذی و رواہ ابن ماجہ عن سعید بن زید۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب المناقب، مناقب العشرۃ۔

حضرت ابوبکرؓ ایک شریف اور معزز انسان ہونے کے ساتھ بہت بڑے تاجر اور صاحب ثروت بھی تھے۔ انہوں نے جس طرح اپنے دل و دماغ اور جسم و جان کو دین کی راہ میں لگایا، اسی طرح اپنی دولت اور سرمایے کو بھی اس کے لیے وقف کر دیا اور یہ سب کچھ اس وقت کیا جب کہ سارا ماحول دین کی مخالفت پر کمر بستہ تھا یا اس سے بے رخی برت رہا تھا۔ اس کا اظہار رسول اکرمؐ نے ایک مرتبہ اس طرح فرمایا:

ان الله بعثني اليكم فقلتم كذبت و قال ابوبكر صدق و واساني بنفسهٖ و مالهٖ[۱]

اللہ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث فرمایا۔ لیکن تم لوگوں نے (اس وقت) کہا کہ جھوٹ بولتے ہو اور ابوبکر نے کہا: نہیں یہ سچ کہہ رہا ہے اور اپنے نفس اور مال کے ذریعہ سے میری ہم دردی اور خبر گیری کی۔

عروہ بن زبیر اور زید بن اسلم وغیرہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ جس وقت ایمان لائے، ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ انہوں نے اس دولت کو اللہ کی راہ میں صرف کردیا اور غلاموں کو، جو مشرکین کے جور وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے، آزاد کرایا اور غریب مسلمانوں کی کفالت کی۔ جب ہجرت کر کے مدینہ آئے تو صرف پانچ ہزار درہم آپ کے پاس رہ گئے تھے۔ انہوں نے یہاں بھی اسی طرح اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور دنیا سے اس حال میں گئے کہ ایک دینار اور درہم نہ چھوڑا۔[۲]

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

اِنّ من أمنّ الناس عليّ في صحبته و ماله ابوبكر[۳]

جس نے اپنی صحبت و رفاقت اور مال کے ذریعہ مجھ پر سب سے زیادہ احسان کیا وہ ابوبکر ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے:

---

۱ بخاری، کتاب المناقب، مناقب ابی بکرؓ

۲ ابن حجر: الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۲/ ۳۴۲-۳۴۳۔ فتح الباری: ۷/ ۱۳

۳ بخاری، کتاب المناقب، باب قول النبی: سدّوا الابواب الّا باب ابی بکر۔ مسلم، کتاب الفضائل، من فضائل ابی بکر الصدیق۔

ما لِاحد عندنا يد الا وقد كافيناه ماخلا ابا بكر فان له عندنا يداً يكافئه الله بها يوم القيامة و ما نفعني مال أحد قط ما نفعني مال أبي بكر[1]	جس کسی نے ہم پر احسان کیا ہم نے اس کا عوض دے دیا، سوائے ابوبکر کے۔ بے شک ان کا ہم پر اس قدر احسان ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی جزا دے گا۔ کسی بھی شخص کے مال نے مجھے اتنا نفع نہیں پہنچایا جتنا کہ ابوبکر کے مال نے پہنچایا۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سن کر حضرت ابوبکرؓ کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور فرمایا: اے اللہ کے رسول! میں اور میرا مال آپ ہی کے لیے تو ہے[2]

دارِ ارقم - مرکز دعوت و تربیت

اب ان لوگوں کے لیے جو اسلام قبول کر رہے تھے ایک ایسی جگہ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو ان کا مرکز ہو، جہاں وہ قرآن مجید کی تعلیم کے لیے جمع ہو سکیں جو اس وقت حسب حالات نازل ہو رہا تھا، جہاں وہ رسول اکرم ﷺ سے، جو سرچشمۂ ہدایت تھے، قدم قدم پر رہ نمائی حاصل کر سکیں، جہاں ان کی فکری، اخلاقی اور عملی تربیت ہو سکے، جہاں وہ مل بیٹھ کر اس دین کو پھیلانے کے لیے آپس میں مشورہ کر سکیں اور تدابیر سوچ سکیں اور جہاں وہ ایک دوسرے سے مل کر عزم و ہمت اور صبر و ثبات کا درس حاصل کر سکیں۔ اس کے لیے حضرت ارقم بن ابی ارقمؓ نے اپنا مکان پیش کر دیا، جو آبادی سے کسی قدر ہٹ کر صفا کی پہاڑی پر واقع ہونے کی وجہ سے اس مقصد کے لیے بہت موزوں تھا[3]

ارقم بن ابی ارقمؓ ان لوگوں میں ہیں جو حضرت ابوبکرؓ کی تبلیغ کے نتیجے میں مسلمان ہوئے تھے[4] اور اس وقت مسلمان ہوئے تھے جب اسلام لانے والوں کی تعداد

---

[1] ترمذی: ابواب المناقب، باب مناقب ابی بکر۔

[2] ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۳/۳۲۶

[3] دارِ ارقم کی تاریخ کے لیے دیکھیے حاکم، المستدرک علی الصّحیحین: ۳/ ۵۷۴-۵۷۶

[4] دیار بکری، تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس: ۱/ ۳۲۴

چھ اور بعض روایات کے مطابق دس سے زیادہ نہ تھی[1] اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اس مرکز کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ابن عبدالبر حضرت ارقمؓ کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

و فی دار الأرقم بن أبی الأرقم هٰذا كان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم مستخفیًا من قریش بمكة یدعو الناس فیها الی الاسلام فی اول الاسلام ..... و أسلم فیها جماعة كثیرة[2]

مکہ میں اسلام کی ابتدا میں نبیﷺ ان ہی ارقم بن ابی ارقم کے مکان میں قریش سے پوشیدہ رہتے تھے (ان کے سامنے کھل کر نہیں آئے تھے) اسی میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے.... اس مکان میں ایک بڑی جماعت نے اسلام قبول کیا۔

قاضی شیخ حسین دیار بکری (المتوفی ۱۵۸۲ء) نے اس مکان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

كان رسول اللّٰهؐ مستترًا فیها فی بدء الاسلام و كان بها اجتماع من أسلم من الصحابة و بها أسلم عمر و حمزة و غیرهما ومنها ظهر الاسلام[3]

اسلام کے آغاز میں رسول اللہﷺ اسی میں دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے تھے۔ وہ صحابہ جو اس وقت اسلام لا چکے تھے اس میں جمع ہوتے تھے۔ اسی مکان میں حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ نے اسلام قبول کیا تھا اور یہیں سے اسلام کھل کر سامنے آیا۔

تین سال تک دار ارقم خاموش تبلیغ کا مرکز بنا رہا۔ اس کے بعد کھل کر اور علانیہ تبلیغ شروع ہوگئی۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں:

و كان بین ما اخفٰی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم أمره و استتربه الی ان امره اللّٰه تعالی باِظهار دینه ثلاث سنین فیما بلغنی من مبعثه[4]

رسول اللہؐ نے اپنے (دعوت کے) معاملہ کو جو خفیہ رکھا اور اللہ نے اپنے دین کے اظہار و اعلان کا جو حکم دیا اس کی درمیانی مدت، مجھ تک جو روایات پہنچی ہیں ان کی رو سے بعد بعثت تین سال تھی۔

---

[1] ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، تذکرۂ ارقم بن ابی ارقم۔ زرقانی علی المواہب: ۱/ ۴۵۸

[2] ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، تذکرۂ ارقم بن ابی ارقم۔ حاکم، مستدرک ۳/ ۵۷۴ بہ روایت واقدی

[3] دیار بکری، تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس: ۱/ ۳۳۰-۳۳۱

[4] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۹۹

ابن عبد البر نے اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

أسرّ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم أمره ثلاث سنين أو نحوها ثم أمره اللّٰه باظهار دينه و الدعاء اليه فأظهره بعد ثلاث سنين من بعثته [1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنا کام تین سال تک یا اس سے کم و بیش پوشیدہ رکھا۔ پھر اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ اس کے دین کو سب کے سامنے ظاہر کر دیں اور اس کی طرف ان کو دعوت دیں۔ چناں چہ اپنی بعثت کے تین سال بعد آپ نے اس کا اظہار و اعلان کیا۔

اس طریقۂ کار کے اختیار کرنے کی وجہ انسان کی نفسیات اور ماحول کی رعایت تھی۔ وقت کا پورا نظام شرک پر قائم تھا۔ اسلام توحید کی دعوت دے رہا تھا۔ وحی و رسالت اور آخرت کا تصور ذہنوں سے محو ہو چکا تھا اور اسلام اسی بنیاد پر زندگی کی تعمیر کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ کام یابی وکام رانی کے جس تصور میں ایک ایک فرد مست و مگن تھا، اسلام اس کے برخلاف فوز و فلاح کے ایک نئے تصور کے ساتھ سامنے آیا تھا۔ وہ دنیا اور حیاتِ دنیا کے بارے میں ایک نئے نقطۂ نظر کا ترجمان تھا۔ ہر طرف اخلاقی قدریں پامال ہو رہی تھیں اور اسلام ان اقدار کو معاشرہ کی تعمیر اور اخروی فلاح کے لیے ضروری قرار دے رہا تھا۔ ان حالات میں، جب کہ اسلام کی دعوت وقت کے عقیدہ، ذوق و رجحان کے خلاف ایک نئی دعوت تھی، اس کے قبول کرنے میں بہت سی ذہنی، فکری اور سماجی رکاوٹیں تھیں، اس پر غور وفکر کرنے کے لیے وہی افراد آمادہ ہو سکتے تھے جو صحیح الفطرت ہوں، جو ماحول کی بندشوں سے آزاد ہونے کی ہمت و صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس عرصہ میں اسی طرح کے افراد کی تلاش تھی۔ ماحول کے ذہن و مزاج اور رجحان کا خیال کیے بغیر اسلام کی دعوت ہر ایک سامنے پیش کی جاتی تو اس بات کا اندیشہ تھا کہ پہلے ہی مرحلے میں چارسُو مخالفت کا طوفان امنڈ آتا اور سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کا ماحول ختم ہو جاتا۔

---

[1] ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت صہیب رومیؓ نے اس وقت اسلام قبول کیا جب کہ چند ہی لوگ اس کے دائرے میں آسکے تھے۔ وہ فطری طور پر نیک اور خدا ترس تھے۔حضرت عمرؓ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

لو لم یخف اللّٰہ لم یعصہ[1] اگر اللہ کا خوف نہ ہوتا تب بھی وہ معصیت نہ کرتے۔

مطلب یہ کہ ان کے مزاج اور طبیعت میں نیکی اور پرہیز گاری ہے۔اب تو اللہ کا خوف انہیں دامن گیر ہے۔ان کے قدم معصیت کی طرف اٹھ ہی نہیں سکتے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ ہر ایک کے اندر کسی نہ کسی کم زوری کی نشان دہی کی جاسکتی ہے سوائے ابوعبیدہ بن جراح کے[2]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ قریش کے تین اشخاص سب سے زیادہ خوب صورت، سب سے زیادہ بااخلاق اور سب سے زیادہ حیا دار تھے۔ یہ ابوبکر، عثمان اور ابوعبیدہ (رضی اللّٰہ عنہم) تھے[3]

رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی حضرت جعفرؓ قدیم الاسلام ہیں۔دارارقم کے مرکز دعوت بننے سے پہلے ہی اسلام لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے اخلاق کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ **اشبھت خلقی و خلقی**[4] (تم صورت، شکل اور اخلاق دونوں میں مجھ سے مشابہ ہو)۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت جعفرؓ مسکینوں سے محبت کرتے، ان کے پاس بیٹھتے، ان سے باتیں کرتے اور وہ ان سے باتیں کرتے۔رسول اللہ ﷺ انہیں

---

[1] ابن رجب، شذرات الذہب: ۱/ ۲۱۷

[2] اس روایت کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ہذا مرسل و رجالہ ثقات۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۳/ ۴۷۷

[3] ابن حجر، الاصابۃ: ۳/ ۴۷۷

[4] بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی

'ابوالمساکین' کہا کرتے تھے[1]

یہ وہ اصحاب ہیں جو اسلام کی علی الاعلان دعوت شروع ہونے سے پہلے ہی اس کے دائرے میں آتے چلے گئے۔ان کی نیکی اور اخلاق کی بلندی انہیں کھینچ کر اسلام کی طرف لے گئی اور اسے انہوں نے بخوشی گلے لگایا۔

جو اصحاب رسول اللہ ﷺ کے قریب تھے انہیں آپ کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیرت متاثر کر رہی تھی۔آپ نے وحی کے پہلے تجربہ سے خوف اور اندیشہ کی کیفیت محسوس کی اور اپنی اہلیہ حضرت خدیجہؓ سے اس کا اظہار کیا تو انہوں نے ان الفاظ میں اطمینان دلایا:

کلا و اللّٰہ ما یخزیک اللّٰہ ابداً، انک لتصل الرحم و تحمل الکلّ، و تکسب المعدوم، و تقری الضیف و تعین علٰی نوائب الحق. و فی روایۃ و تصدق الحدیث و فی روایۃ و تؤدی الاُمانہ[2]	ہرگز نہیں! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا (اس لیے کہ) یقیناً آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، قیمتی چیزیں حاصل کرتے (اور دوسروں پر خرچ کرتے) ہیں، مہمان نواز ہیں، حق کی مشکلات میں مدد کرتے ہیں۔ (ایک روایت میں ہے کہ) آپ راست گو ہیں اور (ایک دوسری روایت میں ہے کہ) امانت ادا کرنے والے ہیں۔

آپ پر سب سے پہلے حضرت خدیجہ، حضرت ابوبکر، حضرت علی اور حضرت زید (رضی اللہ عنہم) ایمان لائے۔ یہ آپ کا قریب ترین حلقہ تھا۔ ان کے سامنے آپ کی پوری زندگی کھلی کتاب کی مانند تھی۔ اس کا ایک ایک ورق وہ دیکھ رہے تھے۔ وہ یہ تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ جو شخص صداقت اور راستی کا پیکر ہو، جس کی زبان کبھی دروغ بیانی اور کذب و افترا سے آلودہ نہ ہوئی ہو، وہ اچانک اتنا بڑا جھوٹ بولے گا کہ اس کے پاس

---

[1] ترمذی، کتاب المناقب، مناقب جعفر بن ابی طالب

[2] بخاری، کتاب الوحی مع فتح الباری: ۱/ ۳۷

اللہ تعالیٰ کا فرشتہ اس کا کلام لے کر آیا ہے۔ ان کی عقل یہ باور نہیں کرتی تھی کہ جس نے آج تک کسی کو کسی معاملہ میں دھوکا نہ دیا ہو، وہ خدا کا نام لے کر خلقِ خدا کو دھوکا دے گا۔ جو شخص زندگی بھر انسانوں کا ہم درد، بہی خواہ اور غم گسار رہا ہو، ان پر اپنی دولت لٹا رہا ہو، وہ ان کے ساتھ عداوت اور بدخواہی کا ارادہ کرے گا اور انہیں نقصان پہنچائے گا۔ وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ آپ جیسے نیک و صالح انسان پر شیطانی خیالات اثر انداز ہوگئے ہوں گے، اس لیے کہ آپ کا تقویٰ اور طہارت اور آپ کی پاکیزہ تعلیم اس کی صاف تردید کر رہی تھی۔ وہ آپ کے بہکنے کا بھی تصور نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ زبانِ مبارک سے حکمت و دانائی کے چشمے پھوٹ رہے تھے اور عقل ان کی صحت و صداقت کا اعتراف کر رہی تھی۔ اس سیرت و کردار نے پہلے قریب ترین افراد کے دل کھول دیے، پھر اور افراد بھی اس کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔

حضرت ابوبکرؓ شروع ہی سے رسول اللہ ﷺ کے رفیق خاص تھے۔آپ کی سیرت، رسول اللہ کی سیرت سے ہم آہنگ تھی۔ اسلام کی تبلیغ و توسیع میں اس کا بڑا دخل رہا۔ آپ کی سیرت و کردار کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے۔ مکہ میں جب حالات ناقابل برداشت ہوتے چلے گئے تو آپ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ راستہ میں قارہ کے سردار ابن الدغنہؒ سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا:

فان مثلک یا ابابکر لَا یَخرج و لَا یُخرج انک تکسب المعدوم و تصل الرحم وتحمل الکل و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق[۱]	اے ابوبکر! تم جیسا شخص نہ مکہ سے نکلے گا اور نہ اسے نکالا جائے گا۔تم توقیمتی چیزیں حاصل کرتے ہو (اور دوسروں پر خرچ کرتے ہو) صلہ رحمی کرتے ہو،دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہو، مہمان نوازی کرتے ہو، جائز مشکلات میں مدد کرتے ہو۔

یہ ٹھیک وہی کردار ہے جو حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ ﷺ کا بیان کیا ہے۔

[۱] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبی و اصحابہ الی المدینۃ

ابن الدغنہ نے قریش کے درمیان کھڑے ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے اس کردار کا ذکر کیا اور اعلان کیا کہ میں نے اس شخص کو پناہ دی ہے، اس کے ساتھ زیادتی نہ ہونے پائے۔ علامہ حلبیؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے اسلام لانے اور رسول اللہ ﷺ کی حمایت کی وجہ سے سردارانِ قریش آپ کے دشمن تھے، لیکن وہ آپ کی ان خوبیوں کا انکار نہ کر سکے، بلکہ یہ ایک طرح کا ان کی طرف سے اعتراف تھا[1]

اس سیرت و کردار کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب اپنے حلقۂ اثر میں اسلام کی دعوت پیش کی تو جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے، حضرت عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبد الرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبید اللہ (رضی اللہ عنہم) فوراً ہی ایمان لے آئے[2]

اس کے پیچھے یہ یقین کارفرما تھا کہ حضرت ابوبکرؓ انہیں غلط راستہ نہیں دکھا سکتے۔ حضرت خدیجہ، حضرت ابو بکر، حضرت علی اور حضرت زید (رضی اللہ عنہم) کے بعد ایمان لانے والوں میں ان پانچ اشخاص کا شمار ہوتا ہے۔ یہ اشخاص بعد میں اسلامی تاریخ کے آفتاب و مہتاب بن کر چمکے اور ان کی وجہ سے اسلام کا پیغام آفاقِ عالم میں پہنچا۔

کم زوروں کے دل کی آواز

مکہ کے ابتدائی دور میں حضرت ابوبکرؓ جیسے نمایاں افراد یا سردارانِ قبائل کی اسلام کی طرف کم ہی توجہ ہوئی۔ ان کا کبر وغرور اسلام قبول کرنے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بنا رہا۔ البتہ نوجوانوں اور کم زور طبقہ کے افراد نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ امام زہریؒ اس دور کے بارے میں فرماتے ہیں:

دعَا رسول اللهﷺ الى الاسلام سرًّا و جهرًا فاستجاب لـه مـن

رسول اللہ ﷺ نے خفیہ اور علانیہ اسلام کی دعوت دی۔ اللہ کے دین کو نوجوان اور کم زور

---

[1] حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۱/ ۴۸۴-۴۸۵

[2] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۸۷-۲۸۸

شاء من أحداث الرجال و ضعفاء الناس حتیٰ کثر من اٰمن به[1]

لوگوں میں سے جس نے چاہا قبول کیا۔ یہاں تک کہ آپ پر ایمان لانے والے بڑھنے لگے۔

نوجوانوں کے اسلام قبول کرنے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان پر باطل افکار اور غلط روایات کی چھاپ زیادہ گہری نہیں تھی۔ انہیں اقتدار سے محروم ہونے کا بھی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی نئی بات کو سن سکتے تھے اور سمجھ میں آجائے تو دشواریوں اور مشکلات کو نظر انداز کر کے اسے قبول بھی کر سکتے تھے۔

جو غلام اور کم زور افراد اسلام قبول کر رہے تھے انہیں اسلام میں دنیا اور آخرت کی بھلائی نظر آرہی تھی۔ وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ اللہ واحد کی عبادت و بندگی کی راہ اختیار کرنے کے بعد انسان ہر بندِ غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ انہیں اسلام اپنا ہم درد اور خیر خواہ نظر آرہا تھا۔ اس میں وہ اندرونی کشش محسوس کر رہے تھے۔

مکہ کے سخت ترین حالات اور آزمائشوں کے طوفان میں اسلام آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ کفر و شرک سے تائب ہوکر اسلام کے دامن میں آنے والے آرہے تھے۔ ان کے لیے اسلام میں کشش کا ایک ہی پہلو نہ تھا۔ کوئی ایک زاویہ سے متاثر ہو رہا تھا اور کوئی دوسرے زاویہ سے۔ کسی کے لیے اسلام میں کشش کے دو ایک ہی نہیں بہت سے محرکات تھے۔ تاریخ کے طالب علم کو ان اسباب کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۲۰۰۰ء)

☆☆☆

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۱۹۹

دعوتِ عام
(اہلِ خاندان سے خطاب)

علی الاعلان انذار کا حکم

تین سال خاموشی سے دعوت و تبلیغ کا عمل جاری رہا، اس کے بعد حکم ہوا:

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ﴿۹۴﴾

جو آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کھول کھول کر بیان کر دو اور مشرکین سے رخ پھیر لو۔ (ان کی پروا نہ کرو۔)[1]

(الحجر: ۹۴)

آیت میں 'فَاصۡدَعۡ' کا لفظ آیا ہے، جس کا مادہ صدع ہے۔ اس کے معنی ہیں اپنی بات پورے زور اور دلائل کے ساتھ اس طرح پیش کرنا کہ حق و باطل میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے اور صداقت سپیدۂ صبح کی طرح نکھر کر سامنے آجائے۔[2] 'بِمَا تُؤۡمَرُ' کے معنی ہیں جو ہدایات آپ کو دی جارہی ہیں وہ پوری کی پوری اور بے کم و کاست پیش فرمائیں۔ امام رازیؒ اور قاضی بیضاویؒ نے اس مفہوم کو ان لفظاظ میں بیان کیا ہے: **بما تؤمر به من الشرائع** یعنی جن احکام و شرائع کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے ان کا اعلان کرو۔[3]

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۱۹۹۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۱/ ۹۹

[2] امام رازی فرماتے ہیں: **'فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ' ای فرّق بین الحق والباطل، وقال الزجاج فاصدع، اظهر بما تؤمر به، يقال صدع بالحجة اذا تكلّم بها جهارًا۔** رازی، التفسیر الکبیر، جلد ۱۰، جزء ۱۱، ص ۱۷۵۔ یہی تشریح قاضی بیضاوی نے بھی کی ہے۔ انوار التنزیل: ۱/ ۵۳۶

[3] حوالہ سابق

اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دعوت وتبلیغ کی جو ہدایت دی جارہی ہے اس پر علی الاعلان عمل کیجیے۔ یہ وقت کے غلط افکار و خیالات کے خلاف پوری قوت سے آواز اٹھانے کا حکم تھا۔ یہ اس بات کی تعلیم تھی کہ جو اوہام وخرافات چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں ان کی جگہ صحیح عقائد ونظریات پیش کیے جائیں، شرک و بت پرستی کی جگہ توحید اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کا درس دیا جائے، اللہ تعالیٰ سے بغاوت اور نافرمانی کی جگہ اس کی اطاعت وفرماں برداری کی دعوت دی جائے۔

'فَاصۡدَعۡ بِمَا تُوۡمَرُ' کے الفاظ میں عموم پایا جاتا ہے۔ اس میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ دین اب کسی محدود دائرہ میں نہیں رہے گا، اسے پوری قوم تک، بلکہ تمام انسانوں تک پہنچنا ہے۔ وہ کسی خطۂ زمین تک محدود و محصور ہوکر نہ رہے گا، بلکہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پوری دنیا اس کی مخاطب ہوگی اور اس کی دعوت سب کے لیے ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

انه أمر من اللّٰه تعالیٰ ذکره نبیه ﷺ بتبلیغ رسالته قومه و جمیع من أرسل الیه[1]	یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے پیغمبر ﷺ کو اس بات کا حکم ہے کہ اس کا پیغام اپنی قوم اور تمام انسانوں تک پہنچائیں، جن کی طرف، آپ کو بھیجا گیا ہے۔

علامہ قرطبیؒ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ أی بلّغ رسالة اللّٰه جمیع الخلق لتقوم الحجة علیهم، فقد أمرک اللّٰه بذٰلک[2]	کھول کر کہیے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کا پیغام تمام انسانوں تک پہنچائیے، تاکہ ان پر حجت قائم ہو جائے۔ اللہ نے اس کا آپ کو حکم دیا ہے۔

---

[1] ابن جریر طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، جزء ۱۴، ص ۴۶

[2] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۰/۴۱

دعوت و تبلیغ کے اس حکم کے ساتھ مشرکین سے اعراض کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کے اس کام میں مشرکین کی طرف سے رکاوٹیں سامنے آئیں گی، طنز و تعریض اور تضحیک ہوگی، مذاق اڑایا جائے گا، بدزبانی کی جائے گی، اذیتیں دی جائیں گی، تمہاری راہ میں کانٹے بچھائے جائیں گے اور تمہیں بڑے سے بڑا لالچ دے کر بھی اس سے باز رکھنے کی کوشش ہوگی۔ ان سب سے صرف نظر کر کے اپنا فرض ادا کرتے رہو۔ ان میں سے کوئی چیز تمہارے لیے سدِّ راہ نہ بننے پائے۔[1]

اس ہدایت کے بعد ارشاد ہے:

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۙ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾	ہم ان مذاق اڑانے والوں کے لیے کافی ہیں۔ جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی خدا بناتے ہیں۔ بہت جلد انہیں معلوم ہو جائے گا۔ (الحجر:۹۵-۹۶)

مطلب یہ کہ کسی کا ڈر اور خوف، کسی کی دھمکی اور سختی، کوئی بڑی سے بڑی پیش کش اور لالچ تمہاری سعی و جد جہد کو مضمحل نہ کرے، تم بے خطر اور کسی جھجک کے بغیر صاف صاف الفاظ میں اللہ کا پیغام سنا دو اور کسی اندیشے اور خطرے کی پروا نہ کرو، اس لیے کہ جس خدائے برتر نے تمہیں اس کام پر مامور کیا ہے وہ تمہاری حفاظت فرمائے گا۔ اگر تمہارے مخالف طاقت ور ہیں تو تمہارا خدا ان سے زیادہ قوت و طاقت کا مالک ہے۔ وہ ان کے شر سے تمہیں بچا سکتا ہے اور یقیناً بچائے گا۔ یہ لوگ بہت جلد اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

---

[1] بعض لوگ اعراض یا اس کے ہم معنی آیات کے ذیل میں کہتے ہیں کہ جہاد کا حکم آنے کے بعد یہ ہدایات منسوخ ہو گئیں۔ حالاں کہ اعراض اور جہاد دونوں کا موقع و محل ایک دوسرے سے الگ ہے، اس لیے نسخ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں: **قال بعضهم هٰذا منسوخ بآية القتال وهو ضعيف لِاَنَّ معنى هٰذا الْاعراض ترک المبالاة بهم فلا يكون منسوخا۔** تفسیر کبیر، جلد ۱۰، جز ۱۹، ص ۱۷۰ (بعض لوگوں نے اسے آیت قتال سے منسوخ کہا ہے۔ لیکن یہ ایک کم زور قول ہے۔ اس لیے کہ اس اعراض کے معنی ہیں ان کی پروا نہ کی جائے اور اپنا کام جاری رکھا جائے۔ یہ چیز منسوخ نہیں ہے۔)

ان آیات کے نزول کے بعد کھل کر دعوت و تبلیغ کا کام شروع ہوگیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

ما زال النبی صلی اللہ علیہ وسلم مستخفیًا حتی نزلت فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ، فخرج ھو و أصحابہ[1]

رسول اللہ ﷺ خفیہ طریقے سے دعوت دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ فاصدع بما تومر کا حکم نازل ہوا۔ اس کے بعد آپ اور آپ کے صحابہ باہر نکل آئے (علی الاعلان تبلیغ شروع کر دی)۔

اہلِ عرب خدائی تعلیمات سے بے خبر تھے

رسول اللہ ﷺ جس قوم میں مبعوث ہوئے اور جو آپ کے اولین مخاطب تھے، گو ان کا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے نسلی تعلق تھا، لیکن وہ اپنے ان بزرگوں کی تعلیمات اور ان کے لائے ہوئے دین کو فراموش کر چکی تھی، وہ ان کی صحیح تاریخ اور خدمات سے بھی بے خبر تھی۔ ان بزرگوں کے تقریباً ڈھائی ہزار سال بعد اس قوم تک آپ کو اللہ کا دین پہنچانے کا حکم دیا گیا۔ قرآن مجید نے بار بار کہا ہے کہ آپ کو ایک ایسی قوم کے درمیان دعوت و تبلیغ کے لیے کھڑا کیا گیا ہے جس کے پاس نہ تو کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ آپ کے آنے سے پہلے اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے کے لیے کوئی رسول آیا۔[2]

اہلِ خاندان کے درمیان انذار

رسول اللہ ﷺ کا خاندان اور قبیلہ، جس میں آپ پیدا ہوئے، آپ کی قوم ہی کا ایک حصہ تھا۔ اس کے عقائد اور اعمال اس سے الگ نہیں تھے۔ وہ بھی اسی فساد اور بگاڑ میں مبتلا تھا جس میں پوری قوم مبتلا تھی اور وہ بھی اسی غفلت کا شکار تھا جو پوری قوم پر طاری تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اور ہدایت کا بطور خاص آپ کو حکم دیا۔

۱۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۲/ ۶۱۵۔ تفسیر ابن جریر میں یہ قول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے صاحب زادے ابوعبیدہ کی طرف منسوب ہے۔ ج ۱۴، ص ۱۴۸

۲۔ ملاحظہ ہو مضمون 'آخری رسول-آخری راہ نما'

ارشاد ہے:

فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِيۡنَ ۝۲۱۳ وَ اَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ۝۲۱۴ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝۲۱۵ فَاِنۡ عَصَوۡكَ فَقُلۡ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۝۲۱۶

(الشعراء: ۲۱۳-۲۱۶)

اور (اے نبی) تم اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو ورنہ تم بھی عذاب پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ اور اپنے بازو ان ایمان لانے والوں کے لیے جھکا دو جو تمہاری اتباع کریں۔ اگر یہ لوگ تمہاری نافرمانی کریں تو کہہ دو کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے میں بری ہوں۔

ان آیات میں رسول اللہ ﷺ کو عقیدۂ توحید پر استقامت اور شرک سے اجتناب کی ہدایت کے ساتھ اپنے خاندان کو توحید کی طرف بلانے اور شرک کے انجامِ بد سے آگاہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں جو لوگ ایمان لے آئیں، فرمایا گیا کہ ان کے ساتھ بہت ہی نرمی، شفقت اور ملاطفت کا رویہ اختیار کریں اور جو لوگ اپنے کفر پر جمے ہوئے ہیں، خواہ آپ کے خاندان کے ہوں یا خاندان کے باہر کے، ان کے غلط عقائد اور غلط اعمال سے بالکل کنارہ کش رہیں۔ آپ کی کسی بات سے، کسی اقدام سے اور کسی عمل سے اس کا ہرگز اظہار نہ ہونے پائے کہ آپ ان کی غلط روش کا ساتھ دے رہے ہیں، ان سے آپ کو کوئی فکری اور عملی اختلاف نہیں ہے، وہ اور آپ ایک ہی زمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاندان اور قبیلے کے درمیان 'انذار' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی دعوت کا مقصد محدود تھا اور آپ خاندان اور قبیلے کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ آپ کی بعثت عام تھی اور خاندان سے خطاب اس کا ابتدائی اور ضروری اقدام تھا۔ علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

هٰذه النـــذارة الخاصـــة لا

یہ انذارِ خاص انذارِ عام کے منافی نہیں

تنافي العامة بل هي فرض من اجزائها[1] ہے، بلکہ یہ اس کے اجزا میں سے ایک فرض جز ہے۔

خاندانِ رسول اللہ ﷺ کی اہمیت کے بعض پہلو

رسول اللہ ﷺ کے خاندان کو خطاب کے اس حکم کے پیچھے بہت سے اسباب تھے:

۱- ہر شخص کا اپنے خاندان پر حق زیادہ ہوتا ہے، دوسروں کے مقابلے میں وہ اس کا زیادہ مستحق ہوتا ہے کہ اس تک اللہ کا دین پہنچایا جائے۔ اگر یہ کام دوسروں میں ہو اور اپنے خاندان ہی میں نہ ہو تو یہ ان کی بہت بڑی حق تلفی ہوگی۔

۲- اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ آپؐ خدا ترسی، شرک سے بے زاری اور نیکی اور تقویٰ کی جو تبلیغ دوسروں پر کر رہے ہیں، اپنے خاندان کو اس کا اولین مخاطب سمجھتے ہیں اور آپ کے نزدیک ساری دنیا کی نجات جس ایمان و عمل سے وابستہ ہے اسی سے آپ کے خاندان کی نجات بھی جڑی ہوئی ہے، اس سے کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ اگر یہ دین حق ہے تو پہلے اپنے خاندان والوں کو اس کی دعوت کیوں نہیں دیتے؟[2]

۳- آپؐ کا خاندان آپ کو پیکرِ اخلاق سمجھتا تھا۔آپ کی سیرت و کردار کی عظمت کا معترف تھا، آپ کی مدح و ثنا کرتا تھا، اس کے بہت سے افراد آپ کی تعلیمات

---

[1] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۲/۳۸۵

[2] امام رازیؒ ان آیات کے ذیل میں فرماتے ہیں: بدأ بالرسول فوعده ان دعا مع الله الهًا اخرثم أمره بدعوة الاُقرب فالاُقرب و ذلک لأنه اذا تشدّد على نفسه اولاً ثم الاُقرب فالاُقرب ثانيًا لم يكن لِاَحد فيه الطعن البتة و كان قوله أنفع و كلامه أنجع۔ التفسیر الکبیر، ج۱۲، جزء ۲۴، ص۱۴۸ (آغاز رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ آپ کو وعید سنائی اگر آپ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکاریں۔ پھر الاقرب فالاقرب کے اصول پر ایک ترتیب کے ساتھ دعوت کا حکم دیا۔ اس طرح اگر آپ (دین کے معاملہ میں) پہلے اپنے ساتھ سختی کریں پھر جو سب سے قریب ہو اس کے ساتھ یہ رویہ اختیار کریں اور یہ سلسلہ ایک ترتیب کے ساتھ جاری ہو تو کسی کو اعتراض کا موقع نہ ہوگا اور آپ کی بات زیادہ نافع اور زیادہ مؤثر ثابت ہوگی)۔

کو بھی بڑی حد تک صحیح سمجھتے تھے، لیکن اس کے باوجود اسے پوری طرح قبول کرنے اور اپنی زندگی میں اسے شامل کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کو بتانے کی ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ کے جس عذاب سے آپ ڈرا رہے ہیں وہ محض آپ کی تعریف وتوصیف سے ٹل نہیں جائے گا، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص ایمان وعمل کا سرمایہ ساتھ رکھے اور صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کا اطاعت گزار بن جائے۔

۴- اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے خاندان کی سیاسی وسماجی حیثیت بہت بلند تھی۔ اس کو صرف قریش ہی کے اندر نہیں، بلکہ سارے عرب میں برتری اور عزت کا مقام حاصل تھا، اس لیے دعوت دین کا یہ عین تقاضا تھا کہ اس کی طرف خصوصی توجہ دی جائے، تاکہ وہ دوسروں کی اصلاح کا ذریعہ بن سکیں۔

ان کے علاوہ اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں، جن کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کو خاندان سے خطاب کا خاص طور سے حکم دیا گیا۔ اس سے ضمناً خاندان کے درمیان دعوت وتبلیغ اور اس کی اصلاح وتربیت کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔

انذار کے لیے مروّجہ طریقے اختیار کیے گئے

قرآن مجید کے اس حکم پر رسول اللہ ﷺ نے جس طرح عمل فرمایا، حدیث کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ سے اس سلسلہ کی کئی ایک روایات نقل کی ہیں۔ یہاں ان سب کو پیش نظر رکھ کر کسی قدر اس کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

اہل مکہ کا دستور تھا کہ جب کسی شخص کو کوئی مشترکہ خطرہ محسوس ہوتا تو وہ کسی بلند مقام پر کھڑا ہو کر اس کا زور سے اعلان کرتا، تاکہ سب ہی لوگوں کو اس کی اطلاع ہو جائے۔ ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ طریقہ اختیار فرمایا۔ آپ صفا کی پہاڑی پر چڑھ گئے اور قریش کی ایک ایک شاخ کا نام لے کر آواز دی۔ اس پر

سب لوگ دوڑ پڑے۔ اگر کوئی شخص وہاں پہنچنے کے موقف میں نہیں تھا تو اس نے اپنی طرف سے کسی نمائندے کو بھیجا۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا: میں اس پہاڑ کے دونوں طرف دیکھ رہا ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑ کے اُس طرف وادی میں حملہ کے لیے ایک فوج تیار کھڑی ہے تو کیا آپ لوگ میری بات مان لیں گے؟ سب نے بیک زبان کہا: ہاں! ضرور مانیں گے، اس لیے کہ آپ کو ہم نے ہمیشہ راست باز پایا ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر آپ لوگ مجھے سچا مانتے ہیں اور میرے بارے میں کبھی آپ لوگوں کو جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوا ہے تو میں اس وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتا ہوں (جسے میں دیکھ رہا ہوں اور جو کسی بھی وقت نازل ہوسکتا ہے)۔ میری مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنی قوم کو دشمن سے باخبر کرے اور جسے یہ اندیشہ ہو کہ اس کے اطلاع دینے سے پہلے اس کا پورا خاندان اور قبیلہ تباہ نہ ہو جائے۔[1]

بخاری اور مسلم کی بعض اور روایتوں میں ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ نے قریش کو جمع کیا اور ان سے خطاب کیا۔ خطاب عام بھی تھا اور خاص بھی۔ آپ نے قریش کی ایک ایک شاخ کو مخاطب فرمایا: اے بنو کعب بن لوی! اپنے آپ کو آتشِ جہنم سے بچاؤ، اے بنو مرہ بن کعب! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، اے بنو عبد شمس! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، اے بنو عبد مناف! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، اے بنو ہاشم! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، اے بنو مطلب! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، اس لیے کہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ لوگوں کے کچھ کام نہیں آسکتا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! آپ بھی اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچایئے۔ اے رسولِ خدا کی پھوپھی صفیہ! آپ بھی خود کو جہنم کی آگ سے بچالیں۔ اے محمد کی بیٹی فاطمہ! تم بھی خود کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اگر میرے پاس کچھ مال ہے تو تم

---

[1] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الشعراء، باب و انذر عشیرتک الاقربین۔ مسلم، کتاب الایمان، باب قولہ و انذر عشیرتک الاقربین.

اس میں سے جو چاہو لے لو۔ لیکن قیامت کے دن میں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ البتہ جو قرابت داری ہے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔[1]

یہ سن کر ابولہب ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا اور کہا: تمہارا سارا دن برباد ہو، کیا تم نے اسی لیے ہم سب کو جمع کیا تھا۔ سورۂ لہب اسی کے جواب میں نازل ہوئی۔[2]

بعض تفسیر کی کتابوں میں یہاں تک ملتا ہے کہ اس نے اس وقت ایک پتھر پھینک مارا، جس کی وجہ سے قدم مبارک زخمی ہوگیا۔[3] طبرانی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خاندان بنو ہاشم کے مردوں اور عورتوں کو، نیز اپنی ازواج کو جمع کیا اور فرمایا:

اشتروا أنفسكم من النار و اسعوا في فكاك رقابكم	اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے نکالو اور اپنی جان بچانے کی کوشش کرو۔

پھر آپ نے حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کو بھی یہی نصیحت کی۔ بظاہر یہ مدینہ کا واقعہ ہے[4] اس لیے کہ یہ ازواج مدینہ ہی میں آپ کے حرم میں آئیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس آیت کے تقاضے آپ نے مدینہ میں بھی پورے کیے۔

---

[1] مسلم کے الفاظ ہیں: فانی لَا املک من اللّٰہ شیئًا غیر ان لکم رحما سأبلّھا ببلالھا۔ اس کے حوالہ سے علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں: فی ھذا الحدیث والاٰیة دلیل علی ان القرب فی الاُنسان لَا ینفع مع البعد فی الاُسباب و دلیل علی جواز صلة المؤمن الکافر و ارشادہ و نصیحتہ۔ الجامع لاحکام القرآن: ۱۳ / ۹۲ (اس آیت اور حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ حسب ونسب کے لحاظ سے کسی پیغمبر یا بزرگ سے قریب ہونا نفع نہ دے گا اگر وہ اسباب و عوامل ہی نہ ہوں جو نفع پہنچاتے ہیں۔ اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ مومن کے لیے کافر کے ساتھ صلہ رحمی جائز ہے۔ اسے راہِ ہدایت دکھانا اور نصیحت کرنا صحیح ہے)۔

[2] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الشعراء، باب وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ۔ مسلم کی روایات میں زیادہ تفصیل ہے۔ کتاب الایمان، باب قولہ وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ۔

[3] خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل، تفسیر سورۃ تبت یدا، ۷ / ۲۶۳، طبع مصر، ۱۳۴۹ھ

[4] ابن حجر، فتح الباری: ۹ / ۴۵۰

دعوت اسلام کے لیے خاندان سے تعاون کی درخواست

مسند احمد، بیہقی کی دلائل النبوۃ اور ابن ابی حاتم کی بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کے آنے کے بعد دین کی تبلیغ اور فریضہ انذار کی ادائی میں آپ نے اہلِ خاندان سے تعاون کی درخواست کی۔ حضرت علیؓ اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک مختصر سی دعوت کے انتظام کا حکم دیا۔ فرمایا: ایک بکری ذبح کرو، (گوشت کے ساتھ) ایک صاع گیہوں (ملا کر پکا دو) اور ایک بڑے پیالہ میں دودھ ہو اور خاندان عبد المطلب کو کھانے پر مدعو کرو۔ میں نے یہ دونوں خدمات انجام دیں۔ تقریباً چالیس افراد جمع ہو گئے۔ ان میں ابوطالب، حمزہ، عباس اور ابولہب بھی شامل تھے۔ گو کہ کھانا مختصر تھا، آپ نے تھوڑا سا اس میں سے لے کر برتن کے چاروں طرف پھیلا دیا۔ مہمانوں میں بعض ایسے بھی تھے کہ بکری کا بچہ پورا کا پورا کھا سکتے تھے۔ جب کھانے کا برتن سامنے آیا تو آپ نے اس کے اوپر کے حصہ کو ہاتھ لگایا اور فرمایا: کھانا شروع کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کھانے میں اتنی برکت عطا کی کہ سب نے سیر ہو کر کھایا، پھر بھی کھانا جوں کا توں باقی رہا۔ بات اسی پر چل پڑی کہ ابولہب نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ اس شخص نے ہم لوگوں پر جادو کر دیا ہے۔ لوگ اس میں الجھ گئے اور مجمع منتشر ہو گیا۔ آپ گفتگو نہیں فرما سکے۔ دوسرے دن آپ نے فرمایا کہ اس شخص نے تو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ دوبارہ اسی طرح کا انتظام کرو۔ میں نے اس کی تعمیل کی اور لوگ جمع ہو گئے، لیکن اس دن بھی اسی طرح کی صورت حال پیش آئی اور آپ گفتگو نہیں فرما سکے۔ آپ نے تیسری مرتبہ دعوت کی اور اپنی بات رکھی:

”اے اولاد عبد المطلب! خدا کی قسم! میں نہیں جانتا کہ عرب کے کسی جوان نے آپ لوگوں کے سامنے اس سے بہتر کوئی چیز کبھی پیش کی ہو جو میں اس وقت پیش کر رہا ہوں۔ میں آپ حضرات کے پاس دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں۔ میری بعثت اولاً آپ لوگوں کی طرف ہے، ثانیاً تمام انسانوں کی طرف۔ اللہ تعالیٰ نے اس

آیت میں مجھے جو حکم دیا ہے وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ (یہ حکم اس لیے ہے، تاکہ آپ لوگ اس کی عبادت اختیار کریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں، پھر آپ کے واسطے سے دوسروں کے درمیان یہی فرض انجام دیا جائے)۔ اب آپ لوگوں میں سے کون اس کے لیے تیار ہے کہ اس کام میں میرا بھائی، میرا دوست اور میرا معاون اور مددگار بنے؟ کون اس بات کی ضمانت لیتا ہے کہ میرا قرض ادا کرے، میں نے جو وعدے کیے ہیں انہیں پورا کردے اور میرے بعد میرے اہل و عیال کا خیال رکھے اور جنت میں میرے ساتھ رہے۔"

حافظ ابن کثیرؒ اس کے ذیل میں فرماتے ہیں:

كأنه خشي اذا قام بابلاغ الرّسالة الى مشركي العرب ان يقتلوه فاستوثق من يقوم بعده بما يصلح أهله و يقضي عنه[1]

گویا کہ آپ کو اس کا خوف لاحق ہوا کہ جب آپ پیغام رسالت لے کر مشرکین کے پاس پہنچیں گے تو وہ آپ کو قتل کر دیں گے، اس لیے آپ نے یہ اطمینان چاہا کہ کوئی شخص آپ کے بعد آپ کے گھر والوں کا خیال رکھے اور آپ کا قرض ادا کر دے۔

مطلب یہ کہ اس سوال کے پیچھے آپ کا یہ احساس صاف جھلک رہا تھا کہ جس عظیم کام پر آپ کو مامور کیا گیا ہے اس میں آپ کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے اور آپ اس خطرہ سے بے نیاز ہو کر اس کام کو انجام دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں، اس لیے چاہ رہے ہیں کہ اگر کسی وقت اس راہ میں آپ کی جان چلی جائے تو آپ کے ذمے جو دوسروں کے حقوق ہیں وہ ضائع نہ ہونے پائیں اور کوئی شخص اس کے لیے تیار ہوجائے کہ آپ کے بعد آپ کی طرف سے انہیں ادا کر دے گا۔ یہ قرض، جس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، ہوسکتا ہے، غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی مدد کے لیے لیا گیا ہو۔ اس کے باوجود جب ان کی ضرورتیں نہ پوری ہوئی ہوں تو آپ نے ان سے وعدے بھی فرمائے ہوں کہ جب کوئی سبیل نکلے گی تو ان کی مدد کی جائے گی۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر سب خاموش ہوگئے۔ کسی کو یہ ہمت نہیں

---

[1] ابن کثیر، البدایة و النهایة، جلد ۲، جزء ۳، ص: ۳۳

ہوئی کہ اس بھاری بوجھ کے اٹھانے کا وعدہ کرے۔ مجھے کچھ بولنے کی اس لیے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ایک تو میں کم عمر تھا، دوسرے حضرت عباسؓ بھی مجلس میں موجود تھے[1]۔ جب سب پر سکوت طاری رہا تو میں نے اٹھ کر عرض کیا: حضور! میں گو بہت کم سن ہوں، بہت کم زور ہوں، اس وقت میری آنکھوں میں تکلیف بھی ہے، لیکن میں آپ کا ساتھ دینے اور آپ کا بوجھ اٹھانے تیار ہوں۔ اس پر آپ نے فرمایا: تم بیٹھ جاؤ۔ (آپ کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت میں خاندان کے اکابر سے خطاب کر رہا ہوں)۔ چناں چہ میں بیٹھ گیا۔ آپ نے دوبارہ اپنی بات دہرائی۔ اس وقت بھی سب خاموش رہے۔ مجھ سے یہ سکوت نہیں دیکھا گیا۔ میں نے دوبارہ اٹھ کر اپنے آپ کو پیش کیا۔ آپ نے اس مرتبہ بھی مجھے بٹھا دیا۔ آپ نے تیسری مرتبہ اپنی بات پیش فرمائی۔ اس مرتبہ بھی کسی نے جواب نہیں دیا تو میں پھر کھڑا ہوگیا اور وہی بات کہی جو پہلے کہہ چکا تھا۔ اس پر آپ نے اپنا دست مبارک میرے ہاتھ پر مارا۔ اس طرح میں نے اس وقت آپ سے اس بات کی بیعت کی کہ وقتِ ضرورت آپ کا سارا بوجھ اٹھاؤں گا[2]۔

روایات میں ان ہی چند اجتماعات کا ذکر ملتا ہے جو آپ نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل میں کیے کہ آپ اپنے اہلِ خاندان کو اس کے عذاب سے ڈرائیں۔ قیاس یہ ہے کہ اس طرح کے اور بھی اجتماعات ہوئے ہوں گے اور بار بار آپ نے اپنے خاندان والوں

---

[1] اوپر گزر چکا ہے کہ اس مجلس میں حضرت عباسؓ کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے اور چچا بھی تھے، لیکن حضرت علیؓ نے حضرت عباسؓ کا ذکر خاص طور سے شاید اس وجہ سے کیا ہو کہ وہ دولت مند تھے، دوسروں کے مقابلے میں ان سے اس کی زیادہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ آپ کا بوجھ اٹھانے کے لیے آگے بڑھتے، لیکن وہ بھی خاموش رہے۔ ایک روایت میں ہے: 'وسکت العباس خشیة ان یحیط ذٰلک بماله' (حضرت عباسؓ اس اندیشہ سے خاموش رہے کہ ان کا پورا مال اس کی نذر ہو جائے گا)۔

[2] ابن کثیر، البدایة والنهایة، جلد ۲، جزء ۳، ص ۳۲۔ ۳۳۔ ابن کثیرؒ نے زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ روایات مختلف سندوں سے اپنی تفسیر میں نقل کی ہیں۔ ان روایات میں بعض کم زور اور بعض قوی ہیں۔ یہاں ان کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ تفسیر القرآن العظیم: ۳/۳۸۶-۳۸۷۔

کو اللہ کا نازل کردہ دین قبول کرنے اور اس کے عذاب سے بچنے کی نصیحت کی ہوگی۔

خاندان میں دعوتی کوششوں کے نتائج

خاندان کے درمیان دعوت و تبلیغ اور انذار و تبشیر کے سلسلے کے اجتماعات کا یہ ذکر تھا۔ جہاں تک اس سلسلہ کی انفرادی سعی و جہد کا تعلق ہے، پہلے دن سے آپ سعی فرماتے رہے اور ان اجتماعات کے شروع ہونے کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی کے نتیجہ میں آغاز دعوت ہی میں آپ کے گھر کے تمام افراد ایمان لے آئے۔

رسول اللہ ﷺ کے چچا ابوطالب بزرگِ خاندان تھے۔ آپ کی پوری دعوت ان کے سامنے تھی۔ آپ کی خاطر وہ تکلیفیں بھی برداشت کر رہے تھے، لیکن اس پر آپ ان کی طرف سے مطمئن نہیں ہوئے۔ نبوت کے بعد سے ان کے آخری دم تک، جب کبھی موقع ملا، ان پر اللہ تعالیٰ کے دین کی اہمیت اور عظمت واضح کی اور انہیں اس کے قبول کرنے کی دعوت دی۔ جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ نبوت کے آغاز ہی میں رسول اللہ ﷺ حضرت علیؓ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوطالب نے دیکھ لیا۔ اس طریقۂ عبادت کے بارے میں دریافت کرنے پر آپ نے مؤثر انداز میں دین کا تعارف کرایا، جس کے جواب میں ابوطالب نے اللہ کے دین کو قبول تو نہیں کیا، لیکن آپ سے تعاون کا وعدہ کیا۔

اسی طرح مشرکین کی مخالفت کی وجہ سے ابوطالب نے جب کبھی حالات کے نشیب و فراز سمجھانے کی کوشش کی تو آپ نے دین کی حقیقت ان پر واضح کی اور بتایا کہ زندگی کا یہ اعلیٰ ترین نصب العین ہے۔ اس کے لیے سر کٹایا اور سب کچھ لٹایا جا سکتا ہے، لیکن اس سے کسی قیمت پر دست برداری نہیں اختیار کی جا سکتی۔

رسول اللہ ﷺ نے ابوطالب کو اس وقت بھی سمجھایا جب کہ وہ موت و حیات کی کش مکش میں تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا: چچا جان! صرف ایک بار لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجیے، میں اس بنیاد پر اللہ تعالیٰ سے آپ کی نجات کی سفارش کروں گا۔ اس وقت

ابوطالب کے پاس ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ موجود تھے۔ انہوں نے کہا: ابوطالب! کیا آپ اس آخری وقت میں اپنے باپ عبدالمطلب کے دین سے روگردانی کریں گے! آپ بار بار ان سے یہی درخواست کر رہے تھے اور ساتھ ہی یہ دونوں عصبیتِ جاہلیہ ابھار رہے تھے۔ آخر میں ابوطالب نے لا الٰہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا اور کہا: میں اپنے باپ عبدالمطلب کے دین پر مر رہا ہوں[۱]

رسول اللہ ﷺ کی کوشش کے باوجود ابوطالب کو ایمان کی دولت نہیں ملی، لیکن خاندان کی بعض دوسری اہم شخصیتیں اس سے بہرور ہوئیں۔ ان میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ بھی ہیں، جو آپؐ کے چچا زاد اور حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی تھے۔ عمر میں ان سے دس سال بڑے تھے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے بالکل ابتدائی دور میں اسلام قبول کیا[۲]

حضرت علیؓ کے اسلام لانے کے کچھ ہی دن بعد یہ اسلام لے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ سے پہلے اکتیس [۳۱] افراد اسلام لا چکے تھے۔ بتیسویں فرد آپ تھے[۳]

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دارِ ارقم ابھی مرکز دعوت نہیں بنا تھا[۴] اسی زمانہ میں حضرت جعفر کی بیوی اسماء بنت عمیسؓ بھی اسلام لے آئیں اور ہجرت حبشہ اور وہاں سے ہجرت مدینہ میں حضرت جعفرؓ کے ساتھ رہیں[۵]

حضرت حمزہؓ، جو آپ کے حقیقی چچا اور رضاعی بھائی تھے اور عمر میں دو سال

---

۱ امام بخاری نے اپنی صحیح میں متعدد مقامات پر یہ روایت نقل کی ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو کتاب التفسیر، سورۃ القصص، باب قولہ انک لا تھدی من احببت۔

۲ ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۱/ ۲۹۴

۳ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۱/ ۵۴۶

۴ اسلم قدیماً بمکۃ قبل دخول رسول اللہ دارالارقم۔ تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس: ۲/ ۸۲

۵ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۷/ ۱۳۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۴/ ۲۳۱

بڑے تھے، بعض روایات کے مطابق جلد ہی ایمان لے آئے۔ علاّمہ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ انھوں نے بعثت کے دوسرے سال اسلام قبول کیا۔ فرماتے ہیں کہ ایک خیال یہ بھی ہے کہ آپ بعثت کے چھٹے سال دائرہ ایمان میں آئے، جب کہ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کے ساتھ دارارقم میں جمع ہونے لگے تھے[1]

رسول اللہ ﷺ کے دوسرے چچا حضرت عباسؓ نے گو بہت تاخیر سے جنگ بدر کے بعد جنگ خیبر سے پہلے اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ ہی میں اسلام لاچکے تھے، البتہ اپنی مجبوریوں یا رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر اپنے قبولِ اسلام کو مخفی رکھا[2]

صحابۂ کرامؓ نے اسوۂ رسول پر عمل کیا

رسول اللہ ﷺ نے جس طرح اپنے خاندان میں دعوت وتبلیغ کا فرض انجام دیا اسی طرح وہ صحابہ کرام بھی اس کی انجام دہی میں لگ گئے جو اپنے سن و سال اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے یہ فرض ادا کر سکتے تھے۔ اس کے اثرات بھی بہت جلد ظاہر ہونے لگے۔ یہاں اس کی بعض مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کی اہلیہ اور حضرت عائشہؓ کی والدہ ام رومانؓ قدیم الاسلام ہیں۔

---

۱ ابن عبدالبر :الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۱/ ۴۲۳۔ علامہ ابن اثیر اور حافظ ابن حجر نے صرف پہلے قول کا ذکر کیا ہے ۔اسد الغابۃ :۲/۶۷۔ابن حجر ،الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ:۲/ ۱۰۵۔دوسرے قول کو جن علماء نے اختیار کیا ہے یا ترجیح دی ہے اس کے تذکرے کے لیے ملاحظہ ہو حاکم، المستدرک علی الصحیحین:۳/ ۲۱۳۔ زرقانی علی المواھب اللدنیۃ: ۱/ ۴۷۷۔ حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ حاکم، المستدرک: ۳/ ۲۱۲ - ۲۱۳۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی:۱/ ۳۲۸-۳۲۹

۲ ابن عبدالبر :الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۲/ ۳۵۹۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۳ / ۱۶۴۔ ابن حجر، الاُصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۳/۵۱۱۔ اس سلسلہ کی مختلف روایات کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ حاکم، المستدرک علی الصحیحین: ۳/ ۳۶۳-۳۵۹

انہوں نے دین کے لیے بڑی سختیاں برداشت کیں۔ مدینہ ہجرت کر کے آئیں۔ سن ۶ ھ میں انتقال ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے قبر میں اتارا اور فرمایا:

اللّٰھم لم یخف علیک ما لقیت ام رومان فیک و فی رسولک[۱]	اے اللہ! تیرے لیے اور تیرے رسول کے لیے ام رومان نے جو تکلیف اٹھائی ہے وہ تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔

ایک اور روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

من سرّہ ان ینظر الی امرأۃ من الحور العین فلینظر الی ام رومان[۲]	جنت کی حوروں میں سے کسی حور کو دیکھنے میں جس کسی کو خوشی محسوس ہوتی ہو وہ ام رومان کو دیکھ لے۔

حضرت ابوبکر کی بیٹی، حضرت اسماءؓ، نبوت سے غالباً چودہ سال پہلے پیدا ہوئیں۔ حضرت زبیرؓ سے ان کی شادی ہوئی۔ مشہور صحابی عبداللہ بن زبیرؓ ان ہی کے صاحب زادے ہیں۔ بہت قدیم الاسلام ہیں۔ ان سے پہلے صرف سترہ افراد اسلام لائے تھے۔[۳]

حضرت ابوبکرؓ کی والدہ ام الخیرؓ بھی قدیم الاسلام ہیں۔ بعثت کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ حضور! ان کے حق میں دعا فرمائیے اور ان کو اسلام کی طرف بلائیے۔ امید ہے کہ اس طرح وہ جہنم سے بچ جائیں گی۔ آپ نے دعا فرمائی اور اسلام کی دعوت دی۔ اس کے نتیجہ میں وہ اسلام لے آئیں۔[۴]

ان واقعات کا تعلق چوں کہ حضرت ابوبکرؓ کے خاندان سے ہے۔ اس لیے ان کے اسلام لانے میں بظاہر حضرت ابوبکرؓ کی دعوتی کوششوں کا دخل ضرور رہا ہوگا۔

حضرت عمار بن یاسرؓ کے تذکرے میں آتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد انہوں

۱۔ ابن عبدالبر: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۴۹۰۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۷/ ۳۲۰-۳۲۱

۲۔ حوالہ سابق

۳۔ الاستیعاب: ۴/ ۳۴۵-۳۴۶۔ اسد الغابۃ: ۷/ ۸۔ نووی، تہذیب الاسماء واللغات: ۲/ ۳۲۸-۳۲۹

۴۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۷/ ۳۱۵۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/ ۳۸۶

نے رسول اللہ ﷺ سے جو قرآن یاد کیا تھا وہ اپنے ماں باپ کو سنایا۔ وہ اس سے متاثر ہوئے اور اسلام لائے[۱]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ (قدیم الاسلام اصحاب میں) حضرت ابوبکر، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہم) کی ماؤں کو اسلام کی دولت نصیب ہوئی[۲]

قیاس یہی ہے کہ ان بزرگوں کی دعوت وتبلیغ کے نتیجہ ہی میں وہ مسلمان ہوئی ہوں گی۔

بعثت کے بعد اسلام کی طرف سبقت کرنے والوں میں حضرت عثمان بن مظعونؓ بھی ہیں۔ آپ سے پہلے صرف تیرہ افراد نے اسلام قبول کیا تھا۔ آپ کے دو بھائی قدامہ بن مظعونؓ اور عبداللہ بن مظعونؓ بھی قدیم الاسلام ہیں۔ آپ کے صاحب زادے حضرت سائبؓ بھی جلد ہی اسلام لے آئے اور ان سب نے حبشہ کی ہجرت کی[۳] بہت ممکن ہے اس میں حضرت عثمان بن مظعونؓ کی کوششوں کا دخل رہا ہو۔

یہ چند مثالیں ہیں۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ان سے دعوت وتبلیغ کی راہ میں صحابہ کرامؓ نے خاندان کو جو اہمیت دی، اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاندان سماج کا بنیادی ادارہ ہے۔ اس سے پورے سماج کی صورت گری ہوتی ہے۔ آدمی اگر اس محاذ پر کام یابی حاصل کرلے تو دوسرے محاذوں پر آسانی سے قدم بڑھا سکتا ہے۔ یہ محاذ غفلت کی نذر ہو جائے یا وہ مخالفت کی راہ اختیار کرلے تو قدم قدم پر اسے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان پر قابو پانا آسان نہ ہوگا۔

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۸ء)

---

۱ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۷/ ۳۱۴-۳۱۵۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/ ۳۸۶

۲ دیار بکری، تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس: ۱/

۳ ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۱/ ۲۹۰-۲۹۱، ۲۹۴، ۳۶۴۔ اسد الغابۃ: ۳/ ۱۶۵، ۴/ ۳۷۵، ۲/ ۳۹۷

وہ اس طرح آزمائے گئے

آزمائشیں اور امتحانات

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مکہ میں جن زہرہ گداز حالات سے گزرنا پڑا اور ان پر اذیتوں کے جو پہاڑ توڑے گئے اور جس طرح کا جور وستم ان کے ساتھ روا رکھا گیا اسے تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے۔یہاں اس کے بعض اوراق پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے میں کتنا وقت اور کتنی قوت صرف ہوئی کہ اسلام دینِ حق ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے،یہ بارانِ رحمت ہے جس سے ساری دنیا سیراب ہوسکتی ہے۔ یہ اپنے دامن میں ہر فرد اور ہر قوم کی فلاح و کام رانی کا سامان رکھتا ہے۔اس سے عداوت حقیقت میں اپنی ذات سے عداوت ،اپنے خاندان ،قبیلے اور اپنی قوم سے، بلکہ نوع انسانی سے عداوت ہے ۔جو ان سب کا دشمن ہے وہی اسلام سے خصومت کی راہ اختیار کرسکتا ہے۔

آزمائشیں خیر الوریٰ کی راہ میں

پہلے ان زیادتیوں اور جفا کاریوں کا حال دیکھیے جو دنیا کے سب سے اعلیٰ اور سب سے اشرف انسان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ روا رکھی گئیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ خانۂ کعبہ کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے۔ وہاں قریش کے کچھ لوگ موجود تھے۔قریب ہی میں دو ایک

روز قبل اونٹ ذبح ہوئے تھے۔ ابوجہل نے کہا: کیا کوئی شخص اس میں سے ایک اوجھڑی لاکر محمد (رسول اللہ ﷺ) کی پشت پر ڈال سکتا ہے؟ یہ سن کر بدنصیب عقبہ بن ابی معیط اٹھا اور اوجھڑی لے آیا۔ جب آپ سجدے میں گئے تو شانہ ہائے مبارک کے درمیان ڈال دی۔ اس پر سب لوگ ہنسنے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ آپ نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں اس موقف میں نہیں تھا کہ آگے بڑھ کر اس گندگی کو ہٹاتا، ورنہ ضرور ہٹا دیتا۔ اسی اثنا میں حضرت فاطمہؓ کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ وہ اس وقت کم سن تھیں۔ دوڑی ہوئی آئیں اور گندگی کو دور کیا۔ جن افراد نے یہ حرکت کی انہیں بد دعا دینے لگیں۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے دعا کی: ''اے اللہ! ان سردارانِ قریش ــــ ابوجہل بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، عقبہ بن ابی معیط ــــ کو تو اپنی گرفت میں لے لے اور ان پر عذاب نازل فرما۔ میں نے اس سے پہلے آپ کو کسی کے حق میں بد دعا کرتے نہیں سنا تھا۔ جب سردارانِ قریش نے آپ کے الفاظ سنے تو یکلخت گھبرا اٹھے کہ آپ کی دعا ضرور قبول ہوگی اور ان پر اللہ کا عذاب آئے گا۔ چناں چہ میں نے دیکھا کہ بدر میں یہ سب کے سب مارے گئے اور ایک گڑھے میں پھینک دیے گئے۔[۱]

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو مشرکین کی جانب سے جو سخت ترین تکلیف پہنچی وہ کیا تھی؟ انہوں نے (اپنے علم کی حد تک) جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ خانۂ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط آگے بڑھا اور گردنِ مبارک میں چادر کو بل دے کر اس زور سے کھینچا کہ آپ کا دم گھٹنے لگا۔ حضرت ابوبکرؓ دوڑے ہوئے پہنچے۔ عقبہ کا شانہ پکڑ کر اسے دور ہٹایا اور کہا کہ کیا تم ایک ایسے شخص کو مار ڈالنا چاہتے ہو جس کا جرم اس

۱۔ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مالقی النبی و اصحابہ من المشرکین بمکۃ۔ مسلم، کتاب الجہاد و السیر، باب مالقی النبیؐ من اذی المشرکین و المنافقین۔

کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ اللہ ہی میرا رب ہے[۱]

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ آپ کو جو سخت ترین اذیت پہنچی وہ یہ تھی کہ ایک روز آپ گھر سے نکلے۔ راستے میں جس کسی سے ملاقات ہوئی، خواہ وہ آزاد ہو یا غلام ہر ایک نے آپ کی تکذیب کی اور آپ کو ایذا پہنچائی۔ آپ جب گھر لوٹے تو شدتِ غم سے چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی موقع پر آیات یَآیُّھَا الْمُدَّثِّرُ... نازل ہوئیں[۲]

ایک مرتبہ قریش کے سفہاء میں سے ایک سفیہ نے سرِ مبارک پر خاک ڈال دی۔ آپ گھر پہنچے تو مٹی موجود تھی۔ آپ کی صاحب زادی نے مٹی صاف کی اور رونے لگیں۔ آپ نے فرمایا: بیٹی! رومت، اللہ تعالیٰ تمہارے باپ کی حفاظت کرے گا[۳] ان ظالموں کی وجہ سے آپ گھر کے اندر نماز پڑھنے لگے، لیکن وہاں بھی سکون سے نہیں رہنے دیتے تھے، حتّٰی کہ کبھی کبھی کھانے کی ہانڈی میں گندگی ڈال دی جاتی۔ جب اس طرح کی حرکت ہوتی تو آپ لکڑی سے اسے اٹھا کر باہر لے جاتے اور دروازے پر کھڑے ہو کر فرماتے: اے عبد مناف! یہ کس قسم کی ہمسایگی ہے۔ پھر اسے دور پھینک آتے[۴]

حضرت عائشہؓ نے آپ سے دریافت کیا کہ احد کے دن سے بھی زیادہ سخت اور کوئی دن آپ پر گزرا ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہاری قوم سے جو تکلیف مجھے پہنچی وہ پہنچی، لیکن سب سے زیادہ سخت وہ دن تھا جب کہ میں نے طائف کے سرداروں کے سامنے اللہ کا دین پیش کیا اور ان سے تعاون کی درخواست کی، لیکن انہوں نے بری طرح رد کر دیا اور مجھے اپنے یہاں سے نکال دیا۔ میں شدتِ غم سے نڈھال چلا جا رہا تھا۔ مجھے

---

۱ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مالقی النبی و اصحابہ الی آخرہ۔ مسند احمد: ۲/۲۱۶۔ اس واقعہ کی تفصیل ابن ہشام نے کچھ دوسرے انداز میں پیش کی ہے۔ السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۲۶

۲ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۲۸

۳ طبری، تاریخ الامم والملوک: ۱/۵۵۳-۵۵۴۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/۱۴۶

۴ طبری، تاریخ الامم والملوک: ۱/۵۵۳۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/۱۴۸

ہوش اس وقت آیا جب میں قرن ثعلب میں تھا۔[۱]

واپسی میں غنڈوں کو پیچھے لگا دیا گیا۔ انہوں نے آپ پر پتھر پھینکنے شروع کر دیے۔ حضرت زید بن حارثہؓ بچانے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن قدم مبارک خون آلود ہو گئے اور سر پر بھی چوٹ آئی۔[۲]

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لقد أخفت فی اللّٰہ و ما یخاف أحد ولقد أوذیت فی اللّٰہ و ما یوذیٰ أحد و لقد أتت علیّ ثلاثون من یوم و لیلة و ما لی و لبلال طعام یأکله ذو کبد الاّ شیءٌ یواریه إبط بلال[۳]

مجھے اللہ کی راہ میں جتنا ہراساں کیا گیا اتنا کسی کو نہیں کیا گیا، مجھے اللہ کی راہ میں جتنی اذیتیں پہنچیں اتنی کسی کو نہیں پہنچیں۔ مجھ پر تیس ایسے روز و شب گزرے ہیں کہ میرے اور بلال کے لیے کوئی چیز جسے کوئی جان دار (پیٹ بھر کر) کھا سکے، نہیں تھی۔ بس اتنی ہوتی تھی جسے بلال اپنی بغل میں چھپائے رکھتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کو جو جسمانی تکلیفیں پہنچیں بعض صحابہ کرام کو بہ ظاہر ان سے زیادہ تکلیفیں پہنچیں۔ ان تکالیف سے آپ کو ذہنی و روحانی صدمہ پہنچتا تھا، اس لیے کہ یہ تکلیفیں آپ پر ایمان ہی کے نتیجے میں صحابہؓ کو پہنچ رہی تھیں۔ اس پہلو سے آپ نے سب سے زیادہ تکلیفیں برداشت کیں۔ انبیاء میں حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ شہید کر دیے گئے، لیکن یہاں قتل کا ذکر نہیں ہے۔ زندہ رہتے ہوئے جو تکلیف سہی گئی اس کا بیان ہے۔[۴]

---

۱ بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا قال احدکم آمین والملٰئکۃ فی السماء الخ۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب مالقی النبی من اذی المشرکین والمنافقین۔

۲ ابن سعد، طبقات: ۱/۲۱۱-۲۱۲۔

۳ ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ۔ مسند احمد: ۴/۲۰۴۔ مسند احمد کی ایک روایت میں تیس دن کی جگہ تین دن کا ذکر ہے۔ ولقد أتت علیّ ثلاثة من بین یوم و لیلة: ۳/۵۶۹۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابن ماجہ، مقدمہ، فضل سلمان وابی ذر والمقداد، حدیث نمبر ۱۵۱

۴ ابن حجر، فتح الباری: ۷/۵۵۵-۵۵۶

صحابہ کرامؓ جن اذیتوں سے دو چار ہوئے

حضرت ابوبکرؓ، جو رسول اللہ ﷺ کے رفیق خاص تھے، ان کو بھی طرح طرح سے اذیتیں پہنچائی جاتیں۔ حضرت عائشہؓ اس سلسلے کا ایک واقعہ بیان کرتی ہیں کہ جب صحابہ کرام کی تعداد اڑتیس [۳۸] ہوگئی تو حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اب ہمیں اپنے اسلام کا کھل کر اظہار کرنا چاہیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اے ابوبکر! ابھی ہم تھوڑے ہیں، لیکن ابوبکر اصرار کرتے رہے۔ بالآخر رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے اظہار و اعلان کا فیصلہ فرمایا۔ مسلمان خانۂ کعبہ کے مختلف گوشوں میں اپنے اپنے قبیلوں میں پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا۔ اس طرح حضرت ابوبکر پہلے خطیب تھے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی طرف علی الاعلان دعوت دی۔ اس پر مشرکین حضرت ابوبکر اور ان مسلمانوں پر جو ان کے اپنے قبائل سے تعلق رکھتے تھے، ٹوٹ پڑے اور بری طرح زد وکوب کیا۔ حضرت ابوبکر کو سختی سے روند ڈالا۔ ان کے کافی چوٹیں آئیں۔ عتبہ بن ربیعہ ابوبکرؓ کو چمڑے کے جوتوں سے مارنے لگا۔ اس سے آپ کا چہرہ اس قدر سوج گیا کہ چہرے اور ناک میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ آپ کے خاندان بنو تیم کے لوگ دوڑے ہوئے آئے، مشرکین کو دفع کیا اور ابوبکر کو چادر میں ڈال کر ان کے گھر اٹھا لے گئے۔ ان لوگوں کو یقین سا ہو گیا تھا کہ آپ زندہ نہیں بچیں گے، چناں چہ ان لوگوں نے حرم پہنچ کر اعلان کیا کہ اگر ابوبکر کا انتقال ہو گیا تو ہم عتبہ بن ربیعہ کو قتل کر دیں گے۔ یہ لوگ واپس گھر پہنچے۔ ابوبکر کے والد ابوقحافہ اور خاندان کے دوسرے افراد نے حضرت ابوبکر سے گفتگو کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ بول نہیں پارہے تھے۔ دن کے آخر میں آپ بولے تو پہلا سوال یہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ اس پر خاندان کے لوگ انھیں ملامت کرنے لگے اور آپ کی والدہ ام الخیر سے کہا: جاؤ، انھیں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ جب وہ آپ کے قریب پہنچ کر اصرار کرنے لگیں تو اس وقت بھی وہ یہی دریافت کرتے رہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ انھوں نے جواب دیا:

مجھے تمہارے دوست کا حال معلوم نہیں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ام جمیل بنت خطابؓ کے پاس جاؤ اور ان سے حال معلوم کر کے آؤ۔ وہ ام جمیل کے پاس پہنچیں اور کہا کہ ابوبکر، محمد بن عبد اللہ ﷺ کا حال تم سے دریافت کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا: میں ابوبکر اور محمد بن عبداللہ کو نہیں جانتی، اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے بیٹے کے پاس چل سکتی ہوں۔ انہوں نے کہا: اچھا چلو۔ گھر پہنچ کر ام جمیل نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر بے جان سے پڑے ہیں تو وہ چیخ پڑیں کہ جن کفار نے آپ کے ساتھ یہ حرکت کی ہے، مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی طرف سے ان سے انتقام لے گا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے رسول اللہ ﷺ کا حال پوچھا۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ آپ کی والدہ سن رہی ہیں۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ ان سے کسی اندیشہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس اطمینان کے بعد انہوں نے کہا کہ آپؐ صحیح سالم اور محفوظ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ آپ اس وقت کہاں ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ دارِ ارقم میں ہیں۔ ابوبکر نے کہا کہ اللہ کی قسم! جب تک آپ کے پاس پہنچ نہ جاؤں، کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں۔ رات میں جب لوگ آرام کرنے لگے تو یہ دونوں آپ کو لے کر نکلیں۔ آپ اپنی ماں کے سہارے چل رہے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت ابوبکرؓ کو پہنچایا گیا تو آپ نے جھک کر حضرت ابوبکرؓ کو بوسہ دیا اور مسلمان بھی محبت سے جھک پڑے۔ حضرت ابوبکر کو اس حال میں دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کو سخت صدمہ ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں ٹھیک ہوں، البتہ اس فاسق کے میرے چہرے پر مارنے کی وجہ سے جو چوٹ آئی ہے اس میں تکلیف ہے۔ یہ میری ماں اپنے لڑکے کے ساتھ آئی ہے۔ آپ کی ذات بابرکت ہے۔ آپ انہیں اللہ کی طرف دعوت دیں۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ آپ کے ذریعہ انہیں جہنم سے نجات دے۔ آپ نے دعا کی اور وہ ایمان لے آئیں۔[1]

حضرت عثمان بن مظعونؓ بہت نیک اور خدا ترس انسان تھے۔ بالکل ابتدائی

---

[1] ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/۴۳۹-۴۴۱۔ برہان الدین الحلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۱/۴۷۵-۴۷۶

دور میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان کو ولید بن مغیرہ نے پناہ دے رکھی تھی۔ بعد میں انہوں نے اس کی پناہ رد کر دی۔ اس کے بعد کا واقعہ ہے کہ مشہور شاعر لبید بن ربیعہ[1] نے قریش کی ایک مجلس میں اپنا ایک شعر پڑھا۔ پہلا مصرعہ تھا:

أَلَا کل شیء ما خلا اللّٰہ باطل — سن، لو اللہ کے سوا ہر چیز مٹنے والی ہے۔

حضرت عثمانؓ نے کہا: تم نے سچ کہا۔ اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ لبید نے دوسرا مصرعہ پڑھا:

و کل نعیم لَا محالۃ زائل — ہر نعمت بہرحال ختم ہونے والی ہے۔

حضرت عثمانؓ نے ٹوکا کہ یہ تم نے غلط کہا ہے، جنت کی نعمتیں لازوال ہیں۔ لبید بن ربیعہ نے کہا: اے قریش کے لوگو! قسم خدا کی، تمہاری مجلس میں جو بیٹھتا اسے کوئی اذیت نہیں پہنچتی تھی۔ اب یہ کب سے ہونے لگا ہے؟ اس پر ایک شخص نے کہا: ہمارے یہاں کچھ بے وقوف ہیں، جنھوں نے ہمارا دین چھوڑ دیا ہے۔ یہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ تم اس کی بات کا برا نہ مانو۔ حضرت عثمانؓ نے اس کا جواب دیا تو بات بڑھ گئی۔ اس شخص نے اٹھ کر اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ ان کی ایک آنکھ بے کار ہوگئی۔ مجلس میں ولید بن مغیرہ بھی تھا۔ اس نے کہا: بھتیجے! اگر تم میری مضبوط پناہ میں ہوتے تو آج یہ آنکھ ضائع نہ ہوتی۔ حضرت عثمانؓ نے کہا: قسم خدا کی، میں چاہتا ہوں کہ میری دوسری آنکھ، جو صحیح ہے، وہ بھی اللہ کے راستے میں ختم ہو جائے۔ اے عبد شمس! میں اس ہستی کی پناہ میں ہوں جو تم سب سے زیادہ قوی اور طاقت ور ہے۔ ولید نے کہا کہ اب بھی موقع ہے تم دوبارہ میری پناہ میں آجاؤ۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔[2]

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ مکہ کے ابتدائی دور کا حال بیان کرتے ہیں کہ ایک

---

[1] لبید بعد میں مسلمان ہوگئے اور بڑی لمبی عمر پائی۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۴/ ۴۸۲-۴۸۵

[2] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۰۸۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۳/ ۵۹۰

روز صحابہ کے درمیان اس پر گفتگو ہونے لگی کہ قریش کے لوگوں نے ابھی تک قرآن مجید کو زور سے تلاوت کرتے نہیں سنا ہے۔ کون ہے جو انہیں جہر کے ساتھ قرآن سنائے۔ میں نے کہا: میں اس کام کے لیے تیار ہوں۔ صحابہ نے کہا: تمہارے لیے یہ مناسب نہ ہوگا، وہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کر سکتے ہیں۔ ہم تو کوئی ایسا آدمی چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی کرنا چاہے تو اس کا قبیلہ اسے روک دے۔ میں نے کہا: مجھے یہ کام کرنے دو۔ اللہ میری حفاظت کرے گا۔ چنانچہ صبح دھوپ ذرا تیز ہوئی اور قریش کے لوگ اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوئے تھے تو عبداللہ بن مسعودؓ مقامِ ابراہیم کے پاس پہنچے اور پورے زور سے سورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کر دی۔ مشرکین نے جب آواز سنی تو کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئے کہ ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) یہ کیا کہہ رہا ہے؟ پھر کہا: اچھا، یہ وہی کلام ہے جو محمد ﷺ پیش کر رہے ہیں۔اس خیال کے آتے ہی وہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے منہ پر طمانچے مارنے لگے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے قرآن جتنا سنا سکتے تھے، سنایا۔ جب صحابہ کرام کے پاس پہنچے تو چہرہ پر چوٹ کے نشانات تھے۔ صحابہ نے کہا: اسی اندیشہ سے ہم تمہیں منع کر رہے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ یہ دشمنانِ خدا پہلے سے زیادہ مجھے بے وزن محسوس ہو رہے ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو کل پھر میں انہیں قرآن مجید سناؤں۔ لوگوں نے کہا: اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کلام کو وہ ناپسند کرتے ہیں اسے تم نے بہرحال سنا دیا، یہ کافی ہے[1]

حضرت عمرؓ ہجرتِ مدینہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اور عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن العاص نے طے کیا کہ سویرے ایک متعین جگہ (قبیلۂ بنی غفار کے چشمہ کے پاس) ہم جمع ہوں گے اور اگر کوئی نہ پہنچے تو یہ سمجھا جائے گا کہ مشرکین نے اسے قید کرلیا ہے۔ باقی دو اصحاب سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ میں اور عیاش بن ابی ربیعہ تو متعین جگہ پر پہنچ گئے اور مدینہ ہجرت کی، لیکن ہشام بن العاص کو کفار نے گرفتار کرلیا

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۵۱-۳۵۲۔ اسد الغابۃ: ۳/ ۳۸۳

اور وہ سخت آزمائش سے گزرے[1]

حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ ہشام بن العاص کو کفار نے ہجرت نہیں کرنے دی، لیکن میں اور عیاش بن ربیعہ جب مدینہ پہنچ گئے تو ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام (یہ دونوں عیاش بن ربیعہ کے اخیافی بھائی تھے) مدینہ ان کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ ماں نے نذر مان رکھی ہے کہ جب تک تمہیں نہ دیکھ لے، سر میں کنگھی نہیں کرے گی اور دھوپ سے سایہ میں نہیں جائے گی۔ یہ سن کر ان کے جذبات ابھر آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا: عیاش! قسم خدا کی، یہ دونوں تمہیں اپنے دین سے پھیرنے کی تدبیر کر رہے ہیں، ان سے ہوشیار رہو۔ اگر تمہاری ماں کو جوئیں پریشان کریں گی تو کنگھی کرے گی اور مکہ کی گرمی سخت ہوگی تو سائے میں بھی جائے گی۔ عیاش نے کہا: میں اپنی ماں کی قسم پوری کر کے واپس لوٹ آؤں گا۔ میرا مال بھی وہاں رہ گیا ہے، وہ بھی لے لوں گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا: تمہیں معلوم ہے کہ میں (اس وقت) قریش کا سب سے مال دار آدمی ہوں۔ میرا آدھا مال لے لو، لیکن ان کے ساتھ مت جاؤ۔ انہوں نے میری بات نہ مانی اور سفر کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا: جب تم نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میری یہ اونٹنی لے جاؤ۔ یہ بہت عمدہ اونٹنی ہے۔ اس سے نیچے مت اترنا۔ اگر تم کو ان سے کچھ کھٹک محسوس ہو تو اسی اونٹنی پر تیزی سے نکل آنا اور ان لوگوں سے نجات حاصل کر لینا۔ چناں چہ وہ اسی اونٹنی سے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستے میں ابوجہل نے کہا کہ یہ میرا اونٹ ٹھیک سے چل نہیں رہا ہے، کیا تم اپنی اونٹنی پر مجھے بٹھا سکتے ہو؟ وہ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ جب وہ اونٹنی کو بٹھا کر نیچے اترے تو یہ دونوں بھی اپنی سواریوں سے اترے اور فوراً ان کو پکڑ کر رسی سے باندھ لیا اور مکہ لے گئے۔ مکہ پہنچ کر اعلان کیا: اے اہلِ مکہ! دیکھو اپنے بے وقوفوں کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کرو جیسا ہم نے

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۲/۲۸۔ ابن سعد الطبقات الکبریٰ: ۴/۱۹۱۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۵/۳۷۶۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۶/۴۲۳

اپنے اس بے وقوف کے ساتھ کیا ہے[1]

جو صحابۂ کرام سن رسیدہ اور بااثر تھے اور جن کے پیچھے ان کے قبائل کی طاقت تھی، ان کے ساتھ بھی موقع ملنے پر دوسرے قبائل ظلم و زیادتی کر گزرتے تھے، لیکن جو صحابہ کم سن تھے ان پر خود ان کے قبیلے جور و ستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ کا شمار 'السابقون الاولون' میں ہوتا ہے۔ یہ مکہ کے بہت ہی خوبصورت اور دل موہ لینے والے نوجوان تھے۔ ان کے ماں باپ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی ماں دولت مند تھی، انہیں بہترین لباس پہناتی تھی۔ وہ مکہ میں سب سے زیادہ عطر اور خوش بو استعمال کرنے والے فرد تھے۔ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے مکہ میں ان سے زیادہ خوبصورت بالوں والا اور ناز و نعمت میں پلا ہوا کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ اس وقت اسلام لے آئے جب کہ دارِ ارقم مرکزِ تبلیغ تھا اور رسول اللہ ﷺ نے کھل کر تبلیغ نہیں شروع کی تھی۔ یہ اپنی ماں اور اپنی قوم کے خوف سے اسلام کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ دوسروں کی نگاہوں سے بچ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دین سیکھتے۔ ایک دن ایک شخص نے انہیں نماز پڑھتے دیکھ لیا تو ان کی ماں اور گھر کے دوسرے افراد کو اس کی اطلاع کر دی۔ اس پر انہیں پکڑ کر قید کر دیا گیا۔ بہت دنوں کے بعد وہ حبشہ ہجرت کرنے میں کام یاب ہوئے تو ہیئت بالکل بدل چکی تھی۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ ہمیں تنگ دستی اور معاشی تکلیف پہنچتی ہی تھی، جب اسلام کی راہ میں تکلیف پہنچی تو یہ ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ ہم نے اس پر صبر کیا، لیکن مصعب بن عمیر مکہ کے ناز و نعمت میں پروردہ نوجوان تھے، ان کا لباس بہت ہی عمدہ اور نفیس ہوتا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اسلام لانے کے بعد انہیں سخت تکلیف پہنچی۔ ان کے بدن پر سانپ کی کھال کی طرح جھریاں پڑ گئی تھیں[2]

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۸۸-۸۹۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۲/ ۲۷۱-۲۷۲

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/ ۱۱۶-۱۱۷۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۵/ ۱۷۶

سلمہ بن ہشامؓ ابوجہل کے بھائی تھے۔ قدیم الاسلام تھے۔ مشرکین کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کی۔ حبشہ سے واپس ہو کر مدینہ ہجرت کرنی چاہی تو انہیں روک دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ ان کے اور دوسرے مستضعفین کے لیے، جو مشرکین کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے، دعاء قنوت پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ آپ کی دعا کے یہ الفاظ نقل فرماتے ہیں:

اللّٰهم انج عياش بن أبى ربيعة، اللّٰهم انج سلمة بن هشام، اللّٰهم انج الوليد بن الوليد، اللّٰهم انج المستضعفين من المومنين[۱]

اے اللہ (مشرکین سے) نجات دے عیاش بن ابی ربیعہ کو، اے اللہ! نجات دے سلمہ بن ہشام کو۔ اے اللہ نجات دے ولید بن ولید کو، اے اللہ نجات دے ان اہل ایمان کو جو مستضعفین ہیں (اور مکہ سے نکل نہیں پا رہے ہیں)۔

ان تینوں کا تعلق بنومخزوم سے تھا۔ بعد میں یہ حضرات کسی طرح مکہ سے نکلنے میں کام یاب ہوئے[۲]

حضرت زبیر بن عوامؓ نے بارہ اور ایک روایت کے مطابق سولہ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا[۳] ان کا چچا انہیں ایک چٹائی میں باندھ کر دھواں دیتا، تاکہ وہ کفر کی طرف پلٹ جائیں، لیکن وہ یہی کہتے کہ میں کبھی کفر کی طرف واپس نہیں جا سکتا[۴]

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو نوفل بن خویلد نے ایک رسی میں باندھ دیا تھا۔ وہ قریش کا شیر خیال کیا جاتا تھا۔ چناں چہ حضرت ابوبکر کے قبیلہ (بنوتیم)

---

۱ بخاری، کتاب الاستسقاء، باب دعاء النبی اجعلها سنین کسنی یوسف۔ مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ۔

۲ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۲/۱۳۰-۱۳۱۔ ابن اثیر، اسدالغابۃ: ۲/۵۳۱-۵۳۲۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب: ۲/۲۰۳

۳ ابن عبد البر نے دوسری روایت کو ترجیح دی ہے۔ اس سلسلہ میں بعض اور اقوال بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ الاستیعاب فی اسماء الاصحاب: ۲/۹۰

۴ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۲/۴۵۷۔ زرقانی علی المواہب: ۱/۴۵۷

کے لوگ کچھ نہ کر سکے[1]

یہ ان لوگوں کا حال تھا جن کے خاندان اور قبیلے مکہ میں موجود تھے اور جو اس جورِ ناروا سے باز رکھ سکتے تھے۔اس کے باوجود بعض اوقات وہ اسے روک نہیں پاتے تھے یااس میں ناکام رہتے۔

کم زوروں پر عتاب

مکہ کے جو کم زور افراد اللہ کے دین کو قبول کرتے اور اللہ کے رسول ﷺ کا ساتھ دیتے ان کی حالت اور ابتر تھی۔ ان کے ساتھ بڑا وحشیانہ اور غیر مہذب سلوک روا رکھا جاتا۔ یہ مستضعفین اور کم زور انسان کون تھے؟ ان کے بارے میں ابن سعد میں ہے:

و المستضعفين قوم لا عشائر لهم بمكة و ليست لهم منعة[2]

مستضعفین وہ لوگ تھے، مکہ میں جن کے قبائل نہ تھے اور جن کو تحفظ اور قوت حاصل نہ تھی۔

ان میں زیادہ تر غلاموں کا طبقہ تھا۔ انہوں نے جب اسلام کا اعلان و اظہار کیا تو ان کے ساتھ جس بہیمیت اور درندگی کا مظاہرہ کیا گیا اس کا حال حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس طرح بیان کرتے ہیں:

أول من اظهر الاسلام سبعة: رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم و أبو بكر و عمار و امه سمية و صهيب و بلال و المقداد، فاما رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم فمنعه اللّٰه بعمه أبى طالب و اما ابوبكر فمنعه اللّٰه بقومه و اما سائرهم فاخذهم المشركون

سب سے پہلے سات افراد نے اسلام کا اظہار و اعلان کیا۔ وہ تھے رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمار، ان کی ماں سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد (رضی اللہ عنہم) جہاں تک رسول اللہ ﷺ کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا ابوطالب کے ذریعہ سے آپ کی حفاظت فرمائی۔ ابوبکر کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کے ذریعہ سے لوگوں کی چیرہ دستی سے بچالیا۔ باقی اور پانچ کو مشرکین نے پکڑا،

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/ ۳۱۵

[2] حوالہ سابق: ۳/ ۲۴۸

فالبسوهم أدراع الحديد و صهروهم في الشمس[1]

انہیں لوہے کی زرہیں پہنائیں اور دھوپ میں پگھلنے کے لیے ڈال دیا۔

حالات اتنے شدید اور ناقابل برداشت ہوتے چلے گئے کہ ان سے بچنے کے لیے زبان سے کلمۂ کفر نکالنے اور شرک کی بظاہر تائید کرنے کی بھی اجازت دی گئی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ قلب ایمان پر مطمئن رہے اور کفر کو قبول کرنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ ہو۔ اس لیے کہ راہِ حق میں پیش آنے والی تکلیفوں اور آزمائشوں سے ہراساں ہو کر کفر کو اختیار کر لینا اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

(النحل:۱۰۶-۱۰۹)

جو اللہ کا انکار کرے اس پر ایمان لانے کے بعد، سوائے اس کے جسے مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (وہ معذور ہے) لیکن جو کوئی شرح صدر کے ساتھ کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ بے شک اللہ کافروں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ بے شک یہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہیں۔

یہ اس بات کی ہدایت تھی کہ حالات کی سختی کی وجہ سے اسلام کی طرف بڑھتے ہوئے قدم جانبِ کفر نہ اٹھنے لگیں۔ ورنہ اس سے دنیا کی آزمائش سے آدمی محفوظ بھی رہ جائے تو آخرت کے عذاب سے نہ بچ سکے گا۔ لیکن اگر راہِ حق کے شدائد ناقابل برداشت

---

[1] مسند احمد:۱/۶۶۷۔ ابن ماجہ، مقدمۃ، باب فضل سلمان و ابی ذر و المقداد۔ طبقات ابن سعد: ۳/۲۳۳ میں حضرت مقداد کی جگہ حضرت خبیب کا ذکر ہے۔

ہو جائیں اور کفر کے حق میں جنبشِ زبان سے ان سے نجات کی توقع ہو تو اس کے لیے زبان کھولی جاسکتی ہے۔ یہ ایک اجازت ہے، عزیمت کی راہ پھر بھی یہی ہوگی کہ آدمی آزمائشوں کے طوفان میں بھی حق کو حق اور باطل کو باطل کہے اور استقامت کا ثبوت دے۔

حضرت سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دریافت کیا: کیا رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو مشرکین اتنی سخت سزائیں دیتے تھے کہ وہ اپنے دین کو بظاہر چھوڑنے میں معذور سمجھے جائیں؟ انہوں نے جواب دیا: قسم خدا کی! ہاں یہی صورت تھی۔ وہ ان میں کسی کو مارتے، بھوکا پیاسا رکھتے، نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ تکلیف کی شدت سے وہ بیٹھ نہیں پاتا تھا۔ اس حال میں وہ اس سے جو چاہتے کہلواتے۔ وہ سوال کرتے کہ اللہ کے بجائے لات وعزّیٰ تمہارے خدا ہیں یا نہیں؟ وہ جواب دیتا: ہاں! یہاں تک کہ گبریلا کیڑا ان کے پاس گزرتا اور وہ اس سے پوچھتے کہ بجائے اللہ کے کیا یہ تمہارا خدا نہیں ہے؟ وہ اثبات میں کہتا: ہاں! یہ ہمارا خدا ہے۔ یہ سب کچھ وہ اس اذیت سے نجات پانے کے لیے کہتا جس میں وہ مبتلا ہوتا۔[1]

ابن اسحاق کہتے ہیں: جو لوگ اسلام لاتے اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی اختیار کرتے ان پر مشرکین نے ظلم و زیادتی شروع کر دی۔ ہر قبیلہ اپنے اندر کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ ان میں جو کم زور تھے وہ ان کو قید کرتے، مار پیٹ اور بھوک پیاس کے عذاب میں ڈالے رکھتے، مکہ کی ریت جب گرم ہو جاتی تو اس پر لٹا دیتے۔ تاکہ انہیں ان کے دین سے پھیر دیں۔ بعض لوگ شدت تکلیف سے ان کی بات مان لیتے۔ بعض لوگ سختی سے اپنے دین پر جمے رہتے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان سے بچا لیتا۔[2]

اب ذرا ان بے یار و مددگار غلاموں کا حال سنیے جنھوں نے مکہ میں اسلام قبول کیا۔ وہ جس تعذیب اور اذیت رسانی سے گزرے ان کے تصور ہی سے انسان

۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۵۷۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۹۵۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۴/ ۱۲۴

۲۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۵۴۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۱/ ۵۸۸

لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ جس درندگی اور حیوانیت کا مظاہرہ کیا گیا اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

حضرت بلالؓ غلام تھے۔وہ اسلام لائے تو ان کا مالک امیہ بن خلف ان پر غیر معمولی سختی کرنے لگا۔ سورج کی تمازت جب بڑھ جاتی تو وہ انہیں ریت اور کنکریوں سے بھری ہوئی مکہ کی وادی میں لٹا دیتا اور سینہ پر بڑا سا پتھر رکھ دیتا۔ کہتا: خدا کی قسم، تم اسی حال میں پڑے پڑے مر جاؤ گے۔اس سے نجات چاہتے ہو تو محمد (ﷺ) کا انکار کردو اور پھر سے لات وعزّٰی کی عبادت شروع کردو۔ لیکن اس کے باوجود وہ احد احد (اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے) کی صدا بلند کرتے رہتے[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے دین کے لیے حضرت بلالؓ نے اپنی جان کو حقیر سمجھا اور مشرکین نے بھی ان کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کیا۔ وہ ان کے گلے میں رسی باندھ کر بچوں کے ہاتھ میں دے دیتے کہ وہ ان کو مکہ کی وادیوں میں بطور تفریح لے کر گھومتے پھریں۔ وہ اس حال میں بھی احد احد کی صدا بلند کرتے رہتے۔ گردن میں اس کے نشان پڑ گئے تھے[2]

حضرت بلالؓ کو جو اذیتیں دی جاتی تھیں انہیں دیکھ کر ایک روز حضرت ابوبکرؓ نے امیہ بن خلف سے کہا کہ کیا تم اس مسکین کے معاملے میں خدا سے نہیں ڈرتے ہو؟ کب تک یہ ظلم جاری رہے گا؟ اس نے کہا: تم ہی نے تو اسے بگاڑا ہے۔ اگر اسے بچا سکتے ہو تو بچاؤ۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میرے پاس ایک سیاہ فام غلام ہے، جو اس سے زیادہ مضبوط اور تمہارے دین پر قائم ہے۔ اس کے بدلے تم وہ لے لو۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، یہ تمہارا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنا غلام اسے دے دیا اور حضرت بلالؓ کو اس

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۵۴

[2] مسند احمد: ۱/ ۶۶۷۔ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ۳/ ۲۳۳۔ برہان الدین الحلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۱/ ۴۷۸-۴۷۹

سے لے کر آزاد کر دیا[۱]

حضرت خباب بن الارت 'السابقون الاولون' میں تھے۔کہا جاتا ہے کہ اسلام قبول کرنے والوں میں یہ چھٹے فرد تھے۔انہیں برہنہ کر کے گرم ریت پر چت لٹا دیا جاتا، پتھر کو آگ میں تپا کر پشت کو داغا جاتا، سر کو ایک طرف موڑ دیا جاتا، لیکن اس کے باوجود وہ دین پر ثابت قدم رہے۔انہوں نے مشرکین کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا کہ وہ اسلام ترک کر دیں اور عقیدۂ شرک اپنا لیں[۲]

حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں اس کا حال دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ میری پیٹھ دیکھیے۔ دیکھا تو کہا: میں نے ایسی پیٹھ کبھی نہیں دیکھی۔وہ برص کی طرح بالکل سفید تھی۔حضرت خباب نے بتایا کہ آگ دہکائی گئی اور مجھے اس پر گھسیٹا گیا۔میرے بدن کی چربی سے آگ بجھی تھی[۳]

حضرت صہیب بن سنان رومیؓ، عبداللہ بن جدعان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ نبوت کے آغاز ہی میں اسلام لے آئے۔عروہ بن زبیر کہتے ہیں:

كان صهيب بن سنان من المستضعفين من المومنين الذين كانوا يُعذّبون فى الله بمكة [۴]	صہیب بن سنان اہل ایمان کے ان مستضعفین میں تھے جنھیں مکہ میں اللہ کی راہ میں عذاب دیا جاتا تھا۔

۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۵۵۔ ابن سعد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ کو قیمتاً خرید کر آزاد کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ سے خریدنے کا ذکر آیا تو فرمایا کہ ابوبکرؓ ہمیں بھی اس میں شریک کرلو۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: میں نے انھیں آزاد کر دیا ہے۔ الطبقات الکبریٰ: ۳/ ۲۳۲۔ امیہ بن خلف نے جس طرح سودے بازی کی اور غلام کے ساتھ جو قیمت ادا کی گئی اس سلسلہ کی روایات کے لیے ملاحظہ ہو السیرۃ الحلبیۃ: ۱/ ۴۸۰

۲۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۱/ ۵۹۰

۳۔ ابن سعد، الطبقات: ۳/ ۱۶۵۔ نیز ملاحظہ ہو ابن عبدالبر، الاستیعاب ۲/ ۲۲۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۲/ ۱۴۸

۴۔ ابن سعد، الطبقات: ۳/ ۳۲۶۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۳/ ۳۹

حضرت صہیبؓ نے جب ہجرت کی تو قریش کے کچھ لوگ پیچھے لگ گئے۔ وہ اپنی سواری سے اترے اور کہا: قریش کے لوگو! تم جانتے ہو کہ میں تم سب سے بڑا تیرانداز ہوں۔ میرے قریب اسی وقت آسکو گے جب کہ میرے ترکش کے تیر خالی ہوجائیں گے۔ پھر اس کے بعد، جب تک ہاتھ میں طاقت ہے، تلوار چلاؤں گا۔ اگر تم مال چاہتے ہو تو میں وہ بتائے دیتا ہوں۔ انہوں نے کہا: ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ حضرت صہیبؓ نے جو مال ان کے پاس تھا وہ ان کے حوالے کر دیا (جو مکہ میں رہ گیا تھا ممکن ہے اس کی بھی نشان دہی کر دی ہو) خالی ہاتھ مدینہ پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو تفصیل بتائی تو ارشاد فرمایا: تم نے بڑے نفع کا سودا کیا ہے[۱]

ابن ہشام کی روایت ہے کہ حضرت صہیبؓ نے جب ہجرت کا ارداہ کیا تو قریش نے کہا: تم یہاں فقیر اور تنگ دست آئے تھے۔ ہمارے ہاں تم نے بہت سا مال جمع کیا۔ اب خود بھی جانا چاہتے ہو اور اپنا مال بھی لے جانا چاہتے ہو۔ قسم خدا کی، دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہو سکتیں۔ حضرت صہیبؓ نے کہا کہ اگر میں اپنا مال تمہارے حوالے کر دوں تو کیا تم مجھے جانے دو گے۔ انہوں نے کہا: ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ انہوں نے اپنا سب کچھ ان کے حوالے کیا اور مدینہ روانہ ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو آپ نے دو بار فرمایا: صہیب نے اچھا سودا کیا، صہیب نے اچھا سودا کیا[۲]

یاسر بن عامر، ان کی بیوی سمیہ، ان کے بیٹے عمار اور عبد اللہ اسلام لے آئے۔ اس پورے خاندان کو سخت تکلیفیں دی گئیں۔ مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر انہیں لٹا دیا جاتا۔ اسی تکلیف میں یاسر نے جان، جان آفریں کے حوالے کی[۳]

۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/۳۲۶۔ ابن اثیر۔ اسد الغابہ: ۳/۳۹

۲۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۲/۹۱

۳۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۱/۵۸۹

یاسر کے صاحب زادے عبداللہ کو تیر لگا اور وہ شہید ہوئے[۱]

عمار بن یاسر اپنے ایمان لانے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے صہیب بن سنان رومی کو دارارقم کے دروازے پر دیکھا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ اندر موجود تھے۔ میں نے پوچھا: کیا ارادہ ہے؟ انہوں نے پلٹ کر میرا ارادہ معلوم کیا۔ میں نے کہا: میں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پہنچ کر ان کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا: میں بھی اسی خیال سے آیا ہوں۔ ہم دونوں آپ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ نے اسلام پیش فرمایا۔ ہم نے قبول کر لیا۔ ہم شام تک آپ ہی کے پاس رہے۔ شام کو خاموشی سے باہر نکل آئے۔ اس طرح حضرت عمار اور حضرت صہیب ایک ساتھ ایمان لائے۔ان دونوں سے پہلے تیس افراد اسلام لا چکے تھے[۲]

رات میں حضرت عمار اپنے گھر پہنچے تو ان کے والدین نے دریافت کیا کہ وہ دن بھر کہاں رہے۔ انہوں نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کیا اور قرآن مجید کا جو حصہ یاد کیا تھا وہ سنایا۔ ان دونوں کو یہ بہت پسند آیا اور وہ ان کے ہاتھ پر اسلام لے آئے[۳]

حضرت عمار، ان کے والد یاسر اور ان کی والدہ سمیہ اور دوسرے مستضعفین کو لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں ڈال دیا جاتا۔ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور میں وادی بطحاء سے گزرے، وہاں حضرت عمار اور ان کے والدین کو سزا دی جا رہی تھی۔ آپ نے انہیں صبر کی تلقین کی اور دعا فرمائی[۴]

حضرت عمارؓ کو کبھی آگ سے جلایا جاتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ادھر سے گزر ہوا تو آپ نے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا کی: اے آگ! جس طرح تو ابراہیم پر ٹھنڈی ہو گئی تھی اسی طرح

---

۱ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۶/ ۵۰۰۔ زرقانی علی المواہب: ۱/ ۴۹۶

۲ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/ ۲۴۷-۲۴۸

۳ زرقانی علی المواہب: ۱/ ۴۹۷

۴ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/ ۳۲۶

عمار پر بھی ٹھنڈی ہو جا۔ کبھی پتھر گرم کر کے داغا جاتا، کبھی پانی میں غوطے دیے جاتے۔[1]

عرصہ کے بعد ایک صاحب نے ان کی پیٹھ پر بدھیاں دیکھیں۔ جب ان سے معلوم کیا تو انہوں نے بتایا کہ مکہ کی دھوپ میں قریش جو سزا دیتے تھے، یہ اس کے نشانات ہیں۔[2]

اس طرح کی ہول ناک سزائیں دے کر ان سے مطالبہ کیا جاتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی اور مشرکین کے معبودوں کی تعریف و توصیف کریں۔ مجبوراً ان کی زبان سے ایسے الفاظ نکلتے جنہیں وہ دل سے ناپسند کرتے تھے۔ دل ایمان پر مطمئن ہوتا اور زبان پر کفر کے کلمات ہوتے۔ جو اصحاب اس طرح کے الفاظ زبان سے نکالتے وہ بسا اوقات ہوش میں نہیں ہوتے تھے۔ انہیں یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔[3]

حضرت عمار بن یاسر کی والدہ حضرت سمیہؓ کو اسلام سے پھیرنے کے لیے بنومغیرہ کے لوگ سخت ترین سزائیں دیتے تھے، لیکن وہ اس میں کام یاب نہیں ہوئے۔ ایک مرتبہ ابوجہل ان پر غصہ ہوا تو شرم گاہ میں یا ران میں اتنے زور سے نیزہ مارا کہ وہ شرم گاہ تک پہنچ گیا۔ اسی سے یہ بوڑھی اور ضعیف خاتون شہید ہو گئیں۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلی شہادت تھی جو ان کے حصہ میں آئی۔[4]

ابوفکیہہ قدیم الاسلام ہیں۔ حضرت بلالؓ اور ان کے اسلام لانے کا زمانہ ایک ہی ہے۔ صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ امیہ بن خلف نے ان کے پیر میں رسی باندھی اور کہا کہ اب انہیں گھسیٹ کر سخت دھوپ میں ڈال دو۔ چناں چہ اس پر عمل ہوا۔ قریب ہی ایک گبریلا (کیڑا) رینگ رہا تھا۔ اس نے پوچھا: کیا یہ تمہارا رب نہیں ہے؟ انہوں نے جواب دیا: میرا، تمہارا اور اس کا رب اللہ ہے۔ اس نے اس پر بری طرح گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔ اس کا بھائی ابی بن خلف بھی موجود تھا۔ اس نے کہا: اور زور سے گلا دباؤ۔ اسی

---

۱ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/۲۴۸-۲۴۹۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۱/۵۸۹

۲ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/۲۴۸

۳ حوالہ سابق

۴ ابن عبدالبر، الاستیعاب: ۴/۴۲۰۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/۱۹۰

حال میں وہ پڑے رہے۔ انہوں نے سمجھا، وہ ختم ہو گئے۔ بعد میں وہ ہوش میں آئے۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہ بنو عبد الدار کے غلام تھے۔ وہ انہیں برہنہ کر کے لوہے کی زنجیر میں باندھ کر چلچلاتی دھوپ میں ڈال دیتے اور ان کے سینہ یا پشت پر پتھر رکھ دیتے۔ ان کے ہوش وحواس باقی نہ رہتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس سے ان کی زبان باہر نکل آتی تھی۔ یہ سب سختیاں انہیں دین سے پھیرنے کے لیے کی جاتی تھیں، لیکن وہ اس میں کام یاب نہیں ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو انہیں خرید کر آزاد کیا۔[1]

بنو مؤمّل، (بنو عدی بن کعب کی ایک شاخ) کی ایک لونڈی تھی، جس کا نام لبینہ یا لبیبہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ اسلام لے آئیں۔ حضرت عمرؓ ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ وہ انہیں سخت سزا دیتے تھے۔ تھک جاتے تو کہتے: مجھے تمہاری پٹائی پر افسوس نہیں ہے۔ تھک گیا ہوں، اس لیے چھوڑ دیا ہے۔ وہ بے چاری کہتیں: اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے خرید کر آزاد کیا۔[2]

ایک لونڈی زنیّرہ تھی۔ اسے بھی حضرت عمر اور ابوجہل سخت سزائیں دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسلام پر جمی رہیں۔ اس کی بینائی ختم ہوگئی تو مشرکین نے کہا کہ لات و عزّیٰ نے اس پر یہ مصیبت ڈھائی ہے۔ اس نے جواب دیا: لات و عزّیٰ کے ہاتھ میں نفع ونقصان نہیں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کون ان کی عبادت کر رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ وہ چاہے تو میری بینائی واپس آسکتی ہے۔ دوسرے ہی دن بینائی لوٹ آئی۔ اس پر مشرکین کہنے لگے کہ یہ محمد کا جادو ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے بھی خرید کر آزاد کیا۔[3]

---

[1] ابن عبدالبر، الاستیعاب: ۴/ ۲۹۳۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ٦/ ۲۴۱۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۱/ ۵۹۱

[2] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۵۵۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۱/ ۵۹۱

[3] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۵۵۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ۱/ ۵۹۱۔ شرح زرقانی: ۱/ ۵۰۲، ۵۰۳

اسی طرح نہدیہ اور ام عبیس نامی لونڈیاں تھیں جو مشرکین کی سختیوں کا شکار تھیں۔حضرت ابوبکر نے انہیں آزاد کیا تو انہیں ان سختیوں سے نجات ملی۔

یہ تھے وہ کرب ناک حالات جن سے مکہ میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام گزر رہے تھے اور ان حالات میں اسلام کے فروغ اور سر بلندی کی کوشش کی جارہی تھی۔

صبر و ثبات کی تلقین

قرآن مجید نے اس نازک صورت حال میں دین کے لیے صبر و ثبات کی مسلسل ترغیب دی اور استقامت کا جذبہ پیدا کیا۔اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور اس کے نیک بندوں کی سیرت،ان کی دعوتی جد وجہد اور اس کے لیے عزم و ہمت اور قربانی کا تفصیل سے اور مختلف پہلوؤں سے تذکرہ کیا اور ان کے اسوہ کو پیش نظر رکھنے اور اسے اختیار کرنے کی ہدایت کی ۔اہل ایمان سے بار بار کہا گیا کہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو اختیار کیا ہے تو انہیں صبر و ثبات کا پیکر ہونا چاہیے۔ایسا نہ ہو کہ مخالفین انہیں کم زور اور بے وزن سمجھ کر راہِ حق سے پھیرنے میں کام یاب ہو جائیں۔ مشکلات سے انہیں ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا، مخالفین کا زور ٹوٹے گا اور دینِ حق کام یابی سے ہم کنار ہوگا:

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ لَا یَسۡتَخِفَّنَّکَ الَّذِیۡنَ لَا یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۶۰﴾ (الروم:۶۰)

پس صبر کرو۔ بے شک اللہ کا وعدہ پکا ہے۔ وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے آپ کو کبھی بے وزن نہ بنانے پائیں۔

فرمایا: صبر کے ساتھ اللہ کے فیصلہ کا انتظار کرو، اس کا بہتر انجام سامنے آئے گا:

وَ اتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ وَ اصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ ۚۖ وَ ہُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾ (یونس:۱۰۹)

جو وحی آپ پر کی جارہی ہے اسی پر چلتے رہیے اور صبر کیجیے۔ یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

حکم ہوا: اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کی راہ پر گام زن رہو، اللہ کے حکم کا انتظار کرو، اللہ کے نافرمانوں اور ناشکروں کی بات نہ مانو، ان سے دامن کش رہو۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ (الدہر:۲۴)
پس صبر کرو اللہ کے فیصلے کا اور کسی گناہ گار اور ناشکر گزار کی اطاعت نہ کرو۔

اس طرح کی آیات نے دین حق کے مظلومین میں عزم و حوصلہ پیدا کیا اور مصائب و مشکلات کے طوفان میں جینا سکھایا۔ وہ اس یقین کے ساتھ جمے رہے کہ یہی راہ حق ہے اور اسی میں ہماری کام یابی ہے۔

رسول اکرم ﷺ بھی صحابہ کرام کو اس راہ کی مشکلات سے آگاہ فرماتے کہ یہ ہمیشہ آتی رہی ہیں، اب بھی لازماً آئیں گی۔ ان سے ہراساں ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالآخر تم ہی کام یاب رہو گے۔

حضرت خبابؓ ان اصحاب میں تھے جن پر سخت ظلم و زیادتی ہو رہی تھی۔ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا۔ آپ کعبہ کے سایہ میں چادر سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہم مشرکین کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کر رہے تھے۔ میں نے عرض کیا: کیا آپ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد طلب نہیں فرماتے؟ ہمارے لیے دعا نہیں کرتے؟ آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور چہرہ مبارک کا رنگ سرخ ہو گیا۔ (غالباً حضرت خباب کا اضطراب اور بے چینی گراں گزری) فرمایا: تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں، ان کے جسم کا گوشت لوہے کی کنگھیوں سے ہڈیوں تک کھرچ کر نکال دیا جاتا، ان کے سروں پر آرے چلا کر دو ٹکڑے کر دیے جاتے۔ اللہ تعالیٰ ضرور اس دین کو مکمل کرے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعا سے حضر موت تک چلا جائے گا۔ سوائے اللہ کے اسے کسی کا خوف نہ ہوگا، یا ڈر ہوگا تو اس بات کا کہ اس کی بکریوں پر کوئی بھیڑیا حملہ نہ کر دے، لیکن تم ہو کہ جلدی کر رہے ہو[1]

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی زمین کا نقشہ بدلنے والا ہے۔ ظلم کی جگہ عدل و انصاف کی اور بد امنی کی جگہ امن و امان کی حکومت ہو گی۔ لیکن اس کے لیے صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔

---

[1] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مالقی النبی و اصحابہ من المشرکین۔

حضرت یاسر اور ان کے پورے خاندان (عمار بن یاسر، عبداللہ بن یاسر، ان کی والدہ سمیہ) کو بنومخزوم سخت ترین اذیتیں پہنچاتے تھے۔ اس حال میں رسولِ اکرم ﷺ انہیں دیکھتے تو فرماتے:

صبرًا یا اٰل یاسر فاِنّ موعدکم الجنة[۱] — اے آل یاسر صبر کرو۔ بے شک تم سے جنت میں ملاقات ہوگی۔

یا یہ الفاظ زبان مبارک سے ادا ہوتے:

ابشروا اٰل عمار و اٰل یاسر فان موعدکم الجنة[۲] — خوش ہو جاؤ اے آل عمار اور آل یاسر تم سے جنت کا وعدہ ہے۔

عملی اقدامات

۱- قرآن مجید نے شروع ہی سے غلامی کے خلاف آواز اٹھائی۔ غلام اپنے مالکوں کے رحم وکرم پر جیتے تھے۔ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ان میں سے جن غلاموں اور لونڈیوں نے اسلام قبول کیا ان پر ناقابل بیان سختیاں ہو رہی تھیں۔ یہ اسلامی تاریخ کا اہم واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں خرید خرید کر آزاد کیا۔ حضرت بلال، عامر بن فہیرہ، ام عبیس، زنیرہ، نہدیہ اور اس کی بیٹی اور بنومومّل کی ایک لونڈی کا ان ہی میں شمار ہوتا ہے[۳] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ابوفکیہہ اور حضرت بلال کی والدہ حمامہ کو بھی آزاد کیا تھا[۴]

کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے والد ابوقحافہ نے ان سے کہا: بیٹے! تم بہت ہی کم زور لوگوں کو طوقِ غلامی سے رہائی دلا رہے ہو، اگر مضبوط لوگوں کو آزاد کرو گے تو وہ

---

۱ حاکم، المستدرک: ۳/۴۳۲

۲ حوالہ سابق: ۳/۴۳۸۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۲/۲۴۹

۳ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۵۵-۳۵۶۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۳/۳۲۵

۴ زرقانی علی المواہب اللدنیۃ: ۱/۵۰۲۔ نیز ملاحظہ ہو، حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۱/۴۸۱-۴۸۲

تمہاری حفاظت اور دفاع کر سکیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: میں یہ کام اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کے لیے کر رہا ہوں۔ اس کا کوئی اور مقصد نہیں ہے[1]

اس دور میں جو غلام اور لونڈیاں اسلام لانے کی پاداش میں اذیتیں برداشت کر رہے تھے اور جنھیں حضرت ابوبکرؓ نے آزاد کیا، روایات میں اس کا ذکر تو ملتا ہے۔ بہت ممکن ہے بعض اور صحابہ نے بھی یہ خدمت انجام دی ہو۔ مثال کے طور پر حضرت عثمانؓ کے بارے میں آتا ہے 'اعتق عشرین مملوکا'[2] (انہوں نے بیس غلام آزاد کیے)۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ کیا اس کا تعلق مدنی دور ہی سے ہے یا مکہ میں بھی حضرت عثمانؓ کے ذریعہ کسی کو بندِ غلامی سے رہائی ملی تھی؟

۲- سیرت کی کتابوں میں مدینہ کی مواخات کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ اس کی حکمت واضح ہے۔ اسی حکمت کی تحت رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں بھی صحابہ کرامؓ کے درمیان مواخات کرائی تھی۔ اس میں بالعموم اس بات کا خیال رکھا گیا کہ ایک فرد مالی یا سماجی لحاظ سے کم زور ہو تو دوسرا نسبتاً بہتر حیثیت کا مالک ہو، تاکہ وہ اپنے کم زور بھائی کی مدد کر سکے[3]

اس مواخات کا مقصد یہ تھا کہ اسلام لانے والے دو دو افراد ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں، ایک دوسرے کے مددگار ہوں، ان کے دکھ درد میں کام آئیں، اپنی پریشانیوں اور مشکلات میں ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں۔ جہاں پوری سوسائٹی کسی کے خلاف ہو، خاندان اور قبیلہ اس کا دشمن ہو وہاں اس اخوت اور بھائی چارگی کی بڑی اہمیت تھی۔ مکہ میں رسول اللہ ﷺ اور بعض صحابۂ کرام کو ان سردارانِ قبائل کی حمایت اور پناہ حاصل ہوئی جو کفر و شرک پر قائم تھے۔ اس کی وجہ سے ظلم و زیادتی سے ایک طرح کا تحفظ ملا اور دعوت و تبلیغ کی راہیں کھلیں۔

۱؎ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۵۵-۳۵۶

۲؎ مسند احمد: ۱/۱۱۶

۳؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسی کتاب کا مضمون 'مواخات مکہ'

☆☆☆

اسلام کی پیش قدمی اور مخالف صفوں سے حمایت

قرآن مجید کی اساسی تعلیمات

رسول اکرم ﷺ کو جب علی الاعلان دعوت کا حکم دیا گیا تو آپؐ نے اہلِ خاندان کو بھی اسلام کی دعوت دی اور دوسرے قبائل کے درمیان بھی کھل کر اسلام کو پیش فرمایا۔ اس سے ماحول میں ایک ہل چل سی پیدا ہوگئی اور ہر طرف سے مخالفت شروع ہوگئی۔ اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے آپ کی دعوت کے بنیادی نکات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

آپ نے جس وقت دعوت کا آغاز فرمایا، مکہ کا پورا معاشرہ شرک و بت پرستی میں مبتلا تھا۔ قرآن مجید نے اس پر زبردست تنقید کی کہ اس کی کوئی معقول بنیاد نہیں ہے۔ یہ عقل سلیم اور صحیح فطرت کے خلاف ہے۔ یہ بے جان بت تمہارے کچھ کام نہیں آسکتے۔ ان میں نفع و ضرر کی کوئی طاقت نہیں ہے۔ موت و حیات، مرض و صحت اور فقر و غنا ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ یہ تمہاری ضرورتوں کی تکمیل سے قاصر ہیں۔ یہ بولتے نہیں، دیکھتے اور سنتے نہیں، خود سے حرکت نہیں کر سکتے اور کسی چیز کو پکڑ نہیں سکتے۔ ان سے جو فریاد کی جاتی ہے وہ فضا میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔

قرآن مجید نے شرک اور بت پرستی کے مقابلے میں توحید خالص کا عقیدہ پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی ذات و صفات کا صاف ستھرا تصور دیا اور واضح کیا کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق و مالک اور فرماں روا ہے۔

قرآن نے اس دنیا میں انسان کی حیثیت واضح کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے،

وہی اس کا معبودِ حقیقی ہے۔ صرف اسی کی عبادت اس کے لیے روا ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کا کوئی جواز نہیں ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ یہاں من مانی اور بے قید زندگی نہیں گزار سکتا، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا پابند ہونا چاہیے۔ اسی میں اس کی کام یابی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر دور میں اپنے رسولوں کے واسطے سے انسانوں کی ہدایت کا انتظام کرتا رہا ہے۔ محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں اور اسی کا دین پیش فرما رہے ہیں۔ آپ کی رسالت کا انکار اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا انکار ہے۔ آخرت کا آنا برحق ہے، جہاں انسان اپنے اعمال کی جزا و سزا پائے گا۔ نکوکار جنت کے مستحق قرار پائیں گے اور بدکاروں کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

اس نے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی۔ اخوت ومحبت، عدل و انصاف، راست بازی، عفت وعصمت، دیانت و امانت اور ایفائے عہد جیسی صفات کی ترغیب دی اور انہیں اختیار کرنے کا حکم دیا، ظلم وزیادتی، حق تلفی، کذب و افترا، زنا اور بدکاری، خیانت اور بدعہدی اور مکر وفریب جیسے رذائلِ اخلاق سے دور رہنے اور اجتناب کرنے کی تلقین کی۔

قرآن مجید نے کہا کہ اللہ، رسول اور آخرت کا انکار انسان کو بے لگام بنا دیتا ہے۔ وہ جواب دہی کے احساس سے خالی ہو کر کسی بھی وادی میں بھٹک سکتا ہے۔ خدا بے زار اور آخرت فراموش انسان بلندیٔ کردار سے محروم اور اخلاق کی پستی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی خواہش اور اپنے مفاد کی تکمیل کے لیے جو کچھ بھی کر گزرے، کم ہے۔ اس کے بعد ظلم وزیادتی اور فتنہ وفساد کی آگ سے سوسائٹی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس دنیا میں امن و امان، عدل وانصاف، صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان، آخرت کے خوف اور رسول کی اتباع ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ جو قومیں اللہ اور رسول کی ہدایات کی پابند رہیں وہ ہمیشہ کام یاب رہیں اور جنھوں نے مخالفت کی راہ اپنائی وہ صفحۂ زمین سے مٹا دی گئیں۔

اس نے پوری قوم سے اور خاص طور پر سردارانِ قریش سے کہا کہ وہ دینِ حق کی مخالفت نہ کریں اور اپنی غلط روش سے باز آجائیں، ورنہ دنیا اور آخرت کی تباہی ان کا مقدر ہوگی۔ اس سے انھیں کوئی بچا نہیں سکتا۔

مخالفین کا ردّ عمل

قرآن مجید کی یہ تعلیمات اور تنبیہات روزِ اول سے اسلوب بدل بدل کر وضاحت کے ساتھ مسلسل نازل ہو رہی تھیں اور دعوتِ عام کی وجہ سے وہ مخاطبین کی بڑی تعداد تک پہنچ رہی تھیں۔ ہر جگہ ان کا ذکر اور چرچا ہو رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں ایک طرف مختلف قبائل سے افراد ٹوٹ ٹوٹ کر اسلام کے دائرے میں داخل ہونا شروع ہوگئے، دوسری طرف پورے ماحول میں اس کا شدید ردعمل بھی دیکھا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی ہر سو مخالفت ہونے لگی اور وقت کے ساتھ یہ شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر جو ردعمل ہوا اس کے بارے میں امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اسلام کی دعوت خفیہ اور علانیہ ہر طریقہ سے دے رہے تھے اور آپ پر ایمان لانے والے ایمان لا رہے تھے۔ ان میں زیادہ ترکم زور اور نوجوان افراد تھے۔ آپ کے ماننے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود کفارِ قریش نے آپ کی مخالفت نہیں کی، البتہ جب کبھی ان کی مجالس پر سے آپ کا گزر ہوتا تو اس طرح کے فقرے کسے جاتے تھے کہ عبد المطلب کے گھر کا یہ شخص آسمان سے بولتا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کے خداؤں کی، جن کی وہ اسے چھوڑ کر عبادت کر رہے تھے، نکتہ چینی کی اور کہا کہ وہ اس قابلِ نہیں ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے اور ان کے آبا و اجداد کے متعلق، جن کا حالتِ کفر میں انتقال ہوا، فرمایا کہ وہ آخرت میں خسارے میں ہوں گے، تو ان کی طرف سے بغض و عداوت کا اظہار ہونے لگا اور وہ آپ کے دشمن بن گئے۔[1]

یہ بات ابن اسحاق نے بھی کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کھل کر اسلام کو پیش کرنے اور دعوت دینے کی وجہ سے، میری معلومات کی حد تک، آپ کی قوم نے آپ سے دوری نہیں اختیار کی، البتہ جب آپ نے ان کے معبودوں کا ذکر کیا

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۱۹۹، زرقانی، شرح المواهب اللدنیۃ: ۱/ ۲۶۲۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۱/ ۲۶۱۔ شیخ حسن دیار بکری، تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس: ۱/ ۳۲۵

اور ان پر نکتہ چینی کی تو انہوں نے سمجھا کہ یہ ناقابلِ برداشت بات ہو رہی ہے اور محاذ آرائی شروع ہوگئی، سوائے ان چند افراد کے، جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت سے نوازا تھا اور جو تعداد میں تھوڑے تھے اور اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھے، سب آپ کی مخالفت اور دشمنی میں ایک ہو گئے۔[۱]

مشہور تابعی اور دوراول کے مورخ عروہ بن زبیر، عبدالملک بن مروان کو لکھتے ہیں:

فانهٗ لما دعا قومه لما بعثه اللّٰه من الهدىٰ و النور الذى انزل معه لم يبعدوا منه اوّل ما دعاهم و كادوا يسمعون له حتى ذكر طواغيتهم[۲]	جب آپ نے اپنی قوم کو اس دین کی دعوت دی جس کے لیے اللہ نے آپ کو مبعوث فرمایا، جس میں ہدایت اور وہ نور ہے جو آپ پر نازل ہوا تو انہوں نے آپ کی دعوت کے آغاز میں آپ سے دوری اختیار نہیں کی، لیکن جب آپ نے ان کے طواغیت کا ذکر کیا تو وہ دور ہو گئے۔

غالبًا اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو دیکھا کچھ لوگ بتوں کو سجدہ کر رہے ہیں۔ آپ نے انہیں اس سے منع کیا اور کہا کہ تم لوگوں نے تو اپنے باپ ابراہیم کے مذہب کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کا ان لوگوں نے وہی جواب دیا جو دنیا کی ہر مشرک قوم دیتی ہے کہ ہم تو محض اس لیے ان کی عبادت کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں۔ آپ نے ان کے اس خیال پر تنقید کی اور اسے غلط اور باطل ٹھہرایا۔[۳]

اسی قسم کی تنقیدیں تھیں جو آپ کی مخالفت کا سبب بن گئیں۔ بعثت کے چوتھے سال دعوت عام کا آغاز ہوا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ایک ہی سال بعد یا بعثت کے پانچویں سال میں آپ کی مخالفت میں شدت آ گئی۔[۴]

۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۰۱
۲۔ طبری، تاریخ الامم والملوک: ۱/ ۵۴۶
۳۔ زرقانی، شرح المواهب اللدينة: ۱/ ۴۶۲۔ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۱/ ۴۶۱
۴۔ زرقانی، شرح المواهب اللدنية: ۱/ ۴۶۲

ابوطالب کی حمایت

ان نازک حالات میں اللہ تعالیٰ نے خاص نصرت فرمائی اور آپ کے چچا ابوطالب کو آپ کی حمایت میں کھڑا کر دیا۔ ابوطالب بنو ہاشم کے سردار تھے۔ ان کے ساتھ پوری جمعیت تھی اور قریش کے سب ہی قبائل میں ان کی شخصیت کا احترام پایا جاتا تھا، اس وجہ سے آپ کی اور آپ کی دعوت کی شدید مخالفت کے باوجود کسی کو آپ کے خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کی حمایت سے فائدہ اٹھایا اور منکرین و معاندین کی پروا کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے دین کو علی الاعلان پیش کرنے اور اس کی طرف دعوت دینے میں ہمہ تن لگ گئے۔ ابن ہشام کا بیان ہے:

و حدب علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عمه ابوطالب، و منعه وقام دونه، و مضی رسول اللّٰہ ﷺ علی امر اللّٰہ، مظهرا لأمره لاَ یرد عنه شيء[1]

(اس موقع پر) رسول اللہ ﷺ پر آپ کے چچا ابوطالب مہربان ہو گئے اور آپ کی حفاظت کی اور آپ کی تائید میں کھڑے ہو گئے (اس کے نتیجے میں) رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم (تبلیغ دین) کو اظہار و اعلان کے ساتھ جاری رکھا۔ کوئی چیز آپ کو اس سے روکتی نہیں تھی۔

علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں:

فلما دعا قومه الی دین اللّٰہ نابذوه فأجاره عمه ابوطالب ومنع منه قریشاً لأنهم أرادوا قتله لما دعاهم الیه من ترک ما کانوا علیه هم واٰباؤهم و مفارقته لهم فی دینه وتسفیه أحلامهم فی عبادة أصنام

جب آپ نے اپنی قوم کو دین کی دعوت دی تو وہ دشمنی پر اتر آئے اور آپ سے الگ ہو گئے۔ اس وقت آپ کے چچا ابوطالب نے آپ کو پناہ دی اور قریش کو آپ پر دست درازی سے روک دیا۔ کیوں کہ وہ آپ کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ آپ ان کو اس بات کی دعوت دے رہے تھے کہ وہ اور ان کے باپ دادا جس طریقے پر رہے ہیں اسے ترک کر دیں اور آپ نے اپنے دین کے

---

[1] سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۳۰۱

لاَ تبصر و لاَ تسمع و لاَ تضر ولاَ تنفع[1]	معاملہ میں ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور انہیں ناسمجھ اور نادان بتا رہے تھے کہ وہ بتوں کی پرستش کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں۔ جو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔

وقت کے ساتھ آپ کی تبلیغی مساعی میں روز بہ روز اضافہ ہونے لگا، شرک، اصنام پرستی، اس کی نامعقولیت اور مشرکین کے طرز حیات پر آپ کی تنقید میں شدت آتی چلی گئی اور مشرکین کو صاف محسوس ہونے لگا کہ اپنے عقائد و نظریات کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کسی نرم رویہ یا مصالحت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

قریش نے ابوطالب کو رسول اللہ ﷺ کی پشت پناہی سے باز رکھنے کی متعدد کوششیں کیں۔ بعض اوقات ابوطالب ان سے متاثر بھی ہوئے، لیکن ہزار مخالفت کے باوجود آپ کی حمایت جاری رکھی۔ ایک مرتبہ قریش کے بڑے بڑے سردار ابوطالب کی خدمت میں پہنچے اور کہا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کا بھتیجا ہمارے معبودوں پر تنقیدیں کرتا ہے، ہمارے دین میں نقص نکالتا ہے، ہمیں ناسمجھ اور بے وقوف بتاتا ہے، ہمارے باپ دادا کو گم راہ قرار دیتا ہے، اب آپ اس کو ان حرکتوں سے باز رکھیے یا ہمارے اور اس کے معاملے میں دخل نہ دیجیے، ہم اس سے نمٹ لیں گے۔ ہمارا مطالبہ ناروا نہیں ہے۔ آپ کا دین بھی وہی ہے جو ہمارا دین ہے اور آپ بھی ہماری طرح اس کے طریقے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ ابوطالب نے ان کے غصہ کو ٹھنڈا کیا اور سمجھا بجھا کر انہیں لوٹا دیا۔ اس واقعہ کو بیان کر کے ابن سحاق کہتے ہیں:

و مَضٰی رسول اللّٰہ ﷺ علی ما هو علیه، یظهر دین اللّٰه، و یدعو الیه، ثم شری الأمر بینه و بینهم حتی تباعد الرجال و تضاغنوا و أكثرت قریش ذكر رسول اللّٰه ﷺ	رسول اللہ ﷺ نے اپنا کام جاری رکھا، اللہ کے دین کو واضح کرتے اور اس کی طرف دعوت دیتے رہے۔ پھر آپ کا اور مخالفین کا معاملہ سخت ہوگیا۔ یہاں تک کہ دونوں میں ایک دوسرے سے دوری پیدا ہوگئی اور عداوت ظاہر ہونے لگی۔ قریش نے

---
[1] الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (مقدمہ) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ۱/۱۴۱

بینھا فتذامروا فیہ و حض بعضھم بعضاً علیہ [1] کثرت سے آپ کا تذکرہ شروع کر دیا۔ آپ کی مخالفت اور دشمنی پر ایک دوسرے کو ورغلانے لگے۔

اس کے بعد سرداران قریش دوبارہ ابوطالب کے پاس پہنچے کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں، ہم سب کے درمیان آپ کو قدر و منزلت کا مقام حاصل ہے۔ ہم نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ اپنے برادر زادے کو اپنی تبلیغ سے باز رکھیں، لیکن آپ انہیں اس سے روک نہیں رہے ہیں۔ خدا کی قسم! ہم اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے باپ دادا کو ہدفِ ملامت بنایا جائے، ہمیں بے وقوف سمجھا جائے اور ہمارے معبودوں پر نکتہ چینی کی جائے۔ اب آپ انہیں ان باتوں سے روک دیں یا ہمارے اور آپ کے درمیان تلوار سے فیصلہ ہو جائے۔ اس دھمکی کا ابوطالب پر اثر ہوا اور وہ مخمصے میں پڑ گئے۔ ان کے لیے یہ بھی مشکل تھا کہ اپنی قوم کو چھوڑ دیں اور اس سے عداوت مول لیں اور وہ اس کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ آپ کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں اور آپ کو مخالفین کے حوالے کر دیں۔ ابوطالب نے رسول اللہ ﷺ کو صورت حال کی نزاکت سمجھانی چاہی۔ چنانچہ ان لوگوں کے جانے کے بعد آپ کو بلا کر اس گفتگو کی تفصیل سنائی اور کہا: بیٹے تم مجھ پر بھی رحم کھاؤ اور اپنے اوپر بھی۔ مجھ پر اتنا بار نہ ڈالو جسے میں اٹھا نہ سکوں۔

اس گفتگو سے رسول اللہ ﷺ نے محسوس کیا کہ ابوطالب آپ کی نصرت و حمایت میں پریشانی محسوس کر رہے ہیں اور آپ کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ دنیوی لحاظ سے جو سب سے بڑا سہارا تھا وہ ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔ آپ اس سے بالکل ہراساں نہیں ہوئے اور زبانِ مبارک سے عزم و ہمت کے وہ الفاظ نکلے جو اولوالعزم پیغمبروں ہی کی زبان سے نکل سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ”چچا جان! خدا کی قسم، اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی اس کام

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۰۲۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۷۳

سے باز نہیں آسکتا۔ اللہ تعالیٰ اس دین کو یا تو غالب کرے گا یا میں اسی کوشش میں ختم ہو جاؤں گا۔“

یہ الفاظ ادا کر کے آپ آب دیدہ ہو گئے اور اٹھ کر جانے لگے تو ابوطالب نے آواز دی۔ بھتیجے! ادھر آؤ۔ قریب آئے تو کہا: تم جس دین کی تبلیغ کر رہے ہو اسے جاری رکھو۔ خدا کی قسم، میں تمھیں کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔[1]

اس واقعہ کے بعد قریش کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ابوطالب اپنی قوم کو نظرانداز کر سکتے ہیں اور اس سے مخاصمت برداشت کر سکتے ہیں، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی حمایت سے دست کش نہیں ہو سکتے۔ ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہمارے اور اپنے بھتیجے کی راہ میں حائل نہ ہوں۔

انھوں نے ابوطالب کو ایک اور رخ سے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ عمارہ بن ولید کو ان کی خدمت میں لے گئے اور کہا: یہ قریش کا بہت ہی مضبوط اور خوب صورت نوجوان ہے۔ آپ اسے اپنی اولاد بنا لیجیے۔ یہ آپ کی نصرت وحمایت کرے گا اور کسی نے اسے ختم کر دیا تو آپ اس کی دیت کے وارث ہوں گے۔ اس کے عوض آپ اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دیں کہ ہم اسے اپنے راستے ہی سے ہٹا دیں، جس نے آپ کے اور آپ کے بزرگوں کے دین کی مخالفت شروع کر رکھی ہے، آپ کی قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے اور باپ دادا کو ناسمجھ اور بے وقوف کہہ رہا ہے۔ یہ ہمارا آپ سے کوئی ناجائز مطالبہ نہیں ہے، بلکہ ایک فرد کے بدلے میں دوسرے فرد کو حوالہ کرنے کی درخواست ہے۔

ابو طالب جہاں دیدہ اور دور بیں شخص تھے۔ انہوں نے کہا: خدا کی قسم، یہ بہت بری پیش کش ہے۔ تم اپنی اولاد اس لیے میرے حوالے کرو گے کہ میں اسے پالوں پوسوں اور اس کی پرورش کروں اور اس کے عوض میں اپنا بچہ تمہارے حوالے اس لیے کر دوں کہ تم اس کے خون سے اپنی پیاس بجھاؤ۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اس پر مطعم بن عدی نے کہا کہ

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۰۳۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۷۵

تمہاری قوم نے انصاف کی بات کہی ہے اور جس مصیبت سے تم خود بھی پریشان ہو اس سے نجات پانے کی یہ ایک اچھی صورت ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنی قوم کی کوئی بات ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہو۔ ابوطالب نے جواب دیا: یہ انصاف ہرگز نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ تم نے میرا ساتھ نہ دینے اور اپنی قوم کی حمایت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، لہٰذا جو تمہارا جی چاہے کرو[۱]

اس پورے عرصے میں اسلام کی دعوت آہستہ آہستہ عام ہو رہی تھی اور بعض نام ور شخصیتیں اسلام کی نعمت سے سرفراز ہو رہی تھیں۔ ان میں حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ بہت نمایاں ہیں۔

حضرت حمزہؓ کا قبولِ اسلام

حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا کی پہاڑی کے پاس تھے۔ ابوجہل کا ادھر سے گزر ہوا تو وہ آپ کے ساتھ بدزبانی اور آپ کی شان میں گستاخی اور آپ کے اور اسلام کے بارے میں سخت ناشائستہ زبان استعمال کرنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے بالکل سکوت اختیار کیا اور اس کے منھ آنا پسند نہیں فرمایا۔

عبداللہ بن جدعان کی ایک لونڈی یہ سب کچھ اپنے گھر سے دیکھ رہی تھی۔ اس بدتمیزی کے بعد ابوجہل کعبہ کے پاس قریش کی ایک مجلس میں جا کر بیٹھ گیا اور رسول اللہ ﷺ اپنے گھر واپس تشریف لے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد حضرت حمزہ، جو تیر و کمان سے مسلح تھے، واپس ہوئے۔ آپ کا معمول تھا، جب شکار سے لوٹتے تو سیدھے کعبۃ اللہ پہنچ کر طواف کرتے اور وہاں جو مجلسیں ہوتیں ان میں سے ہر مجلس میں پہنچ کر سلام کرتے اور تھوڑی دیر بات چیت کر کے گھر واپس ہو جاتے۔ عبداللہ بن جدعان کی لونڈی نے انہیں دیکھا تو کہا: اے ابوعمارہ (حضرت حمزہؓ کا لقب) کاش آپ وہ منظر دیکھتے جو ابھی پیش آیا۔

---

[۱] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۰۳-۳۰۴۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۷۵

ابوالحکم (ابوجہل کا خطاب) نے آپ کے بھتیجے محمد ﷺ کو کس قدر اذیت پہنچائی ہے۔ یہاں انہیں بیٹھے دیکھا تو بد زبانی شروع کر دی اور ایسی باتیں کرنے لگا جو انہیں ناگوار تھیں۔ محمد ﷺ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ سن کر حضرت حمزہؓ طیش میں آ گئے۔ اپنے معمول کے خلاف کسی مجلس میں نہیں گئے۔ سیدھے اس مجلس میں پہنچے جس میں ابوجہل تھا اور کمان اس زور سے اس کے سر پر ماری کہ وہ زخمی ہو گیا۔ پھر کہا: تم محمد ﷺ کو برا بھلا کہتے ہو، میں اس کے دین کو قبول کرتا ہوں اور جو باتیں وہ کہتا ہے وہی میں بھی کہتا ہوں، اگر ہو سکے تو میرا جواب دو۔ یہ دیکھ کر ابوجہل کے قبیلے (بنومخزوم) کے لوگ اس کی حمایت میں کھڑے ہو گئے اور کہا: تم صابی (بے دین) ہو گئے ہو۔ ابوجہل نے ان سے کہا: انہیں جانے دو۔ میں نے واقعی ان کے بھتیجے کو بہت سخت سست اور برا بھلا کہا ہے۔[1]

حضرت حمزہؓ کا یہ انتقامی اقدام اس وقت اسلام کی تائید اور نصرت میں نہیں، بلکہ خونی رشتہ کی حمایت اور حمیت میں تھا، لیکن ناروا نہ تھا۔ اسے مظلوم کی حمایت اور ظلم کا جواب بھی کہا جا سکتا ہے۔ روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ اس طرح جذباتی اسلام لانے پر شیطان نے انہیں وسوسے میں ڈال دیا کہ تم قریش کے سردار ہو اور ایک بے دین کے پیچھے اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ بیٹھے ہو۔ حضرت حمزہؓ سخت پیچ و تاب میں رہے اور رات اس بے چینی کے ساتھ گزاری کہ انہیں ایسی بے چینی کبھی نہیں رہی۔ دعا کی کہ اگر یہ حق ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دل کھول دے اور اگر غلط ہے تو اس سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا فرما دے۔ صبح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور اپنی پریشانی اور الجھن کا ذکر کیا اور کہا: مجھ جیسے آدمی کے لیے یہ صحیح نہ ہوگا کہ کسی ایسے معاملے میں جما رہوں جس کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ وہ حق ہے یا نہیں؟ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ مجھے کچھ تفصیل بتائیں۔ آپ نے انہیں تذکیر و نصیحت کی، خوف دلایا اور خوش خبری سنائی۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ایمان ڈال دیا۔ حضرت حمزہؓ نے کہا: میں

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۲۸-۳۲۹

گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے رسول ہیں۔ آپ اپنے دین کا اعلان کریں۔ قسم خدا کی، آسمان کے نیچے جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب مجھے مل جائیں تو بھی میں اپنے سابقہ دین کو پسند نہیں کروں گا۔[1]

حضرت حمزہؓ قریش کے بہت ہی طاقت ور اور مضبوط آدمی سمجھے جاتے تھے۔ کبھی کسی کے سامنے جھکتے نہیں تھے۔ انہوں نے بغیر کسی خوف کے اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا اور کھل کر رسول اللہ ﷺ کی حمایت کی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں:

فلما أسلم حمزة عرفت قريش ان رسول الله ﷺ قد عزّوا متنع و ان حمزة سيمنعه، فكفّوا عن بعض ما كانوا ينالون منه[2]

جب حضرت حمزہؓ اسلام لے آئے تو قریش سمجھ گئے کہ رسول اللہ ﷺ کو قوت حاصل ہو گئی ہے اور آپ محفوظ ہو گئے ہیں اور حمزہ ان کی مدافعت کریں گے۔ چناں چہ بعض ان حرکتوں سے، جو آپ کی شان میں وہ کرتے تھے، باز آ گئے۔

حضرت عمرؓ اسلام کے دائرے میں

حضرت عمرؓ کا اسلام لانے سے قبل اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بڑا سخت رویہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی یہ دلی خواہش تھی کہ ان جیسا مضبوط آدمی اسلام کو مل جائے۔ آپ نے دعا فرمائی تھی:

اللهم أعز الاسلام بأحب هذين الرجلين اليك بعمر بن الخطاب أو بأبى جهل بن هشام[3]

اے اللہ! ان دو آدمیوں میں سے جو تجھے زیادہ محبوب ہے اس کے ذریعہ سے اسلام کو تقویت دے۔ عمر بن الخطاب یا ابوجہل۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی تھی:

اللّٰهم أعز الاسلام بعمر[4]

اے اللہ! عمر کے ذریعہ اسلام کو تقویت دے۔

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۴۶۔ زرقانی، شرح المواہب اللدنیۃ: ۱/ ۴۷۸۔

[2] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۲۹

[3] ترمذی، ابواب المناقب، مناقب أبی حفص عمر بن الخطاب۔ مسند احمد: ۲/ ۹۵۔ طبقات ابن سعد: ۳/ ۲۶۹

[4] حاکم، المستدرک: ۳/ ۸۹۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی: اللّٰهم أيّد الدين بعمر بن الخطاب۔ حوالہ سابق

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف حضرت عمرؓ کے حق میں دعا کی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کو چار امتیازات سے نوازا۔ ان میں سے ایک امتیاز یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کے لیے دعا کی تھی۔

اللّٰھم أیّد الاسلام بعمر[۱] اے اللہ! عمر کے ذریعہ اسلام کی تائید فرما۔

ہوسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے پہلے ابوجہل اور حضرت عمرؓ دونوں کے لیے اور بعد میں صرف حضرت عمرؓ کے حق میں دعا فرمائی ہو۔[۲]

حضرت عمرؓ اسلام کے کتنے شدید مخالف تھے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

ام عبداللہ بنت ابوحثمہ[۳] کہتی ہیں کہ ہم حبشہ ہجرت کی تیاری کر رہے تھے۔ میرے شوہر عامر کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے کہ عمر بن خطاب، جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے اور حالت شرک پر قائم تھے، ہمارے ساتھ بھی ان کی سختی جاری تھی۔ ہمارے گھر آئے اور مجھ سے کہنے لگے: اے ام عبداللہ! کیا اب مکہ چھوڑ ہی دینے کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: ہاں، خدا کی قسم، اللہ کی زمین میں کہیں بھی نکل جائیں گے، جب تک کہ کوئی بہتر صورت پیدا نہ ہو جائے۔ آپ لوگوں نے ہمیں اذیت پہنچائی ہے اور ہمیں مجبور و مقہور کر رکھا ہے۔ انہوں نے کہا: اچھا، اللہ تمہارا رفیق ہو اور چلے گئے۔ اس وقت میں نے ان کے اندر ایسی رقت دیکھی جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میرے خیال میں ہمارے مکہ چھوڑنے کے فیصلے سے وہ افسردہ اور دل گیر تھے۔

۱۔ مشکوٰۃ، کتاب المناقب، باب مناقب عمر بحوالہ مسند احمد

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ زرقانی علی المواہب اللدنیۃ: ۱/۵۰۲۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۴/۴۸۵-۴۸۶

۳۔ ان کا نام لیلیٰ تھا۔ قدیم الاسلام تھیں۔ حبشہ اور پھر مدینہ ہجرت کی۔ کہا جاتا ہے کہ خواتین میں سب سے پہلے مدینہ پہنچی تھیں۔ بعض حضرات نے ام سلمہؓ نام بتایا ہے۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/۳۰۳

جب میرے شوہر واپس ہوئے تو میں نے کہا: کاش آپ اس وقت عمر کی رقت اور غم کی کیفیت دیکھتے۔ انہوں نے کہا: کیا تم یہ توقع کرتی ہو کہ عمر اسلام لے آئیں گے۔ میں نے کہا: ہاں۔ اس پر انہوں نے کہا: وہ اس وقت تک اسلام نہیں لا سکتے جب تک کہ خطاب کا گدھا اسلام نہ لے آئے۔ اسلام کے خلاف حضرت عمرؓ کے سخت رویے کی وجہ سے انہیں مایوسی تھی۔[1]

حضرت عمرؓ کے اسلام کے سلسلے میں مختلف روایات ملتی ہیں۔

بعض کتب حدیث میں خود ان کا بیان نقل ہوا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی مزاحمت کرنے اور آپ کو تکلیف پہنچانے کے ارادے سے نکلا۔ میں نے دیکھا کہ آپ مجھ سے پہلے مسجد حرام میں پہنچ چکے ہیں۔ میں آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ آپ سورۃ الحاقہ پڑھنے لگے۔ میں قرآن کے اسلوب اور بیان سے حیرت اور تعجب میں پڑ گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ واقعی یہ شاعر ہیں، جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔ ابھی یہ خیال دل میں آیا ہی تھا کہ آپ نے یہ آیات پڑھیں:

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿٤٠﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾

(الحاقۃ: ۴۰-۴۱)

بے شک یہ ایک معزز فرشتہ کا (لایا ہوا) کلام ہے۔ یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ لیکن کم ہی تم ایمان لاتے ہو۔

میں نے کہا: یہ تو کاہن معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے تلاوت فرمائی:

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٣﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٤٦﴾ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٤٧﴾

(الحاقۃ: ۴۲-۴۷)

یہ کسی کاہن کا کلام نہیں ہے۔ تم کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اگر پیغمبر ہماری طرف کچھ جھوٹی باتیں گھڑ کر منسوب کرتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر ان کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی انہیں اس سے بچانے والا نہ ہوتا۔

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۸۰

اسی وقت اسلام میرے دل میں اتر گیا۔

حضرت عمرؓ کو جس واقعہ نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور جس کے نتیجے میں ان کو اسلام کی دولت نصیب ہوئی، اس کی تفصیل یہ ہے۔

حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت خطابؓ اور ان کے بہنوئی سعید بن زیدؓ ان سے پہلے اسلام لا چکے تھے۔ لیکن ان کی سختی کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر تلوار لیے ہوئے نکلے کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کا خاتمہ کردیں گے۔ راستے میں انہی کے خاندان کے ایک فرد نعیم بن عبداللہ النحام نے پوچھا: عمر! کہاں کا ارادہ ہے؟ کہا کہ میں اس بے دین محمد (ﷺ) کو ختم کر دینا چاہتا ہوں، جس نے قریش کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اور سب کو بے وقوف بتا رہا ہے۔ نعیم نے کہا: تم دھوکے میں ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ محمد ﷺ کو قتل کرنے کے بعد بنو عبد مناف تمہیں زمین پر چلنے کے لیے زندہ چھوڑ دیں گے۔ حضرت عمر نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی صابی ہوگئے ہو اور اپنا دین چھوڑ چکے ہو۔ اگر مجھے اس کا یقین ہوتا تو میں پہلے تمہیں تہِ تیغ کرتا۔ نعیم نے کہا پہلے اپنے گھر کے حالات کیوں نہیں ٹھیک کرتے؟ حضرت عمر نے کہا: کیا میرے گھر کا کوئی آدمی مسلمان ہو گیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: ہاں، خدا کی قسم تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی اور عمّ زاد بھائی سعید بن زید اسلام لا چکے ہیں اور محمد ﷺ کی پیروی انہوں نے اختیار کر لی ہے۔ جاؤ، پہلے ان کی خبر لو۔ یہ سنتے ہی حضرت عمر نے غصہ سے اپنے بہن اور بہنوئی کے گھر کا رخ کیا۔ وہ دونوں اپنے گھر میں حضرت خبابؓ سے سورۂ طٰہٰ پڑھ رہے تھے۔[1]

جب ان لوگوں نے حضرت عمرؓ کی آہٹ محسوس کی تو حضرت خبابؓ گھر کے

---

[1] مکہ میں جو صحابہ غریب اور نادار ہوتے، رسول اللہ ﷺ انہیں ان صحابہ کے حوالے کر دیتے جو صاحبِ حیثیت ہوتے۔ وہ انہیں کھانے میں اپنے ساتھ شریک رکھتے۔ حضرت سعیدؓ کے ذمہ بھی ایسے دو افراد تھے۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۴/ ۱۴۰

گوشے میں چھپ گئے۔ حضرت فاطمہ بن خطاب نے صحیفہ کو گود میں چھپا لیا۔ حضرت عمر جب گھر کے قریب پہنچے تو انھوں نے حضرت خبابؓ کے قرآن پڑھنے کی آواز سن لی تھی۔ انھوں نے پوچھا: یہ کیا گنگناہٹ تھی جو میں نے سنی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: کوئی خاص بات نہیں ہے۔ حضرت عمر نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگوں نے محمد (ﷺ) کا دین اختیار کر لیا ہے اور ان کی اتباع کر رہے ہو۔ یہ کہہ کر اپنے بہنوئی سعید بن زید کی طرف بڑھے اور بری طرح زدوکوب کرنے لگے۔ حضرت فاطمہ اپنے شوہر کو بچانے کے لیے لپکیں تو انہیں اس زور سے مارا کہ ان کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اس پر دونوں نے کہا: ہاں، ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں، اب آپ کا جو جی چاہے کیجیے۔ بہن نے غصہ سے کہا: (ایک روایت کے مطابق بہنوئی نے کہا) اگر حق آپ کے دین کے علاوہ کہیں اور ہے تو اس کا ساتھ دینا ہی چاہیے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ (میں شہادت دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے اور محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں)۔

جب حضرت عمر نے بہن کو خون آلود دیکھا تو ندامت محسوس کی۔ انہیں اندازہ ہوا کہ یہ لوگ پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ انھوں نے بہن سے کہا: جو صحیفہ تم پڑھ رہی تھیں لاؤ، دیکھوں کہ محمد (ﷺ) کون سا دین پیش کر رہے ہیں؟ حضرت عمر لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ بہن نے کہا: ڈر ہے کہیں، اس کی بے ادبی نہ ہو اور اسے آپ تلف نہ کر دیں۔ حضرت عمر نے قسم کھائی کہ پڑھنے کے بعد وہ اسے واپس کر دیں گے۔ بہن نے کہا: آپ شرک کی وجہ سے ناپاک ہیں اور اس کتاب کو پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ حضرت عمر اٹھے اور غسل (یا وضو) کیا۔ بہن نے صحیفہ دیا، جس میں سورۂ طٰہٰ تھی۔ اس کا ابتدائی حصہ پڑھتے ہی بول اٹھے کہ کتنا خوب صورت اور معزز کلام ہے۔ جب اس آیت پر پہنچے: اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾ (طٰہٰ: ۱۴) (میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر)۔

تو ایمان دل میں اتر گیا۔ کہا کہ مجھے بتاؤ کہ محمد ﷺ کہاں ہیں؟ یہ سنتے ہی حضرت خبابؓ جو گھر میں روپوش تھے باہر نکلے اور کہا: اے عمر! رسول اللہ ﷺ نے کل ہی دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر یا ابوجہل کے ذریعہ اسلام کی مدد فرما۔ تمہارے لیے خوش خبری ہے کہ آپ ﷺ کی دعا تمہارے حق میں قبول ہوگئی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت خبابؓ سے پوچھا کہ بتاؤ اس وقت محمد ﷺ کہاں ہیں؟ تا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام لے آؤں۔ حضرت خباب نے کہا کہ آپ صفا کے پاس فلاں مکان میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ حضرت عمر نے اپنی تلوار حمائل کی اور مکان پر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب حضرت عمر کی آواز سنی تو ایک شخص نے دروازہ کی جھریوں سے دیکھا اور گھبرا کر اطلاع دی کہ عمر تلوار لیے کھڑے ہیں۔ حضرت حمزہؓ نے کہا: انہیں آنے کی اجازت دی جائے۔ اگر اللہ نے ان کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا ہے تو وہ اسلام لے آئیں گے اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع کریں گے، لیکن اگر اللہ کی مرضی یہ نہیں ہے اور وہ کسی غلط ارادے سے آئے ہیں تو انہی کی تلوار سے ان کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: انہیں آنے دو۔ ایک شخص نے جا کر اجازت دی۔ رسول اللہ ﷺ نے کمرہ میں ان سے ملاقات کی۔ ان کی چادر اور تلوار کی میان پکڑ کر زور سے انہیں اپنی طرف کھینچا اور کہا: ابن خطاب! کس لیے آئے ہو؟ تم اس وقت تک باز نہ آؤ گے جب تک اللہ تعالیٰ ولید بن مغیرہ کی طرح تم پر بھی اپنا قہر نہ نازل کردے۔ حضرت عمرؓ نے کہا: میں تو اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤں اور اللہ کی طرف سے آپ جو دین پیش فرما رہے ہیں اس کی اتباع کروں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے تکبیر بلند کی، جس سے سب لوگ سمجھ گئے کہ حضرت عمرؓ اسلام لے آئے ہیں[1]۔

حضرت عمرؓ کا شمار قریش کے شرفاء میں ہوتا تھا اور اس وقت کے قبائلی نظام میں انہیں سفیر کی حیثیت حاصل تھی۔ قریش کے دو خاندانوں میں یا قریش اور غیر قریش

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۸۴-۳۸۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/ ۲۶۶-۲۲۹

کے درمیان کوئی نزاع یا جھگڑا ہوتا تو ان کے درمیان وہ سفارت کی خدمت انجام دیتے اور فخر و مباہات کا مقابلہ ہوتا تو ان کے نمائندے ہوتے[1]

حضرت عمرؓ بڑے طاقت ور اور دبدبے والے انسان تھے۔ قریش جس طرح اسلام لانے والوں کو اذیتیں پہنچا رہے تھے اس طرح حضرت عمرؓ پر ہاتھ اٹھانے کی آسانی سے ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد حضرت عمرؓ نے اسے پوشیدہ رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ کھل کر اس کا اعلان کیا، جس کسی نے مخالفت کی اس کا منہ توڑ جواب دیا۔ اسلام لاتے ہی انہوں نے سوچا، کون شخص ایسا ہے کہ اس سے میں اپنے اسلام قبول کرنے کا تذکرہ کروں تو مکہ میں وہ اس کا ہر طرف چرچا کر دے۔ کہا گیا: جمیل بن معمر الجمحی یہ کام کر سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں یہ دیکھنے کے لیے کہ آپ کیا کر رہے ہیں، آپ کے پیچھے پیچھے چلا۔ اس وقت میری عمر اتنی تھی کہ جو واقعات پیش آئے، انہیں سمجھ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ جمیل کے پاس پہنچے اور کہا: تمہیں معلوم ہے کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور محمد ﷺ کے دین میں داخل ہو چکا ہوں؟ جمیل نے یہ سنتے ہی بغیر کچھ کہے اپنے کپڑے سمیٹے اور سیدھے کعبہ کی طرف چل پڑا۔ حضرت عمرؓ بھی اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ جمیل کعبہ کے دروازے پر پہنچا۔ اس وقت لوگ حرم کعبہ کے اندر اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ وہ چلّایا: لوگو! عمر بے دین ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فوراً جواب دیا: یہ جھوٹا ہے، میں نے اسلام قبول کیا ہے اور اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اس پر مجمع لگ گیا اور لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے۔ آپ نے بھی اس کا تابڑ توڑ جواب دیا۔ یہاں تک کہ آپ تھک کے چور ہو گئے اور بیٹھ گئے۔ لوگ آپ کے سر پر کھڑے رہے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا: جو کچھ تم سے ہو سکے، کر گزرو، اے دشمنانِ خدا! اگر ہم تین سو ہوتے تو تمہیں

---

[1] ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۳/۲۳۵۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۴/۱۳۸

یہاں سے نکال باہر کرتے۔ اتنے میں ایک بزرگ شخص عمدہ لباس میں پہنچا۔ اس نے پوچھا: کیا ماجرا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا: عمر بے دین ہوگیا ہے۔ اس نے کہا: اس نے اپنے لیے ایک بات پسند کی اور اسے اختیار کرلیا ہے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ بنو عدی اس طرح عمر کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔ ہٹو، اسے جانے دو۔ اس کے بعد مجمع منتشر ہوگیا۔ ہجرت کے بعد میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ جس شخص نے اس وقت آپ کی حمایت کی تھی وہ کون تھا؟ آپ نے فرمایا: وہ عاص بن وائل سہمی تھا۔[۱]

خود حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جس روز میں اسلام لایا اس رات میں نے سوچا کہ مکہ میں حضور ﷺ کا جو سب سے بڑا دشمن ہو اسے اپنے اسلام لانے کی اطلاع دینی چاہیے۔ مجھے خیال آیا کہ ابوجہل سے بڑا دشمن کون ہوگا۔ چناں چہ سویرے اس کے گھر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابوجہل باہر نکلا اور دیکھتے ہی کہا: بھانجے، خوش آمدید، کیسے آنا ہوا؟[۲] میں نے جواب دیا: صرف یہ اطلاع دینے حاضر ہوا ہوں کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا ہوں اور ان کی تعلیمات کی تصدیق کرتا ہوں۔

---

[۱] یہ واقعہ بخاری میں مختصراً آیا ہے۔ ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاص بن وائل کی حمایت کسی دوسرے وقت کی تھی۔ عاص بن وائل سہمی کی حمایت کی وجہ یہ تھی کہ بنوسہم حضرت عمرؓ کے قبیلہ بنو عدی کے حلیف تھے۔ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر بن الخطاب۔ پورے واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۸۷۔ ذہبی تاریخ الاسلام، (السیرۃ النبویۃ) ۱/۱۷۶۔ نیز ملاحظہ ہو حاکم، المستدرک: ۳/۹۱

[۲] ابن ہشام اور بعض دوسرے اصحاب نے ابوجہل کو حضرت عمرؓ کا حقیقی ماموں کہا ہے، لیکن علامہ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کی ماں حنتمہ بنت ہاشم اس کی چچا زاد بہن تھیں۔ الاستیعاب: ۳/۳۳۵۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۵۵۔ اسد الغابۃ: ۴/۱۳۸

ابوجہل نے غصہ سے دروازہ بند کر لیا اور کہا: برا ہو تمہارا اور تمہاری اس اطلاع کا۔[۱]

حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کی وجہ سے صحابہ کرام کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ ان کو قریش کے مقابلہ میں ایک طرح کا سہارا مل گیا اور ان کا حوصلہ بڑھ گیا۔[۲]

علامّہ ابن جریر طبری نے ان دونوں کے اسلام لانے کے اثرات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

و كان (عمر) رجلا جلداً جليداً منيعاً، وكان قد اسلم قبل ذلك حمزة بن عبد المطلب، و وجد اصحاب رسول الله صلَّى الله عليه وسلَّم فى انفسهم قوة و جعل الاُسلام يفشو فى القبائل[۳]

حضرت عمرؓ مضبوط اور قوی آدمی تھے، ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا تھا۔ ان سے پہلے حمزہ بن عبدالمطلبؓ اسلام لا چکے تھے۔ ان کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے اپنے اندر قوت محسوس کی اور اسلام قبائل میں پھیلنے لگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

ما زلنا أعزة منذ أسلم عمر[۴]

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد ہم مضبوط اور قوی رہے۔

ابن ابي شیبہ اور طبرانی کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:

كان اسلام عمر عزاً و هجرته نصرًا و امارته رحمةً و اللّٰه ما استطعنا ان نصلى حول البيت ظاهرين حتّٰى أسلم عمر[۵]

حضرت عمرؓ کا اسلام لانا عزت و تقویت کا سبب بنا، ان کی ہجرت نصرت کا اور ان کا دورِ امارت رحمت کا ذریعہ ثابت ہوا۔ قسم خدا کی، حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہم کھل کر بیت اللہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔

---

[۱] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۸۷۔ حضرت عمرؓ نے ایک اور سردار کے گھر پہنچ کر بھی اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ اس نے بھی وہی رویہ اختیار کیا جو ابوجہل نے کیا۔ اس کے بعد جمیل کا واقعہ پیش آیا۔ ذہبی تاریخ الاسلام، (السیرۃ النبویۃ) ۱/ ۱۷۸۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ: ۴/ ۱۴۱

[۲] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۷۹-۲۸۰

[۳] طبری، تاریخ الامم والملوک: ۱/ ۵۴۹

[۴] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر بن الخطاب

[۵] ابن حجر، فتح الباری: ۷/ ۴۰۴۔ روایت کا آخری حصہ مستدرک حاکم میں بھی ہے: ۳/ ۹۰

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ ہم خانۂ کعبہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو انہوں نے مشرکین کا مقابلہ کیا۔ بالآخر انہوں نے اس کی اجازت دے دی، حضرت عمرؓ نے خود خانہ کعبہ میں نماز پڑھی اور ہم نے بھی پڑھی[۱]

حضرت صہیب بن سنان رومیؓ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو اسلام بالکل نمایاں ہوگیا اور علانیہ اس کی دعوت دی جانے لگی، ہم لوگ حلقے بنا کر خانۂ کعبہ کے اطراف بیٹھنے لگے، طواف شروع کردیا، جو لوگ ہمارے ساتھ سختی کرتے ان سے انتقام لیتے اور ان کی بعض باتوں کا جواب بھی دیتے تھے[۲]

حضرت عمرؓ کے اعلان و اظہارِ ایمان اور دعوتی تگ و دو کے بارے میں تاریخ کا بیان ہے:

و اتبع عمر المجالس الّتی کان یجلس فیھا فأظھر الُایمان غیر ھائب و لَا خائف[۳]	حضرت عمرؓ ان مجلسوں میں پہنچے جن میں وہ بیٹھا کرتے تھے اور بغیر کسی خوف اور اندیشہ کے اپنے ایمان کا اظہار کیا۔

بنو ہاشم کا مقاطعہ

جب قریش نے دیکھا کہ مسلمانوں کو حبشہ میں پناہ حاصل ہوگئی ہے، حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسی شخصیتیں اسلام کو مل گئی ہیں، اسلام مختلف قبائل میں پھیل رہا ہے اور اس کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے تو انہوں نے ایک طرف مسلمانوں پر زیادہ سختی شروع کردی اور وہ ان پر مزید ظلم و ستم ڈھانے لگے، دوسری طرف انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اب رسول اللہ ﷺ کو قتل ہی کر دیں گے۔ ابو طالب کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کو جمع کیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو ان کی گھاٹی (شعب ابی طالب[۴]) میں پہنچا دیں اور آپ کی حمایت میں کمر کس لیں۔ خاندان کے سب لوگ اس پر متفق

---

[۱] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/ ۲۷۰۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۸۰۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۳۲۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۴/ ۱۴۴

[۲] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/ ۲۶۹

[۳] دیار بکری، تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس: ۱/ ۳۳۵

[۴] شعب ابی طالب مکہ کی آبادی سے باہر تھی۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۲۵

ہوگئے۔ مسلمانوں نے اپنے دین وایمان کی وجہ سے اور جنھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا، انہوں نے خاندانی حمیت کی بنا پر اس کا ساتھ دیا۔ صرف ابولہب اس سے الگ رہا۔اس نے مشرکین کی حمایت کی۔

ان حالات میں ابوطالب کی تشویش بہت بڑھ گئی کہ جولوگ رسول اللہ ﷺ کی جان کے درپے ہیں کہیں وہ اپنے عزائم میں کام یاب نہ ہو جائیں۔

روایات تاریخ بتاتی ہیں کہ اس زمانے میں ابوطالب رسول اللہ ﷺ کی سخت حفاظت کرتے تھے۔ رات میں سونے کا وقت ہوتا تو آپ سے کہتے کہ آپ اپنے بستر پر لیٹ جائیں، تاکہ دشمن یہ سمجھیں کہ آپ اپنی جگہ آرام کر رہے ہیں۔ جب لوگ سو جاتے تو اپنے کسی لڑکے یا بھائی یا چچا کے لڑکوں میں سے کسی کو حکم دیتے کہ وہ آپ کے بچھونے پر لیٹ جائے اور آپ سے درخواست کرتے کہ اس کے بستر پر سو جائیں۔

ابوطالب کی قیادت میں بنو ہاشم اس طرح آپ کی حمایت میں کھڑے ہو گئے تو قریش نے ایک اور سخت وار کیا۔ انہوں نے مشترکہ طور پر بنو ہاشم کے مقاطعہ کا فیصلہ کیا اور ایک تحریر لکھی کہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب سے شادی بیاہ، لین دین یا تجارت کا معاملہ نہیں ہوگا۔ ان کی خوشی اور غم میں کوئی شریک نہیں ہوگا اور نہ کسی کی مسرت اور مصیبت میں انہیں شریک ہونے دیا جائے گا۔ ان سے کبھی صلح ہوگی اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کی نرمی روا رکھی جائے گی۔ اس معاہدے کی پابندی کا عہد وپیمان باندھا گیا اور اسے خانۂ کعبہ میں لٹکا دیا گیا، تاکہ معلوم ہو کہ یہ پکا معاہدہ ہے۔[1]

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۸۸۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۰۹۔ طبری، تاریخ الامم والملوک: ۱/۵۴۹۔ اس معاہدہ کو منصور بن عکرمہ بن ہاشم یا نضر بن حارث نے تحریر کیا تھا۔ ابن ہشام اور ابن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بددعا کی وجہ سے اس کے ہاتھ شل ہوگئے۔ اس تحریر کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ ام الحلاس بنت مخربہ کے پاس تھی، جو ابوجہل کی خالہ تھی۔ ابن سعد: ۱/۲۰۹۔ اس کی ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ خانہ کعبہ میں آویزاں کرنے سے پہلے شاید یہ تحریر ابوجہل کی خالہ کے پاس تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی نقل اس کے پاس رہی ہو۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۳۵

قریش کی طرف سے اس بائیکاٹ یا مقاطعہ کے نتیجہ میں بنو ہاشم کو سخت مشکلات سے گزرنا پڑا اور بڑی تکلیفیں انہوں نے اٹھائیں۔ قریش انہیں بازار تک پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ اگر باہر سے فروخت کے لیے غلّہ آتا تو جلدی سے خرید لیتے کہ بنوہاشم نہ خرید سکیں۔ بھوک سے بچوں کے تڑپنے اور بلبلانے کی آواز وادی سے باہر تک سنائی دیتی تھی۔ کوئی شخص کھل کر ان کی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ صلہ رحمی کے جذبے کے تحت کوئی ان کی مدد بھی کرتا تو بہت خاموشی سے اور پوشیدہ طور پر کرتا تھا[1]

ابن جریر طبری فرماتے ہیں:

فأقاموا علی ذٰلک من أمرھم سنتین أو ثلاثاً حتی جھدوا ان لاّ یصل الی أحد منھم شیٔ الاّ سراً مستخفیاً بہ من اراد صلتھم من شیٔ[2]

اس حال میں انہوں نے دو یا تین سال تک انہیں رکھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے کوشش کی کہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی چیز نہ پہنچنے پائے۔ سوائے اس کے کہ جو ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا چاہتا ہو خاموشی سے اور خفیہ طریقہ سے ان تک کچھ پہنچا دے۔

اسی زمانے کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ حکیم بن حزام بن خویلد اپنے غلام کے ساتھ جا رہے تھے۔ غلام گیہوں لیے ہوئے تھا، تاکہ ان کی پھوپھی خدیجہ بنت خویلدؓ کے پاس پہنچائے۔ حضرت خدیجہؓ بھی شعب ابی طالب میں محصور تھیں۔ راستے میں حکیم بن حزام کی ابوجہل سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ان سے الجھ گیا اور کہا: کیا تم بنو ہاشم کو غذا کا سامان پہنچا رہے ہو؟ خدا کی قسم، تم یہیں رکے رہو، میں مکہ میں تمہیں رسوا کر کے رہوں گا۔ اتنے میں ابو البختری آ گیا۔ اس نے پوچھا: کیا بات ہے؟ ابوجہل نے جواب

---

[1] ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۴۴-۴۵۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۲۰۹

[2] تاریخ الامم والملوک: ۱/ ۵۴۶۔ ابن ہشام کے الفاظ کسی قدر مختلف ہیں، مفہوم ایک ہے۔ السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۹۱۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ بعثت کے ساتویں سال محرم میں یہ لوگ شعب ابی طالب میں پہنچے اور تین سال رہے، طبقات: ۱/ ۲۰۹۔ ایک روایت دو سال کی بھی نقل کی ہے۔ ص ۲۱۰۔ غالباً تیسرا سال پورا نہیں ہوا۔ اس لیے کسی نے دو سال اور کسی نے تین سال کہا ہے۔

دیا: یہ بنوہاشم کو غلہ پہنچا رہا ہے۔ ابوالبختری نے کہا: اس کی پھوپھی کا گیہوں اس کے پاس تھا، اسے وہ دینے جا رہا ہے۔ کیا تم اسے اس سے منع کرو گے؟ اسے جانے دو۔ ابوجہل نے انکار کر دیا۔ اس پر بات بڑھی تو ابوالبختری نے اسے خوب زدوکوب کیا اور اونٹ کی ایک ہڈی سے اسے مار کر زخمی کر دیا۔ حضرت حمزہؓ قریب ہی سے دیکھ رہے تھے۔ قریش کو یہ بات ناگوار گزر رہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کو اس کا علم ہو اور وہ خوشی منائیں۔

رسول اللہ ﷺ ان نازک حالات میں بھی جس طرح رات دن بے خوف و خطر اور اندیشۂ سود و زیاں سے بے نیاز ہوکر دعوت دین کا فریضہ کھل کرانجام دے رہے تھے، اس کا ذکر ابن ہشام نے ان الفاظ میں کیا ہے:

و رسول اللہ ﷺ علی ذلک یدعوقومه لیلاً و نهاراً و سراً و جهراً و مبادیاً بأمر اللّٰه لاَ یتقی فیه احداً من النَّاس[1]

اس سب کے باوجود رسول اللہ ﷺ اپنی قوم کو شب و روز پوشیدہ اور علانیہ اللہ کے دین کی دعوت دیتے اور اس کے احکام کھول کر بیان کر رہے تھے۔ اس معاملے میں کسی بھی شخص سے خوف نہیں کھا رہے تھے۔

ہشام بن عمرو بن الحارث العیمری نے اس دور میں بڑی مدد کی۔ اس کا بنو ہاشم سے ننھیالی رشتہ تھا اور وہ اپنی قوم میں بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ وہ رات میں اونٹ پر کھانے پینے کا سامان لادکر شعب ابی طالب کی طرف

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ:۱/۳۹۲۔طبری کے الفاظ اور واضح ہیں: **ورسول اللّٰه ﷺ فی کل ذلک یدعو قومه سراً و جهراً، آناء الیل و آناء النهار و الوحی علیه من اللّٰه تتابع بامره و نهیه و وعید من ناصبه العداوة و الحجج لرسول اللّٰه علی من خالفه.** تاریخ الامم والملوک:۱/۵۵۰ (رسول اللہ ﷺ ان حالات میں بھی اپنی قوم کو خفیہ اور علانیہ طور پر دن کے اوقات میں بھی اور رات کے اوقات میں بھی دعوت دے رہے تھے۔ اس دوران میں اللہ کی طرف سے آپ پر مسلسل وحی نازل ہورہی تھی جس میں اس کے اوامر و نواہی تھے۔ جو لوگ آپ سے عداوت کر رہے تھے ان کے لیے وعید تھی اور آپ کے مخالفین کے جواب میں دلائل تھے)۔

لے جاتا اور نکیل سے آزاد کر کے اسے وادی کی طرف ہانک دیتا۔ اونٹ وہاں پہنچ جاتا اور یہ سامان محصور لوگوں کے کام آتا۔ کسی موقع پر اسی طرح کپڑے پہنچا دیتا۔[۱]

مقاطعہ ختم ہوا

جب اس طرح دو سال گزر گئے اور تیسرا سال شروع ہوگیا تو قریش کے بعض افراد کو، خاص طور پر ان لوگوں کو جن کا ننھیالی رشتہ بنو ہاشم سے تھا، یہ احساس ہوا کہ یہ فیصلہ غلط ہوا۔ اس سے خونی رشتے متاثر ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق تلف ہو رہے ہیں اسے ختم ہوجانا چاہیے۔[۲]

اس معاہدہ کو ختم کرانے میں سب سے اہم رول اسی ہشام بن عمرو بن الحارث العیمری نے انجام دیا۔ وہ زہیر بن ابی امیہ کے پاس گیا اور کہا: زہیر! بتاؤ کیا تمہیں یہ بات اچھی لگتی ہے کہ تم کھاؤ پیو، تمہارے یہاں شادی بیاہ بھی ہو اور تمہارے سب ہی ماموں اس حال میں پڑے رہیں جس سے تم واقف ہو کہ ان کے ساتھ نہ خرید وفروخت ہو رہی ہے اور نہ ان سے شادی بیاہ کا معاملہ ہو رہا ہے؟ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ابوالحکم (ابوجہل) کے ماموؤں کا معاملہ ہوتا اور اسے اس طرح کے مقاطعہ کے لیے کہا جاتا تو وہ کبھی اس کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ زہیر نے کہا: بتاؤ، میں تنہا اس میں کیا کر سکتا ہوں؟ اگر میرے ساتھ کوئی اور ہوتا تو میں کھڑا ہوتا اور اسے چاک کر کے رکھ دیتا۔ ہشام نے کہا: ایک اور شخص تمہارے ساتھ ہے۔ اس نے دریافت کیا: وہ کون؟ زہیر نے کہا: میں خود تمہارے ساتھ ہوں۔ اس نے کہا: اچھا تو ایک تیسرے کو تلاش کرلو۔

۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۱۲۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۶۷

۲۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: **فلما کان رأس ثلاث سنین تلاوم رجال من بنی عبد مناف و من قصی و رجال من سواهم من قریش قد ولدتهم نساء هن من بنی هاشم و رأواانهم قد قطعوا الرحم و استخفوا بالحق۔** السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۴۴۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ص ۴۶۔ ذہبی، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۲۲۲۔ یعنی تیسرے سال کے شروع میں بنوعبدمناف اور قصی بن کعب کے بعض افراد اور ان کے علاوہ قریش کے کچھ لوگ، جن کی مائیں بنو ہاشم کی تھیں، ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان سے قطع رحم اور حق تلفی کا ارتکاب ہوا ہے۔

اس کے بعد وہ مطعم بن عدی کے پاس گیا اور کہا: کیا تم اسے پسند کرتے ہو کہ بنو عبد مناف کی دو شاخیں ختم ہو جائیں اور تم اسے دیکھتے اور قریش کی موافقت کرتے رہو۔ قسم خدا کی، اگر انہیں موقع دو گے تو وہ انہیں ختم کر کے رکھ دیں گے۔ مطعم نے کہا: بھلا ہو تمہارا، بتاؤ تنہا میں کیا کروں؟ اس نے کہا: تمہارے ساتھ دوسرا بھی ہے۔ مطعم نے دریافت کیا: وہ کون؟ ہشام نے کہا: میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس نے کہا: ایک تیسرا شخص بھی تلاش کر لو۔ اس نے جواب دیا: میں یہ کام کر چکا ہوں۔ اس نے پوچھا: وہ کون ہے؟ کہا: زہیر بن ابی امیہ۔ اس نے کہا: اچھا چوتھے شخص کو تلاش کرو۔

اب ہشام، بختری بن ہشام کے پاس پہنچا اور مطعم بن عدی سے جو بات کہی تھی وہی اس سے بھی کی۔ اس نے پوچھا: اس معاملے میں تمہاری مدد کے لیے کوئی تیار بھی ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں! اس نے پوچھا: وہ کون ہے؟ اس نے بتایا: زہیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی اور میں خود تمہارے ساتھ ہوں۔ اس نے کہا: اچھا تو پانچویں فرد کو تلاش کرو۔

اس کے بعد اس نے زمعہ بن اسود سے بات کی، بنو ہاشم کی قرابت اور ان کے حق کا ذکر کیا۔ اس نے بھی پہلے یہی سوال کیا کہ جس کام کے لیے تم مجھ سے کہہ رہے ہو، کیا اس میں کوئی ساتھ دے گا؟ اس نے کہا: ہاں۔ پھر ان سب کے نام بتائے جن سے وہ گفتگو کر چکا تھا۔

یہ لوگ باہم مشورہ سے رات میں مکہ کے بالائی مقام حجون میں جمع ہوئے اور طے کیا کہ اس صحیفہ کے مسئلہ کو چھیڑیں گے اور اسے ختم کریں گے۔ زہیر نے کہا: سب سے پہلے میں بولوں گا۔ صبح ہوئی تو یہ لوگ حرم میں جہاں قریش کی مجلس جمتی تھی، پہنچے۔ زہیر نے صاف ستھرے لباس میں طواف کیا، اس سے فارغ ہو کر لوگوں سے خطاب کیا: اے اہلِ مکہ! کیا ہم کھائیں پیئیں، پہنیں اوڑھیں اور بنو ہاشم ہلاک ہوں کہ انہیں خرید و فروخت کی بھی اجازت نہیں ہے۔ قسم خدا کی، میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک

یہ ظالم اور رشتوں کو قطع کرنے والا صحیفہ چاک نہ کر دیا جائے۔

ابو جہل کعبہ کے ایک گوشے میں تھا۔ اس نے کہا: تم جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ صحیفہ چاک نہیں ہوگا۔ زمعہ بن اسود نے کہا: سب سے بڑے جھوٹے تو تم ہو۔ جب یہ لکھا گیا اس وقت بھی ہم اس سے خوش نہیں تھے۔ ابوالبختری نے زمعہ کی تائید کی کہ یہ سچ کہہ رہے ہیں، ہم بھی اس سے خوش نہیں ہیں اور اسے تسلیم نہیں کرتے۔ مطعم بن عدی نے آواز بلند کی کہ تم دونوں صحیح کہہ رہے ہو اور جو اس کے خلاف بولتا ہے، غلط بولتا ہے۔ میں اس صحیفہ سے اور اس کے مضمون سے براءت کا اعلان کرتا ہوں۔ ہشام بن عمرو نے اس کی تائید کی۔

ابو جہل نے چاروں طرف سے ایک ہی بات سن کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فیصلہ رات میں کسی جگہ آپس میں مشورہ کے بعد ہو چکا تھا۔

ابوطالب مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ مطعم اس صحیفہ کو پھاڑنے کے لیے آگے بڑھا تو دیکھا، دیمک اسے کھا چکی ہے، سوائے **باسمک اللّٰھم** کے الفاظ کے[1]

ایک روایت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوطالب سے کہا کہ اللہ کے حکم سے اس صحیفہ کو دیمک لگ گئی ہے۔ اس میں جہاں کہیں اللہ کا نام تھا وہ تو باقی رہ گیا ہے اور ظلم و زیادتی، قطع رحم اور جھوٹ اور بہتان کے جو الفاظ تھے وہ سب مٹ گئے ہیں۔ ابوطالب نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا اللہ نے تمھیں اس کی خبر دی ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں؟ اس کے بعد ابوطالب قریش کے پاس گئے اور کہا کہ میرے بھتیجے نے صحیفہ کے بارے میں یہ کچھ بتایا ہے۔ لاؤ دیکھیں، اگر اس کی بات صحیح نکلے تو اس قطع رحم سے باز آجاؤ اور صحیفہ کو ختم کرو۔ اگر اس کی بات غلط نکلے تو میں اسے تمہارے حوالے کر دوں گا۔

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۱۲-۴۱۴۔ابن سعد نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے کہ صحیفہ کو دیمک چاٹ گئی تھی، صرف 'باسمک اللّٰھم' کے الفاظ باقی رہ گئے تھے۔ طبقات: ۱/ ۲۰۹-۲۱۰

جب صحیفہ دیکھا گیا تو آپ کی بات صحیح نکلی، لیکن قریش بائیکاٹ ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے، بلکہ ان کی مخالفت اور شدید ہوگئی۔

اس کے بعد صحیفہ کو ختم کرنے کے سلسلہ میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے[1]

اس واقعہ کی اور بھی تفصیلات ملتی ہیں۔ ان میں بعض باتوں میں کسی قدر اختلاف ہے۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ جب صحیفہ کے متعلق رسول اکرم ﷺ کی بات صحیح نکلی تو قریش کے ہوش اڑ گئے اور وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ اس پر ابوطالب نے کہا کہ جب حقیقت واضح ہوگئی ہے تو آخر اس قید وبند کا کیا جواز ہے؟ پھر ابوطالب اور آپ کے ساتھیوں نے کعبہ اور غلاف کعبہ کے درمیان پہنچ کر دعا کی: ''اے اللہ! جو لوگ ہم پر ظلم و زیادتی کر رہے ہیں، خونی رشتے ختم کر رہے ہیں اور وہ رویہ اختیار کر رہے ہیں جو ان کے لیے جائز نہیں ہے، ان کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔'' یہاں سے یہ لوگ پھر وادی میں چلے گئے۔

اس کے بعد قریش کے بعض لوگوں کو اس صورت حال پر افسوس ہوا اور وہ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ ان میں مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن اسود، ابوالبختری بن ہاشم اور زہیر بن ابی امیہ شامل تھے۔ یہ لوگ مسلح ہوکر بنو ہاشم اور بنوعبد المطلب کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ لوگ اپنے گھروں کو واپس چلیں۔

اس واقعہ سے قریش نے سمجھ لیا کہ یہ لوگ بنو ہاشم کو ان کے حوالے نہیں کریں گے[2]

اس صحیفہ یا تحریر کا جو حصہ باقی رہ گیا اور جو مٹ گیا اس کے متعلق ایک دوسری

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۱۵

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۲۱۰

روایت بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس میں جہاں کہیں اللہ کا نام تھا دیمک نے اسے محو کر دیا اور شرک، ظلم اور قطع رحم سے متعلق جو حصہ تھا اسے چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اس کی خبر دی۔ آپؐ نے ابوطالب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے ستاروں کی قسم کھا کر کہا کہ اس نے مجھ سے غلط نہیں کہا ہے۔ اب ابوطالب اپنے لوگوں کو لے کر قریش کی مجلس میں گئے۔ قریش نے سمجھا کہ یہ لوگ مقاطعہ اور اس سے درپیش مشکلات سے پریشان ہو گئے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو شاید ان کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ ابوطالب نے ان سے کہا: ہمارے اور تمہارے درمیان بہت سی باتیں ہوئی ہیں۔ میں ان کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ اپنا صحیفہ لاؤ۔ شاید ہمارے درمیان صلح کی کوئی صورت نکل آئے۔ وہ لوگ بخوشی صحیفہ لے آئے اور ابوطالب سے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ لوگ ہماری بات مان لیں اور ایسا رویہ اختیار کریں جس سے آپ کی قوم ایک ہو سکے۔ یہ ایک شخص ہے جس نے ہمارے آپس کے تعلقات قطع کرا دیے اور آپ کی پوری قوم کو ہلاکت او رتباہی تک پہنچا دیا ہے۔

ابوطالب نے کہا کہ میں بالکل انصاف کی بات تمہارے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ میرے بھتیجے نے مجھے بتایا ہے اور اس کی بات غلط نہیں ہوتی کہ اللہ نے تمہارے اس صحیفہ سے براءت کا اظہار کیا ہے۔ اس میں اس کا نام جہاں کہیں تھا اسے محو کر دیا ہے اور دھوکے، فریب، قطع رحم اور ظلم و زیادتی کی جو عبارت تھی اسے چھوڑ دیا ہے۔ اگر اس کی بات صحیح ہے تو سوچ لو۔ خدا کی قسم، اس صورت میں جب تک ہم میں کا ایک بھی فرد زندہ ہے، ہم اسے تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ لیکن اگر اس نے جو کہا ہے وہ غلط نکلے تو ہم اسے تمہارے حوالے کیے دیتے ہیں۔ چاہے تم اسے قتل کر و یا زندہ رہنے دو۔ انہوں نے کہا: ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ جب صحیفہ کھولا گیا تو آپ کی بات صحیح نکلی، لیکن مخالفین اپنی بات سے مکر گئے اور کہنے لگے کہ تمہارے آدمی نے جادو کر دیا ہے[1]

---

[1] ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۴۴-۴۶

قریش نے اسلام کی راہ روکنے کی جو زبردست کوشش کی اسے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ذریعہ ناکام کر دیا جو اسلام کو اس کا دین نہیں مانتے تھے، جن کا دین و مذہب وہی تھا جو مخالفین کا تھا۔ ایک طرف آپ کا خاندان ابوطالب کی قیادت میں کھڑا ہوگیا اور پوری قوت سے اس نے آپ کا دفاع کیا، آخر وقت تک آپ کی حفاظت کی، نہ تو کسی دباؤ کو قبول کیا اور نہ آپ کی حمایت سے دست بردار ہوا اور آپ کی خاطر قید و بند کی شدید تکلیف برداشت کی، دوسری طرف بعض غیر مسلم سردارانِ قبائل ہی نے اس قید و بند اور مقاطعہ کو ختم کرایا، جس میں آپ، آپ کے خاندان کے اہلِ ایمان، بلکہ پورا خاندانِ بنو ہاشم گرفتار تھا۔ انہوں نے، جیسا کہ بعض روایات بتاتی ہیں، نہ صرف یہ کہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی، بلکہ طاقت کے زور سے اسے ختم کرا کے چھوڑا۔

ابوطالب اور خاندان بنو ہاشم کی اس حمایت کے پیچھے بظاہر قبائلی تعصب کارفرما تھا۔ اسی تعصب کی بنا پر بعض ذمہ دارانِ قریش نے بنو ہاشم کے مقاطعہ کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کوششوں سے حالات کو ٹھیک کرنے میں مدد ملی، اس لیے ان کی مخالفت نہیں کی گئی اور کار دعوت تمام تر مشکلات کے باوجود جاری رہا۔

یہ واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو ایسی صورتیں پیدا کر سکتا ہے کہ اسلام کو نہ ماننے والے بھی نازک وقت میں اس کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں اور ظلم و عدوان کو ختم کرنے میں اپنا رول ادا کریں۔

(سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ، جنوری-مارچ ۲۰۰۰ء)

☆☆☆

مواخاتِ مکہ

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرائی تھی اور ایک دوسرے کو بھائی بنایا تھا۔ یہ مواخات وسیع پیمانے پر تھی اور دونوں طرف سے نوّے یا سو افراد اس میں شریک تھے۔[1]

ہجرت سے قبل مسلمانوں کے درمیان مواخات

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ میں جو لوگ مسلمان ہو رہے تھے ان کے درمیان بھی آپ نے اسی طرح کی مواخات کرائی تھی۔ چناں چہ حضرت زبیرؓ، جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور جن کا شمار السابقون الاولون میں ہے، ان کے بارے میں ان کے صاحب زادے عروہؒ بیان کرتے ہیں:

كان رسول الله ﷺ آخى بينه و بين ابن مسعود[2]	رسول اللہ ﷺ نے زبیر اور عبد اللہ بن مسعود کے درمیان مواخات کرائی تھی۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے:

آخى رسول الله ﷺ بين زبير بن	رسول اللہ ﷺ نے زبیر بن العوام اور عبداللہ

---

[1] یہ مواخات جن لوگوں کے درمیان ہوئی تھی اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۲/۱۲۴-۱۲۶۔ ابن عبد البر: الدرر فی اختصار المغازی و السیر: ص۹۶-۱۰۰۔ (یہاں مواخاتِ مدینہ سے بحث نہیں ہے)۔

[2] حاکم، المستدرک: ۳/۳۶۰۔ امام ذہبی نے مستدرک کی تلخیص میں اس کی سند پر کوئی جرح نہیں کی ہے۔

العوام و عبد اللّٰہ بن مسعود[1] بن مسعود کے درمیان مواخات کرائی تھی۔

عمرۃ القضا کا واقعہ ہے کہ حضرت علی، حضرت جعفر اور حضرت زید رضی اللہ عنہم تینوں ہی حضرت حمزہؓ کی بچی کی پرورش کرنا چاہ رہے تھے اور ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ وہ دوسرے سے زیادہ اس کا حق دار ہے۔اس موقع پر حضرت زیدؓ نے اپنے دعوے کے حق میں دلیل دی۔'بنت اخی' کہ یہ میرے بھائی کی لڑکی ہے۔ (اس وجہ سے مجھے اس کی پرورش کا سب سے زیادہ حق ہے)۔[2]

اس سے ان کی مراد اسی اخوت سے ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ان کے اور حضرت حمزہؓ کے درمیان کرائی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اس واقعہ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

کان زید مواخیًا لحمزۃ، اٰخی بینھما رسول اللّٰہ ﷺ[3] حضرت زید کی حضرت حمزہ سے مواخات تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان مواخات کرائی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی سے ایک اور روایت آتی ہے:

ان النبی ﷺ کان اٰخی بین حمزۃ و زید بن حارثۃ[4] نبی ﷺ نے حضرت حمزہ اور زید بن حارثہ کے درمیان مواخات کرائی تھی۔

یہ روایت گو سنداً ضعیف ہے، لیکن اوپر کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔[5]

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ مواخات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر، حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہم) کے مابین مواخات کرائی۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا: آپ نے

---

[1] اس روایت کے بارے میں امام حاکم فرماتے ہیں: 'صحیح الاسناد'۔امام ذہبی کہتے ہیں: 'صحیح'، المستدرک مع التلخیص : ۳/ ۳۱۴۔ حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ فتح الباری: ۷/ ۲۷۰

[2] بخاری، کتاب المغازی، باب عمرۃ القضاء

[3] مسند احمد: ۱/ ۲۳۰

[4] فتح الباری: ۷/ ۳۵۵

[5] مدینہ میں جن لوگوں کے درمیان مواخات ہوئی تھی ان کے ذیل میں ابن ہشام (۲/ ۱۲۴) =

اپنے صحابہ کے درمیان مواخات کرائی ہے۔آج میرا بھائی کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ میں تمہارا بھائی بن جاؤں؟ حضرت علیؓ نے کہا: مجھے یہ بات کیوں نہ پسند ہوگی؟ آپ نے فرمایا: اچھا تم دنیا اور آخرت میں میرے بھائی ہو[1]

ان سب روایتوں میں مہاجرین کے درمیان مواخات کا ذکر ہے۔بظاہر یہ مواخات مکہ میں ہوئی تھی۔اس لیے کہ مدینہ میں مواخات مہاجرین کے درمیان نہیں، بلکہ مہاجرین اور انصار کے مابین ہوئی تھی اور ان دو مختلف جماعتوں کے درمیان اخوت اور بھائی چارگی کا رشتہ قائم کیا گیا تھا۔

علّامہ ابن عبدالبر حضرت زبیرؓ کے حالات میں لکھتے ہیں:

اٰخی رسول اللّٰہ ﷺ بینه و بین عبد اللّٰہ ابن مسعود حین اٰخی بین المهاجرین بمکة، فلما قدم المدینة اٰخی بین المهاجرین و الأنصار، اٰخی بین الزبیر و بین سلمة بن سلامة بن وقش[2]

رسول اللہ ﷺ نے جب مہاجرین کے درمیان مکہ میں مواخات قائم کرائی تھی تو حضرت زبیر اور عبداللہ بن مسعود کے درمیان بھی مواخات کرائی تھی۔ پھر جب آپ مدینہ تشریف لائے اور مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کی تو حضرت زبیر اور حضرت سلمہ بن سلامہ بن وقش کے درمیان مواخات کرائی۔

= نے حضرت زید اور حضرت حمزہ کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن علامہ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ مدینہ میں زید بن حارثہ کی مواخات اسید بن حضیر کے ساتھ ہوئی تھی۔ (الدرر: ص۹۷) یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ حضرت زید مہاجر تھے اور اسید بن حضیر انصاری۔ مدینہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرائی گئی تھی۔

[1] مستدرک حاکم: ۳/۱۴۔ امام ذہبی نے اس کی سند پر جرح کی ہے، لیکن اس کے باوجود، جیساکہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے، مذکورہ بالا روایتوں سے اس کی تقویت ہوتی ہے۔ فتح الباری: ۷/ ۱۹۲، ۱۹۳۔ اس روایت میں حضرت زبیر اور حضرت طلحہ کے درمیان مواخات کا ذکر ہے، لیکن صحیح روایت سے معلوم معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زبیر اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے درمیان مواخات ہوئی تھی۔

[2] ابن عبد البر، الأستیعاب فی معرفة الأصحاب: ۲/ ۹۰۔ ابن عبد البر سے پہلے مشہور مؤرخ بلاذری (۲۷۶ھ) نے مواخاتِ مکہ کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

مواخات دو مرتبہ ہوئی تھی

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مواخات دو مرتبہ ہوئی تھی۔ایک مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ ہجرت کے بعد مدینہ میں۔مکہ میں صرف مہاجرین کے درمیان مواخات ہوئی تھی اور مدینہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرائی گئی۔

علاّمہ ابن عبد البر اپنی ایک دوسری کتاب میں مواخاتِ مدینہ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

و قد کان رسول اللہ ﷺ اٰخی بین المہاجرین بعضھم و بعض قبل الھجرة علی الحق و المواساة ایضا	رسول اللہ ﷺ نے ہجرت مدینہ سے پہلے بھی مہاجرین کے درمیان حق (میں ایک دوسرے کی مدد) اور باہم غم خواری کے لیے مواخات کرائی تھی۔

وہ کہتے ہیں: اسی سلسلے میں آپ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر، حضرت حمزہ اور حضرت زید، حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت زبیر اور حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبادہ بن الحارث اور حضرت بلال، حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوعبیدہ اور حضرت سالم مولیٰ ابو حذیفہ، حضرت سعید بن زید اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ (رضی اللہ عنہم) کے درمیان مواخات کرائی تھی۔اس کے بعد فرماتے ہیں:

فلمّا نزل المدینة اٰخی بین المہٰجرین و الاُنصار[۱]	جب آپ مدینہ پہنچے تو مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرائی۔

اس طرح ابن عبد البر نے مواخات مکہ کا ذکر ہی نہیں کیا ہے، بلکہ متعین طور پر بتایا ہے کہ یہ مواخات کن افراد کے درمیان ہوئی تھی۔ بعد کے مصنّفین نے ان ہی کے حوالے سے اور بعض نے بغیر حوالہ کے یہی باتیں نقل کی ہیں۔کسی نے اختصار کے ساتھ اور کسی نے تفصیل سے۔اس سے گو ہماری معلومات میں خاص اضافہ نہیں ہوتا، البتہ ان سے ابن عبد البر کے بیانات کی تصدیق اور تائید ہوتی ہے۔[۲]

---

[۱] الدرر فی اختصار المغازی و السیر، ص ۱۰۰

[۲] ملاحظہ ہو عینی، عمدۃ القاری: ۸/ ۱۳۰۔قسطلانی نے ابن عبد البر کا نام لیے بغیر پوری تفصیل =

برہان الدین الحلبی نے اسے تاریخ کے ایک جانے پہچانے واقعہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

و المعروف المشهود ان المواخاة انما وقعت مرتين: مرة بين المهاجرين قبل الهجرة و مرة بين المهاجرين و الانصار بعد الهجرة، و الله اعلم[1]

معروف و مشہور یہی ہے کہ مواخات دو مرتبہ ہوئی۔ ایک مرتبہ ہجرت سے پہلے مہاجرین کے درمیان اور دوسری مرتبہ ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان۔ واللہ اعلم۔

مواخاتِ مکہ سے امام ابن تیمیہؒ کا انکار اور اس کی کم زوری

امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک مواخات، مدینہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان ہوئی تھی۔ مکہ میں مواخات سے انہوں نے انکار کیا ہے۔ خاص طور پر اس بات سے کہ حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ نے اور لوگوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے۔ میرا بھائی کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم میرے بھائی ہو۔ فرماتے ہیں: ''مواخات تو ایک دوسرے کے تعاون اور تالیفِ قلب کے لیے ہوئی تھی۔ مہاجرین کے درمیان مواخات سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔''

امام ابن تیمیہؒ کی اس رائے کی حافظ ابن حجرؒ نے تردید کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ تاریخی واقعات کے مقابلے میں قیاس ہے۔ مکہ میں جو مہاجرین (بعد میں انہوں نے ہجرت کی ہے، اس لیے انہیں مہاجر کہا گیا ہے) مالی اور خاندانی لحاظ سے بہتر

=نقل کی ہے۔ جن لوگوں کے درمیان مکہ میں مواخات ہوئی تھی، ان میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت علیؓ کی مواخات کا اضافہ کیا ہے۔ ارشاد الساری: ۶/ ۱۹۱، نیز ملاحظہ ہو برہان الدین حلبی السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۱۸۰۔ حافظ ابن حجر نے اس موضوع سے متعلق روایات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ فتح الباری: ۷/۱۹۱-۱۹۳

[1] السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۲۹۲

پوزیشن میں تھے، آپ نے ان کی مواخات ان مہاجرین سے کرائی جو ان کے مقابلے میں کم تر حیثیت میں تھے۔ جہاں تک حضرت علیؓ کا معاملہ ہے وہ تو بعثت سے پہلے بھی آپ ﷺ کی نگرانی میں تھے۔[1]

مواخاتِ مکہ کا مقصد

یہ ایک واقعہ ہے کہ جو لوگ مکہ میں مسلمان ہو رہے تھے، ان میں سے کچھ تو نوجوان تھے، جن کا دائرۂ اثر بہت محدود تھا، جن پر خاندان اور قبیلہ کی گرفت زیادہ سخت تھی اور جن کو معاشی استحکام حاصل نہیں تھا۔ان سے خراب حالت ان لوگوں کی تھی جن کے پیچھے خاندان اور قبیلہ کی کوئی طاقت ہی نہیں تھی اور جو محکومی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں بعض لوگ اپنے سن و سال، تجربہ، اثر و رسوخ، مالی حالت اور خاندان و قبیلہ کے لحاظ سے بہتر حیثیت میں تھے۔رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان مواخات قائم کر کے ان کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔ تا کہ ہر فرد اپنے بھائی کے دکھ درد میں شریک ہو، اس کی حفاظت کرے، اس کی مالی اور اقتصادی مدد کرے۔ پھر یہ کہ اس طرح کی مواخات کا اخلاقی فائدہ مادی فائدے سے زیادہ اہم ہے۔ اس سے آپس میں الفت و محبت کا اضافہ ہوتا ہے، ایک دوسرے کی دل جوئی اور دل جمعی ہوتی ہے، مشکلات میں ہمت بندھتی اور سہارا ملتا ہے۔ مواخاتِ مدینہ میں بھی یہ مقصد پیش نظر رہا ہے۔

---

[1] فتح الباری:۷/۲۹۰

(ماہ نامہ زندگی رام پور، جون ۱۹۷۸ء)

ہجرتِ حبشہ

مکہ میں اسلام کی دعوتِ عام شروع ہوئے ابھی دو ہی سال گزرے تھے کہ فضاؤں میں ارتعاش پیدا ہو گیا ،ایک ہلچل سی مچ گئی اور دعوت کو جاری رکھنا دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا گیا۔ جو اصحاب اسلام قبول کر رہے تھے ان کے لیے زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تنگ ہونے لگی۔ ان حالات میں رسول اللہ ﷺ نے جو اہم اور دور رس اقدامات کیے ان میں سے ایک اہم اقدام یہ تھا کہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو حبشہ ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا۔ یہ بعثت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے۔[1]

ہجرتِ حبشہ اسلام کی دعوت کی راہ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے اسے قدرے تفصیل سے پیش کیا جا رہا ہے۔

ملک حبشہ

حبشہ ایک بڑی سلطنت تھی۔اس کے حدود دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں:

ملک حبشہ یمن کے مغربی جانب واقع ہے۔اس کی مسافت کافی طویل ہے۔ یہ کئی اجناس (قوموں) پر مشتمل ہے۔ سوڈان کے تمام فرقے حبشہ کے بادشاہ کی

---

[1] علامہ ابن اثیر کہتے ہیں: و کان مسیرھم (ای الی الحبشة) فی رجب سنة خمس من النبوة و ھی السنة الثانیة من اظھار الدعوة۔الکامل فی التاریخ:۱/۵۹۶۔

اطاعت کرتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں وہاں کے بادشاہ کو نجاشی کہا جاتا تھا۔ اب اسے حطی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حبش بن کوش بن حام کی اولاد ہیں[1]

ہجرتِ حبشہ کا پس منظر

ہجرت حبشہ جن حالات میں ہوئی اس کی تصویر کشی امام زہریؒ نے اس طرح کی ہے:

جب مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی، ایمان کا برملا اظہار ہونے لگا، اس پر بحث و گفتگو کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تو قریش کا رویہ بھی سخت ہو گیا۔ قبائل قریش میں سے جس قبیلے کے بھی افراد ایمان لاتے، ان پر (بالعموم) پورا قبیلہ ٹوٹ پڑتا، انہیں شدید اذیتیں پہنچائی جاتیں، قید و بند میں رکھا جاتا اور انہیں اسلام سے پھیرنے کی کوشش کی جاتی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان حالات میں صحابۂ کرام سے کہا کہ وہ مکہ سے کسی دوسری جگہ چلے جائیں۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم کہاں جائیں؟ آپ نے حبشہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ ہجرت کے لیے آپ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں اسے زیادہ پسند فرماتے تھے۔ اس کے بعد بہت سے مسلمانوں نے حبشہ ہجرت کی۔[2]

مزید تفصیل ابن اسحٰق کے ہاں ملتی ہے۔ کہتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ آپ کے اصحاب سخت مصائب اور مشکلات میں گرفتار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ کو جو مرتبہ و مقام حاصل تھا اس کے باعث اور آپ کے چچا ابوطالب کو آپ سے جو قلبی تعلق تھا اور آپ کو جس عزت و احترام سے وہ دیکھ رہے تھے، اس کی وجہ سے آپ ان مشکلات سے (کسی قدر) محفوظ ہیں۔ آپ کے صحابہ جن حالات سے گزر رہے ہیں اور جس طرح کی شدید تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں ان میں آپ ان کی مدد بھی نہیں کر پا رہے ہیں تو آپ نے ان سے کہا کہ وہ حبشہ

---

[1] ابن حجر: فتح الباری: ۷/ ۵۸۷

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۲۰۳-۲۰۴۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۳

ہجرت کر جائیں، اس لیے کہ وہاں کا بادشاہ عدل پسند ہے،اس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ حبشہ 'ارض صدق' (سچائی کی زمین) ہے۔ وہ وہاں اس وقت تک رہیں جب تک اللہ تعالیٰ کوئی سبیل نہ نکال دے۔ اس کے بعد مسلمان حبشہ ہجرت کرنے لگے۔ یہ ہجرت، دین کی راہ میں فتنہ کے خوف سے تھی، یہ دین کی خاطر اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت تھی۔ یہ اسلام کے لیے سب سے پہلی ہجرت تھی۔[1]

مہاجرینِ حبشہ کا پہلا قافلہ

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ حبشہ کے مہاجرین کا پہلا قافلہ دس افراد پر مشتمل تھا۔ ان کے نام بھی انہوں نے دیے ہیں۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ یہ کل گیارہ مرد اور چار خواتین تھیں۔[2]

بیہقی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک سفر پر سب سے پہلے حضرت عثمانؓ اپنی اہلیہ حضرت رقیہؓ (رسول اللہ ﷺ کی صاحب زادی) کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تو آپ کو تشویش ہوئی۔ پھر قریش کی ایک عورت نے، جو اس طرف سے آ رہی تھی، آپ سے کہا کہ میں نے آپ کے داماد کو دیکھا کہ وہ اپنی بیوی کو ایک کم زور سے گدھے پر بٹھا کر خود اسے ہانکتے چلے جا رہے تھے۔

---

1. ابن ہشام۔ السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۵۸-۳۵۹

2. اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ابن سعد نے جن اصحاب کے اسماء گرامی دیے ہیں ان میں ابوسبرہ اور ابوحاطب بن عمرو بن عبدشمس بھی ہیں، لیکن ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ ابوسبرہ اس سفر میں نہیں تھے۔ ان کی جگہ ابوحاطب کا نام بھی لیا گیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق بنو عامر سے تھا۔ اس طرح ابن اسحٰق نے دونوں میں سے ایک کو شمار کیا ہے اور ابن سعد نے دونوں کو اس فہرست میں رکھا ہے۔ اسی طرح ابن ہشام نے خواتین کا الگ سے تذکرہ نہیں کیا ہے، بلکہ جن مردوں کے ساتھ ان کا سفر ہوا تھا ان کے ذیل میں ان کا ذکر کر دیا ہے۔ ابن سعد نے ان کا الگ شمار کیا ہے۔ ابن ہشام: ۱۰/ ۳۵۹-۳۶۰۔ ابن سعد، طبقات: ۱/ ۲۰۴۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک: ۱/ ۵۴۶

آپ نے دعا کی: اللہ ان کے ساتھ ہو۔ فرمایا: حضرت لوطؑ کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی بیوی کے ساتھ اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہے[۱]

اس سفر پر لوگ خاموشی سے (غالبًا یکے بعد دیگرے) نکلے، تا کہ کسی کو خبر نہ ہو[۲] ان میں سے بعض تنہا تھے، بعض کے ساتھ ان کی بیویاں تھیں۔ زیادہ تر پیدل تھے۔ یہ شعیبہ[۳] کے پاس پہنچے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس وقت تاجروں کی دو کشتیاں لنگر انداز ہوئیں۔ نصف دینار کرایہ طے کر کے یہ ان میں سوار ہو گئے۔ قریش کو ان کے سفر کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے آدمیوں کو دوڑایا، لیکن کشتیاں روانہ ہوچکی تھیں[۴]

اس کے بعد حضرت جعفرؓ اور دوسرے اصحاب نے ہجرت کی۔ حبشہ ہجرت کرنے والوں کی کل تعداد ابن اسحٰق نے تراسی [۸۳] بتائی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس تعداد میں عمار بن یاسرؓ بھی شامل ہیں، لیکن ان کے بارے میں شبہ ہے کہ انہوں نے حبشہ ہجرت کی تھی یا نہیں؟ اس میں کم سن اور گود کے بچوں کا اور ان بچوں کا جو حبشہ میں پیدا ہوئے، شمار نہیں کیا گیا ہے[۵]

---

۱ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۴-۵۔ ذہبی، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۱۸۳۔ ابن حجر، فتح الباری: ۷/ ۵۸۴۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ بعض حضرات کے بقول ابوحاطب سب سے پہلے حبشہ پہنچے تھے۔ اس سلسلے میں بعض اور اقوال بھی ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو زرقانی علی المواہب: ۱/ ۵۰۵۔ ہوسکتا ہے، حضرت عثمانؓ کو اپنی اہلیہ کے ساتھ سب سے پہلے ہجرت کا شرف حاصل ہوا ہو اور دوسرے اصحاب تنہا رہے ہوں۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۳-۴

۲ یہ ایک عمومی بات ہے، ورنہ حضرت عمرؓ کے اسلام کے ذیل میں ذکر آچکا ہے کہ عامر بن ربیعہؓ کی بیوی لیلیٰ نے انہیں بتایا کہ ہم تم لوگوں کے ظلم و زیادتی کی وجہ سے مکہ چھوڑ رہے ہیں۔ ان دونوں نے حبشہ ہجرت کی۔ غالبًا یہ وہ افراد تھے جن کو اس بات کا خدشہ نہیں تھا کہ وہ سفر سے روک دیے جائیں گے۔ (حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کے سلسلے میں اس کا تفصیلی ذکر آچکا ہے)۔

۳ شعیبہ ایک وادی کا نام ہے۔ یمن کے راستہ میں ساحل پر واقع ہے۔ زرقانی علی المواہب: ۱/ ۵۰۵

۴ ابن سعد، طبقات: ۱/ ۲۰۴

۵ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۶۷-۳۶۸

ان کے علاوہ خواتین تھیں، جن کی تعداد اٹھارہ بتائی جاتی ہے[1]

[1] ابن حجر، فتح الباری: ۷/۵۸۵۔ مورخین اور سیرت نگاروں کے درمیان یہ بحث رہی ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری، جن کا تعلق یمن سے تھا، مہاجرین حبشہ میں ہیں یا نہیں؟ اس کا یہ پہلو اہم ہے کہ مکہ میں ظلم و زیادتی کی چکی چل رہی ہے اور مسلمان پس رہے ہیں اور ایک سعید روح یمن سے آکر اسلام قبول کر رہی ہے۔ ابن ہشام اور ابن سعد وغیرہ نے مہاجرین حبشہ کی جو فہرست دی ہے ان میں ابوموسیٰ اشعری کا نام بھی ہے۔ ہجرت حبشہ کی تفصیل حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت میں بھی موجود ہے۔ یہ روایت مسند احمد کی ہے۔ اس میں بھی حضرت ابوموسیٰ اشعری کا نام ہے۔ (مسند احمد: ۲/۴۸) علامہ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ روایت باعتبار سند بہت عمدہ ہے اور اس کا سیاق بھی اچھا ہے، لیکن یہ بات کہ ابوموسیٰ اشعری حبشہ کے مہاجرین میں تھے، صحیح نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی راوی نے درمیان میں اسے داخل کردیا ہے۔ (السیرۃ النبویۃ: ۲/۱۱) بخاری کی روایت کے مطابق خود حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے مکہ سے ہجرت (اور مدینہ پہنچنے) کی اطلاع ملی۔ اس وقت ہم یمن میں تھے۔ چنانچہ ہم پچاس سے زائد افراد کشتی کے ذریعہ آپ سے ملاقات کے ارادہ سے روانہ ہوئے، لیکن ہماری کشتی نے (باد مخالف کی وجہ سے) ہمیں حبشہ پہنچا دیا۔ وہاں ہماری ملاقات حضرت جعفرؓ سے ہوئی۔ ہم ان کے ساتھ وہیں رہے۔ فتح خیبر کے بعد ہم لوگ مدینہ پہنچے۔ آپ نے فرمایا: تم لوگوں کے لیے دو ہجرتوں کا ثواب ہے۔ (بخاری، مناقب الانصار، باب **هجرة الحبشة**) حافظ ابن حجرؒ نے ان دونوں طرح کی روایتوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ کہتے ہیں: ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا علم ہوا ہو اور وہ مکہ پہنچ کر اسلام لے آئے ہوں۔ آپ نے انہیں مکہ سے حبشہ جانے کا مشورہ دیا ہو۔ یمن حبشہ کے سامنے ہی پڑتا ہے، اس لیے وہ اپنی قوم کے پاس چلے گئے ہوں۔ پھر جب مدینہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک مملکت قائم کر دی تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ (جو پچاس کے قریب تھے) ہجرت کے ارادے سے نکلے ہوں، لیکن ناموافق ہواؤں نے ان کی کشتی کو حبشہ پہنچا دیا ہو۔ یہاں ان کی ملاقات حضرت جعفرؓ سے ہوئی ہوگی۔ ان سب کی مدینہ واپسی خیبر کے بعد ہوئی۔ فتح الباری: ۷/۵۸۵۔ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری بعثت کے ابتدائی دور میں مکہ پہنچے اور اسلام لائے، پھر وہ یمن واپس ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد وہ وہاں سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ روانہ ہوئے، لیکن ہوا کا رخ مخالف ہونے کی وجہ سے حبشہ پہنچ گئے۔ حضرت جعفرؓ نے انہیں وہیں روک لیا۔ انہوں نے حضرت جعفرؓ ہی کے ساتھ فتح خیبر کے بعد مدینہ ہجرت کی۔ دونوں کشتیاں ایک ساتھ پہنچیں، حضرت ابوموسیٰ اشعری کے سفر کے لیے ملاحظہ ہو۔ الاستیعاب: ۴/۲۷/۳۔ اسد الغابۃ: ۳/۳۶۴-۳۶۶ نیز: ۶/ ۲۹۹-۳۰۰۔ ابن کثیر۔ السیرۃ النبویۃ: ۲/۱۴

مہاجرین کی مکہ واپسی

حبشہ کی ہجرت پر تین ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ بات مشہور ہوگئی کہ قریش کا رسول اللہ ﷺ سے اختلاف ختم ہو گیا ہے، وہ سب ایمان لے آئے ہیں۔ اس کی وجہ بعض روایات میں یہ بیان ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ قریش کی ایک بڑی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ آپ کا دل چاہنے لگا کہ اس وقت ایسی وحی نہ نازل ہو جس سے ان کی نفرت اور دوری میں اضافہ ہو۔ اسی اثنا میں سورۂ نجم نازل ہوئی۔ آپ نے اس کی تلاوت فرمائی۔ جب آپ ان آیات پر پہنچے:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ﴿۱۹﴾ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿۲۰﴾

اب ذرا بتاؤ، تم نے کبھی اس لات اور اس عزّیٰ اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے۔

تو شیطان نے آپ کی زبان پر دو اور جملے جاری کر دیے:

تلک الغرانیق العُلیٰ و ان شفاعتھن لترتجی

یہ بہت اونچے سمندری پرندے ہیں اور ان کی سفارش کے قبول ہونے کی ضرور توقع ہے۔

سورۂ نجم آیت سجدہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس کی تلاوت کے بعد آپ نے سجدہ کیا تو کفار بھی سجدے میں گر پڑے، حتیٰ کہ ولید بن مغیرہ، جو آپ کا شدید مخالف تھا، کبرسنی کی وجہ سے سجدہ نہیں کر پا یا تو ہاتھ میں مٹی لی اور اس پر ماتھا ٹیک دیا۔ بعض نے غرورِ نفس کی وجہ سے ہاتھ میں مٹی لی اور اس پر سجدہ کیا۔[1]

تلاوت ختم ہونے کے بعد کفار قریش نے کہا کہ ہم بھی مانتے ہیں کہ اللہ ہی موت و حیات کا مالک ہے۔ وہی خالق و رازق ہے۔ ہمارے معبود تو بس اس کے نزدیک سفارش کرنے والے ہیں۔ جب آپ نے ان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا تو ہمارا آپ سے اختلاف نہیں ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۷۔ ابن حجر۔ فتح الباری: ۹/ ۵۹۷-۵۹۸

شام کو حضرت جبرئیل تشریف لائے۔ آپ نے انہیں یہ سورہ سنائی تو انہوں نے بتایا کہ یہ جملے وحی کا حصہ نہیں تھے۔ آپ کو بڑا صدمہ ہوا کہ شیطان کے اثر سے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔ اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾ (الحج:۵۲)	ہم نے آپ سے پہلے جس رسول اور نبی کو بھی بھیجا اس کے ساتھ یہ واقعہ ضرور پیش آیا ہے کہ اس نے تمنا کی تو شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہوگیا۔ پھر اللہ تعالیٰ شیطان کی خلل اندازیوں کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے۔ اللہ علیم وحکیم ہے۔

اس آیت میں یہ اطمینان دلایا گیا کہ شیطان تو ہمیشہ خلل اندازی کرتا ہی رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ وحی کو اس سے پاک کر دیتا ہے، آپ کو بھی اس سے محفوظ رکھے گا اور وحی میں کوئی خارجی آمیزش نہیں ہونے پائے گی۔

اسی اثنا میں حبشہ یہ خبر پہنچ گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے درمیان قرآن مجید کی تلاوت فرمائی اور وہ آپ کے ساتھ سجدے میں گر پڑے تو انہوں نے سوچا کہ جب قریش اور آپ کے درمیان صلح ہوگئی ہے تو ہمیں مکہ واپس ہوجانا چاہیے، تاکہ ہم وطن میں اپنے اپنے خاندان کے ساتھ رہ سکیں[1]

اس روایت کے سلسلہ میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر، یہ اس ایمان وعقیدہ اور تاریخی حقیقت کے خلاف ہے کہ قرآن مجید کا لفظ لفظ محفوظ اور ہر طرح کے اختلاط اور خارجی مداخلت سے پاک ہے۔ اس وجہ سے اس

---

[1] اس واقعہ کو ابن جریر طبری نے سورۂ حج کی مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں کئی سندوں سے نقل کیا ہے۔ تفسیر طبری، جز۱۷، ص۱۳۱-۱۳۴۔ اپنی تاریخ میں بھی ان روایات کا خلاصہ نقل کر دیا ہے۔ تاریخ الامم والملوک: ۱/ ۵۵۰-۵۵۱۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابن سعد، طبقات: ۱/ ۲۰۵-۲۰۶۔ ذہبی، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۱۸۶-۱۸۷

روایت پر سخت تنقید کی گئی ہے اور اس کی توجیہات بھی کی گئی ہیں[1] البتہ اتنی بات صحیح ہے

---

[1] علامہ ابن کثیر کہتے ہیں: قد ذکر کثیر من المفسرین ھٰھنا قصة الغرانیق و ما کان من رجوع کثیر من المهاجرة الی ارض الحبشة ظنًّا منهم ان مشرکی قریش قد اسلموا، و لکن من طرق کلها مرسلة، و لم ارها مسندة من وجه صحیح، والله اعلم۔ تفسیر القرآن العظیم: ۲/۲۲۹ (بہت سے مفسرین نے اس جگہ (سورۂ حج کی آیت کے ذیل میں) قصۂ غرانیق کا ذکر کیا ہے اور یہ کہ حبشہ ہجرت کرنے والوں میں سے بیش تر نے یہ سوچ کر مکہ واپسی اختیار کی کہ قریش اسلام لے آئے ہیں۔ لیکن یہ ساری روایتیں جن سندوں سے آئی ہیں وہ سب مرسل ہیں۔ میرے علم کی حد تک ان کی روایت صحیح سند سے نہیں ہے) آگے چل کر اس سلسلہ کی بعض اور روایات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: کلها مرسلات و منقطعات: ۲/۲۳۰۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس کا ذکر ہی نہیں کیا ہے، کیوں کہ اس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ السیرۃ النبویۃ: ۲/۵۶

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس سلسلہ کی زیادہ تر روایتیں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہیں۔ ان میں سے اکثر ضعیف یا منقطع ہیں، لیکن ان کے کثرتِ طرق سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ بے بنیاد نہیں ہے۔ پھر انھوں نے ان لوگوں پر تنقید کی ہے، جنھوں نے اس سلسلہ کی تمام روایتوں کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، اس لیے کہ جو روایت کئی سندوں اور مختلف طریقوں سے آئی ہو اس کے بارے میں یہی سمجھا جائے گا کہ اس کی کوئی اصل ہے۔ پھر اس کے بعد اس واقعہ کی جو توجیہات کی گئی ہیں، انھیں نقل کیا ہے۔ فتح الباری: ۹/۳۶۸-۲۶۹۔

اس روایت کی مناسب توجیہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجمع میں سورۂ نجم تلاوت فرمائی تو مشرکین میں سے کسی نے درمیان میں دو جملوں کا اضافہ کر دیا اور بہت سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ جملے بھی آپؐ کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ یہی توجیہ جصاص وغیرہ نے کی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو زرقانی علی المواهب اللدنیۃ: ۲/۱۵-۳۱۔ اس روایت پر قدیم علماء و محققین نے جو تنقید کی ہے اور اسے جن پہلوؤں سے ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے، اسے سیرت ابن ہشام: ۱/۴۰۲ اور ذہبی کی السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۸۶-۱۸۷ کے محشی اور تعلیق نگار حضرات نے جمع کر دیا ہے۔

بخاری وغیرہ کی روایات سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ نجم کے آخر میں آپ نے سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ مسلمانوں نے بھی اور مشرکین نے بھی سجدہ کیا، (بخاری، کتاب التفسیر، سورہ النجم، باب فَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ وَاعْبُدُوْا) اس کی وجہ قرآن مجید کا زور بیان، اس کی شوکتِ الفاظ اور اس کی تاثیر بھی ہوسکتی ہے۔ آپؐ نے اپنے پرسوز اور پرزور انداز میں جب اس کی تلاوت فرمائی ہوگی تو کوئی تعجب نہیں کہ آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ مشرکین بھی سجدہ میں گر پڑے ہوں۔

کہ مشرکین کے اسلام لانے کی خبر حبشہ پہنچی اور ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ یہ لوگ مکہ کے قریب پہنچے تو اطلاع ملی کہ خبر غلط تھی۔اب ان میں سے جو بھی مکہ میں داخل ہوا وہ یا تو کسی کی پناہ میں داخل ہوا یا کسی خفیہ طریقہ سے پہنچا[۱]

واقدی کا بیان ہے کہ جب حبشہ یہ خبر پہنچی کہ اہل مکہ نے سجدہ کیا ہے اور وہ سب اسلام لے آئے ہیں۔رسول اللہ ﷺ کو سجدہ کرتے دیکھ کر جب ولید بن مغیرہ اور ابواحیحہ جیسے مخالفین بھی سجدہ میں گر پڑے تو مہاجرین نے سوچا کہ اب مکہ میں ان کا مخالف کون رہ گیا ہے؟ چنانچہ یہ مکہ واپس لوٹنے لگے۔ابھی یہ مکہ پہنچنے ہی والے تھے کہ انہیں قبیلۂ کنانہ کے کچھ سوار ملے۔انہوں نے ان سے قریش کا حال معلوم کیا تو انہوں نے کہا کہ محمد ﷺ نے قریش کے معبودوں کے حق میں کلمۂ خیر کہا تو سرداران قریش نے ان کا ساتھ دیا، پھر محمد ﷺ ان کے معبودوں کو برا بھلا کہنے اور تنقید کرنے لگے تو وہ بھی دوبارہ ان کے خلاف ہوگئے اور شرکی روش اختیار کر لی۔ہماری روانگی تک یہی صورتِ حال تھی[۲]

یہ غلط فہمی کیسے ہوئی یا یہ افواہ کیسے پھیلی؟ اس سلسلے میں مورخین نے لکھا ہے کہ مشرکین کے سجدے کے واقعہ کو جس کسی نے نقل کیا اس نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں مشرکین نے سجدہ کیا تو اس نے سمجھا کہ وہ اسلام لے آئے ہیں اور آپ کے ساتھ ان کی صلح ہوگئی ہے اور کوئی نزاع باقی نہ رہی۔

مہاجرین حبشہ کو جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے اس کو صحیح سمجھ لیا۔کچھ لوگ مکہ واپس ہو گئے اور کچھ لوگ وہیں رہے۔ابن کثیر کہتے ہیں کہ دونوں گروہ اپنی جگہ صحیح تھے[۳]

جو لوگ حبشہ سے مکہ واپس ہوئے ان کی تعداد تینتیس [۳۳] تھی۔ابن ہشام نے فرداً فرداً ان کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان میں سے کس کا کس قبیلہ سے تعلق تھا[۴]

۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۰۲

۲۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۲۰۶، حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۹

۳۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۵۷، نیز ملاحظہ ہو حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۹

۴۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۰۷۔ یہی بات اور مورخین نے بھی نقل کی ہے۔طبری، تاریخ الامم و الملوک: ۱/ ۵۵۲۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۵۸، حلبی، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۹

ان حضرات کی حبشہ روانگی بعثت کے پانچویں سال ماہ شعبان میں ہوئی، رسول اللہ ﷺ کی تلاوتِ قرآن کا واقعہ رمضان میں پیش آیا اور مہاجرین حبشہ کی واپسی شوال میں ہوئی[۱]

دوبارہ ہجرتِ حبشہ

حبشہ سے جو اصحاب مکہ واپس ہوئے، قریش نے ان کے ساتھ پہلے سے زیادہ سختی شروع کر دی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں دوبارہ حبشہ ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی[۲]

جو اصحاب حبشہ سے واپس ہوئے ان میں سے بیش تر پھر حبشہ روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ کچھ نئے اصحاب بھی تھے[۳]

---

[۱] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ:۱/۲۰۶۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ:۱/۵۹۶۔ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ:۲/۵

[۲] سیرت حلبیہ میں ہے کہ حبشہ کی دوبارہ ہجرت رسول اللہ ﷺ کے شعب ابی طالب میں محصور ہونے کے بعد شروع ہوئی۔(السیرۃ الحلبیۃ:۲/۹) مزید لکھتے ہیں کہ بعثت کے نویں سال محرم میں بنو ہاشم شعب ابی طالب میں محصور ہوئے ،اس وقت جو مسلمان مکہ میں رہ رہے تھے ،انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔ (السیرۃ الحلبیۃ:۲/۲۶) لیکن واقدی کا بیان ہے کہ جو اصحاب حبشہ سے مکہ واپس ہوئے ان کے قبائل ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کو سخت قسم کی اذیتیں دینے لگے،تو انہیں رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ حبشہ ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔(ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۰۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ ہجرت پہلی ہجرت سے واپسی کے فوراً بعد شروع ہو گئی۔ علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ واقدی کے بیان کے مطابق دوبارہ ہجرت بعثت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے۔ (السیرۃ النبویۃ:۱/۱۹۱) یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ مکہ کی صورت حال دیکھنے کے بعد جلد ہی حبشہ روانگی شروع ہو گئی ہو گی۔

[۳] واقدی کا بیان ہے کہ اس بار ہجرت کرنے والوں میں مردوں کی کل تعداد تراسی [۸۳] تھی، عورتوں میں گیارہ قریشی اور سات غیر قریشی تھیں۔ (ابن سعد ،الطبقات الکبریٰ:۱/۲۰۷) اس طرح حبشہ ہجرت کرنے والے کل افراد ۱۰۲ تھے۔ (زرقانی، شرح المواھب اللدنیۃ: ۲/۳۱-۳۲) یہی بات حلبی نے بھی کہی ہے۔ (السیرۃ الحلبیۃ:۲/۲۷) ابن ہشام کے حوالے سے یہ بات گزر چکی ہے کہ حبشہ ہجرت کرنے والوں میں مردوں کی کل تعداد تراسی [۸۳] تھی، لیکن ان بیانات سے یہ بات پوری =

مہاجرین حبشہ جن حالات سے گزرے، اس کی روداد ہمیں حضرت ام سلمہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی روایتوں میں ملتی ہے[1]۔

یہ وہ اصحاب ہیں جن کا براہ راست اس ہجرت سے تعلق تھا۔ پہلے تین اصحاب

= طرح واضح نہیں ہے کہ پہلی مرتبہ حبشہ کتنے افراد نے ہجرت کی تھی اور دوسری مرتبہ ہجرت کرنے والے کتنے افراد تھے؟ ابن ہشام ہی کے حوالے سے یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ پہلی ہجرت کے بعد مکہ واپس ہونے والوں کی تعداد تینتیس (۳۳) تھی۔ ابن کثیر کے بقول یہ کل نہیں تھے، کچھ افراد حبشہ ہی میں مقیم رہے اور کچھ مکہ واپس ہوئے۔

واقدی کا بیان ہے: "فلما سمعوا بمهاجرة رسول الله صلى الله عليه وسلم رجع منهم ثلاثة و ثلاثون رجلاً و من النساء ثماني نسوة، فمات منهم رجلان بمكة، و حبس بمكة سبعة نفر، وشهد بدرًا منهم اربعة و عشرون رجلاً" (ابن سعد الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۰۷، طبری، تاریخ الامم: ۱/۵۵۲) یعنی یہ تینتیس مرد اور آٹھ خواتین ہجرتِ مدینہ کے بعد مکہ واپس آئے، ان میں سے دو کا مکہ ہی میں انتقال ہوگیا اور سات کو مکہ والوں نے مدینہ ہجرت کرنے نہیں دیا۔ چوبیس نے مدینہ ہجرت کی اور جنگ بدر میں شریک ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تعداد کا حبشہ کی پہلی ہجرت کے بعد واپسی سے تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ ہجرت مدینہ کے بعد کا واقعہ ہے۔

اس طرح مؤرخین کے نزدیک حبشہ ہجرت کرنے والوں اور واپس ہونے والوں کی تعداد متعین ہے، لیکن کس ترتیب سے یہ واقعہ پیش آیا، واضح نہیں ہے۔ تمام تفصیلات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ہجرت حبشہ کے بعد کچھ لوگ مکہ واپس ہوئے۔ مکہ کی صورتِ حال دیکھنے کے بعد ان میں سے بیش تر نے دوبارہ ہجرت کی اور بعض افراد مکہ ہی میں رہ گئے، کچھ نئے افراد بھی دوسری ہجرت میں روانہ ہوئے، بنوہاشم کے شعبِ ابوطالب میں محصور ہونے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد ہجرتِ مدینہ کا واقعہ پیش آیا، کچھ لوگ براہ راست مدینہ منورہ پہنچے اور کچھ نے مکہ کا راستہ اختیار کیا۔ مکہ والوں نے بعض کو مدینہ ہجرت کرنے نہیں دیا۔ زیادہ تر نے مدینہ ہجرت کی اور جنگ بدر میں شریک ہوئے۔

[1] حضرت ام سلمہؓ کی روایت کے لیے ملاحظہ ہو ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۲۷-۳۷۳، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت مسند احمد: ۲/۴۸ میں ہے۔ حضرت جعفرؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی روایات ابن عساکر نے عمدہ سند کے ساتھ نقل کی ہیں۔ ان تمام روایتوں کو ابن کثیر نے جمع کر دیا ہے۔ (السیرۃ النبویۃ ۲/۱۴۔ اور آگے کے صفحات)۔

مہاجرینِ حبشہ میں سے ہیں اور حضرت عمرو بن العاص مشرکین کی طرف سے سفیر کی حیثیت سے نجاشی کے پاس گئے تھے۔

حبشہ ان مہاجرین کے لیے اچھی پناہ گاہ ثابت ہوا اور وہ وہاں اطمینان اور سکون سے رہنے لگے۔ حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ ہم جب حبشہ پہنچے تو ہمارے ساتھ نجاشی کا سلوک بہت اچھا رہا۔ وہ ہمارے لیے بہترین پڑوسی تھے۔ دین کے معاملے میں ہم محفوظ و مامون ہو گئے۔ کوئی ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچاتا تھا اور کوئی ناپسندیدہ بات ہمیں سننی نہیں پڑتی تھی۔

مہاجرین کو واپس لانے کے لیے قریش کی سفارتی مہم

قریش کے علم میں جب یہ بات آئی تو ان کی عصبیت جاہلیہ بھڑک اٹھی۔ انھوں نے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ طے پایا کہ نجاشی کے پاس سفیر بھیج کر درخواست کی جائے کہ وہ ان لوگوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرے اور ہمارے حوالے کر دے۔ سفارت کے لیے دو خوب مضبوط اور توانا افراد کا انتخاب کیا جائے۔ نجاشی کو مکہ کی سب سے قیمتی چیزیں بطور تحفہ بھیجی جائیں۔ اس کے ایک ایک مذہبی رہ نما کے لیے بھی تحائف کا انتظام کیا جائے۔ اہلِ حبشہ کو یہاں کے چمڑے بہت پسند تھے۔ عمدہ چمڑے جمع کیے گئے۔ اس کے ساتھ نجاشی کے لیے ایک گھوڑا اور ریشمی عبا (کرتا) بھی تھی۔ حبشہ کے مذہبی رہ نماؤں کے لیے بھی تحفوں کا انتظام کیا گیا۔ ان تحائف کے ساتھ عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص کو سفارتی مہم پر روانہ کیا گیا[1]۔

---

[1] بعض روایات میں عبداللہ بن ابی ربیعہ کی جگہ عمارہ بن ولید کا ذکر ہے اور اس سفر میں دونوں کے کردار سے متعلق بعض تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ قریش نے دو مرتبہ سفارتی کوشش کی تھی۔ پہلے سفر میں عمرو بن العاص کے ساتھ عمارہ بن ولید تھا اور دوسرے میں ان کے ساتھ عبداللہ بن ابی ربیعہ تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حلبی، السیرۃ الحلبیہ : ۲/ ۳۲-۳۳۔

ان سفراء کو ہدایت کی گئی کہ نجاشی سے بات کرنے سے پہلے ہر مذہبی رہ نما کو اس کا تحفہ پہنچا دیں۔ آخر میں نجاشی کی خدمت میں تحفے پیش کیے جائیں اور اس سے بات کی جائے۔ ان سفیروں نے حسبِ فیصلہ عمل کیا، ہر سردار تک اس کا تحفہ پہنچایا اور اس سے کہا کہ ہمارے کچھ ناسمجھ نوجوان بادشاہ کی مملکت میں بھاگ آئے ہیں، اپنا دین چھوڑ دیا ہے، آپ کا دین (عیسائیت) بھی نہیں قبول کیا ہے، بلکہ ایک نیا ہی دین ایجاد کر رکھا ہے، جس سے نہ ہم واقف ہیں نہ آپ حضرات۔ ہمارے اشراف اور سرداروں نے ہمیں بادشاہ کی خدمت میں بھیجا ہے، تاکہ وہ انہیں واپس کر دیں۔ جب بادشاہ سے ہماری بات ہو تو آپ حضرات بادشاہ کو مشورہ دیں کہ وہ انھیں ہمارے حوالے کر دیں اور ان سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کریں، اس لیے کہ ان کے سردار اور ان کے بزرگ ان کے حالات سے زیادہ باخبر ہیں۔ ان پر دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ حبشہ کے مذہبی سرداروں نے اس سے اتفاق کیا۔

اب دونوں سفیروں نے براہِ راست نجاشی سے ملاقات کی اور تحفے تحائف پیش کیے۔ نجاشی نے تحفے قبول کیے۔ اپنی نشست کے دائیں بائیں دونوں سفیروں کو جگہ دی۔ آمد کا مقصد دریافت کیا۔ انھوں نے وہی باتیں دہرائیں جو پادریوں سے کی تھیں کہ ہمارے کچھ نادان نوجوان آپ کی مملکت میں بھاگ آئے ہیں، اپنی قوم کے دین کو ترک کر دیا ہے اور آپ کے دین کو بھی قبول نہیں کیا ہے۔ ایک نیا ہی دین اختیار کر رکھا ہے۔ ان کی قوم کے سرداروں نے، ان کے خاندانوں کے بزرگوں نے، ان کے باپوں اور چچاؤں نے، ان کا جن قبائل سے تعلق ہے، ان کے نمایاں افراد نے ہمیں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، تاکہ آپ انھیں ان کے وطن لوٹا دیں۔ سفیروں نے نجاشی کو یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ اس مسئلہ میں وہ ان مہاجرین سے کوئی بات نہ کرے، اس لیے کہ ان کی قوم ان کے غلط فکر و عمل سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ واقف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں سفیروں کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ نجاشی سے مہاجرین کی گفتگو ہو۔

انھیں اندیشہ تھا کہ اس سے نجاشی متاثر ہوسکتا ہے۔ مجلس میں جو سردار اور مذہبی رہ نما موجود تھے انھوں نے بھی سفیروں کے اس خیال کی تائید کی کہ مہاجرین سے گفتگو کی چنداں حاجت نہیں ہے۔ نجاشی نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور کہا: قسم خدا کی، میں تحقیقِ حال کے بغیر انہیں اس طرح ان کے حوالے نہیں کروں گا۔ یہ بات سراسر ناانصافی کی ہوگی کہ کچھ لوگوں نے میری ہم سائگی اختیار کی، میرے ملک میں آئے، دوسروں کے مقابلے میں مجھے پسند کیا، میں ان سے بات کیے بغیر ہی انھیں نکال باہر کروں۔ میں ان سے معلومات حاصل کروں گا۔ اگر سفیروں کی بات درست نکلے تو انھیں ان کے حوالے کر دوں گا اور انھیں ان کی قوم کے پاس پہنچا دوں گا، لیکن اگر بات دوسری ہو تو میں انھیں ان سفیروں کے حوالے نہیں کروں گا۔ جب تک وہ میرے پاس ہیں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر

مہاجرین سے گفتگو سے پہلے اس نے مذہبی رہ نماؤں (نصاریٰ کے علما و پادریوں) کو طلب کیا۔ وہ حاضر ہوئے تو ان سے کہا کہ وہ اپنے صحیفے کھول لیں۔ (غالبًا اس خیال سے کہ دیکھیں، ان مہاجرین کی باتوں کی ان صحیفوں سے تصدیق ہوتی ہے یا نہیں؟)

اب اس نے مہاجرین کو طلب کیا۔ قاصد ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے باہم مشورے سے طے کیا کہ بادشاہ کے سامنے وہی بات رکھی جائے جس کی تعلیم ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے دی ہے، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ حضرت جعفرؓ نے کہا: نجاشی کے سامنے میں تم سب کی نمائندگی کروں گا۔ سب نے اس سے اتفاق کیا۔

مہاجرین روانہ ہوئے۔ دربار میں پہنچنے سے پہلے حضرت جعفرؓ نے باہر سے آواز دی کہ جعفر دروازے پر ہے۔ اس کے ساتھ حزب اللہ ہے، کیا حاضری کی اجازت ہے؟ نجاشی نے کہا: ہاں، تمھیں اللہ کی امان اور اس کی پناہ حاصل ہے، اندر آسکتے ہو۔ حضرت جعفرؓ داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے ان کے رفقا تھے، سلام کیا۔ دربار میں جو علما اور راہب

موجود تھے، انھوں نے ان سے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کرو۔ حضرت جعفرؓ نے انکار کر دیا۔[1]

حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ یہ بڑے متکبر اور نخوت بھرے لوگ ہیں۔ خود کو حزب اللہ کہتے ہیں۔ جس طرح دوسرے لوگ آپ کی تعظیم بجا لاتے ہیں اس طرح انھوں نے تعظیم نہیں کی اور سجدۂ تعظیمی نہیں کیا۔ نجاشی نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو حضرت جعفرؓ نے کہا کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں، اس کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ ہمارے پیغمبر نے ہمیں بتایا ہے کہ اہلِ جنت آپس میں سلام کریں گے۔ ہم بھی ایک دوسرے کو سلام ہی کرتے ہیں۔ چوں کہ انجیل میں یہ بات موجود ہے، اس لیے نجاشی سمجھ گیا کہ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔[2]

نجاشی: کیا تم یہود ہو؟

حضرت جعفر: نہیں۔ ہم یہود نہیں ہیں۔

نجاشی: کیا تمہارا دین وہی ہے جو تمہاری قوم کا ہے؟

حضرت جعفر: نہیں

نجاشی: آخر تمہارا دین کیا ہے اور اس کا لانے والا کون ہے؟

اس پر حضرت جعفرؓ نے ایک طویل تقریر کی۔

اے بادشاہ! ہم ایسے لوگ تھے جو جاہلیت میں گرفتار تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے، بے حیائی کے کاموں میں ملوث تھے، قطع رحم کا ارتکاب کرتے تھے، رشتوں کے حقوق نہیں ادا کرتے تھے، پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے، ہم میں جو قوی تھا وہ کم زور کو کھائے جا رہا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ہم ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ ان کے حسب نسب، صداقت، امانت، عفت و عصمت سے ہم واقف تھے۔ انھوں نے ہمیں اللہ کی طرف دعوت دی کہ ہم اسے ایک مانیں، اسی کی عبادت کریں۔

---

۱ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۱۲

۲ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۲۸

ہمارے باپ دادا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کی اور پتھروں کی جو پوجا اور پرستش کرتے ہیں، اسے ترک کر دیں۔ انھوں نے ہمیں راست گفتاری، ادائے امانت، صلۂ رحمی اور پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی، حرام چیزوں سے رک جانے کا حکم دیا، قتل وخوں ریزی سے، فواحش اور منکرات سے، دروغ گوئی سے، یتیم کا مال کھانے سے اور پاک باز عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا، نماز، زکوٰۃ (صدقہ وخیرات) اور روزے کا حکم دیا۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت جعفرؓ نے اس طرح اسلام کی بہت سی تعلیمات کی وضاحت کی۔ اس کے بعد کہا: ہم نے اللہ کے رسول کی ان باتوں کی تصدیق کی، آپؐ پر ایمان لے آئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ جو تعلیمات لائے ہیں، انھیں ہم برحق مانتے ہیں، اللہ واحد کی عبادت کرتے ہیں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، اللہ کے رسول نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، انھیں حرام اور جن چیزوں کو حلال کہا انھیں حلال سمجھ کر عمل کرتے ہیں۔

اس پر ہماری قوم نے ہمارے ساتھ ظلم و زیادتی کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ اس نے ہمیں سخت سزائیں دیں، ہمیں اپنے دین سے منحرف کرنے کی کوشش کی، تاکہ ہمیں اللہ واحد کی عبادت سے پھیر کر بت پرستی کی طرف لے جائیں۔ ہم جن خبیث حرکتوں کا ارتکاب کرتے تھے پھر ان کا ارتکاب کرنے لگیں۔ جب انھوں نے ہم پر قہر و غضب ڈھایا، ظلم کیا، زندگی ہمارے لیے تنگ کردی، ہمارے اور ہمارے دین کے درمیان رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے، تو ہم نے دوسروں کے مقابلے میں آپ کے ملک کو ترجیح دی، آپ کے جوار میں رہنا پسند کیا، اس توقع پر کہ آپ کے ہاں، اے بادشاہ! ہم پر ظلم نہ ہوگا اور ہم زیادتیوں سے محفوظ رہیں گے۔

یہ بے نظیر اور دل ہلا دینے والی تقریر سننے کے بعد نجاشی نے حضرت جعفرؓ سے دریافت کیا کہ تمہارے پیغمبر جو کلام اللہ کی طرف سے پیش کرتے ہیں، کیا اس کا کوئی حصہ تمہارے پاس ہے؟ حضرت جعفرؓ نے کہا: ہاں! نجاشی نے کہا۔ وہ مجھے

سناؤ۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھا۔ نجاشی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، یہاں تک کہ اس کی داڑھی تر ہو گئی۔ جو علما دربار میں موجود تھے ان کی آنکھیں بھی اشک بار ہو گئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ نجاشی نے مزید کچھ سنانے کی درخواست کی تو حضرت جعفرؓ نے سورۂ کہف سنائی۔ نجاشی نے کہا: یہ کلام اور حضرت عیسیٰؑ جو کلام لائے تھے دونوں ایک ہی چراغ سے نکلے ہیں۔ پھر عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص سے کہا: آپ لوگ یہاں سے جائیں۔ میں انھیں آپ کے حوالہ نہیں کروں گا۔[1]

قریشی سفارت کی ناکامی

عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ دربار سے باہر نکلے تو عمرو بن عاص نے کہا: کل ایک ایسی بات میں بادشاہ سے کہوں گا کہ وہ انھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ ان دونوں میں عبداللہ بن ابی ربیعہ نسبتاً نرم تھے۔ انھوں نے کہا: ایسی کوئی بات نہ کرو۔ یہ لوگ چاہے ہمارے دین کے خلاف ہوں، لیکن ان سے ہمارا خونی رشتہ ہے۔ عمرو بن عاص اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ چناں چہ وہ دوسرے دن بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: اے بادشاہ! یہ لوگ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں بہت سخت بات کہتے ہیں۔ آپ ان سے اس سلسلہ میں دریافت کریں۔ دوسرے دن اس نے پھر مہاجرین کو طلب کیا۔ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ یہ ہمارے لیے بڑا نازک معاملہ تھا۔ لوگ جمع ہوئے اور مشورہ کیا کہ ہمیں اس سوال کا کیا جواب دینا چاہیے؟ پھر یہی طے پایا کہ ہم وہی کہیں گے جو اللہ اور اس کے رسول نے کہا ہے، چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ نکلے۔ چناں چہ جب یہ لوگ دربار میں پہنچے تو نجاشی نے سوال کیا کہ تم لوگ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے جواب دیا: ہم ان کے بارے میں

---

[1] حضرت جعفرؓ کی تقریر اور واقعہ کی یہ تفصیل ابن ہشام نے بیان کی ہے: ۱/۳۷۳-۳۷۴۔ دیگر مورخین نے اسی سے نقل کی ہے۔ ملاحظہ ہو، ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۱/۵۹۹۔ ذہبی نے تقریباً یہی تفصیل موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے بیان کی ہے۔ السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۸۸-۱۸۹

وہی کہتے ہیں جو ہمارے پیغمبر نے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتایا ہے۔ وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور کلمہ تھے جو مریم عذرا بتول سے بغیر باپ کے اللہ کے کلمہ سے پیدا ہوئے۔

نجاشی نے حضرت جعفرؓ کے اس بیان کو سننے کے بعد زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا: عیسیٰ بن مریم اس بیان سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہ تھے[۱]

بعض روایات میں اس کی کچھ اور تفصیل ملتی ہے۔ حضرت جعفرؓ کی گفتگو کے ختم ہونے پر نجاشی نے دربار میں موجود عالموں اور راہبوں سے دریافت کیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ اس پر تم کیا اضافہ کرنا چاہتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: آپ ہی فرمائیں۔ آپ کا علمی مرتبہ اور مقام ہم سے اونچا ہے[۲]

نجاشی نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں دی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ نجاشی نے علما اور راہبوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ، جس نے عیسیٰ پر انجیل نازل کی، میں اس کی قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ کے بعد قیامت کے آنے سے پہلے کسی نبی کا ذکر تمھیں انجیل میں ملتا ہے یا نہیں؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں، ملتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس کی بشارت دی ہے اور کہا ہے کہ جو اس پر ایمان لاتا ہے وہ مجھ پر ایمان لاتا ہے اور جو اس کی رسالت کا انکار کرتا ہے وہ میرا انکار کرتا ہے۔ اس پر نجاشی نے کہا: اگر سلطنت کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوتی تو میں بذاتِ خود اس کی جوتیاں اٹھاتا اور اس کے ہاتھ پیر دھوتا[۳]

---

۱ ابن ہشام! السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۷۰-۳۷۵

۲ نجاشی کے بارے میں آتا ہے: **کان النجاشی اعلم النصاریٰ بما انزل علی عیسیٰ وکان قیصر یرسل الیه علماء النصاریٰ لتاخذ عنه**۔ حلبی، السیرۃ الحلبیہ: ۲/ ۲۹ (حضرت عیسیٰ پر جو تعلیمات نازل ہوئیں، نجاشی ان کے سب سے بڑے عالم تھے۔ قیصر روم ان کے پاس علماء نصاریٰ کو بھیجتا تھا، تاکہ وہ ان سے علم حاصل کریں)۔

۳ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۲۹

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی سے گفتگو کے دوران میں حضرت جعفرؓ نے نجاشی سے کہا: آپ ان سفیروں سے دریافت فرمائیں کہ ہم غلام ہیں یا آزاد؟ اگر غلام ہیں تو بے شک ہم نے اپنے مالکوں سے فرار کی راہ اختیار کی ہے۔ آپ ہمیں لوٹا دیں۔ عمرو بن عاص نے کہا۔ نہیں ! یہ آزاد لوگ ہیں ۔ حضرت جعفرؓ نے فرمایا: ان سے پوچھیں کہ کیا ہم نے ناحق کسی کا خون بہایا ہے کہ ہم سے قصاص کا مطالبہ کر رہے ہوں؟ کیا ہم نے ناروا کسی کا مال لے رکھا ہے اور اس کا ادا کرنا ہم پر ضروری ہو گیا ہے؟ عمرو بن عاص نے جواب دیا: ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ نجاشی نے سفیروں سے کہا: آپ حضرات واپس جائیں۔ میں کبھی انھیں آپ کے حوالہ نہیں کروں گا۔[۱]

حبشہ میں مہاجرین کا رہن سہن

اس طرح نجاشی کو یقین ہو گیا کہ محمد ﷺ واقعتاً اللہ کے رسول ہیں۔ یہ مہاجرین ان کے اصحاب اور پیروکار ہیں۔ یہ کسی کے زر خرید غلام نہیں ہیں، بلکہ آزاد بندے ہیں۔ انھوں نے کسی کا حق نہیں مارا ہے، کسی کا مال نہیں کھایا ہے، بلکہ ان کے ساتھ سراسر زیادتی ہوئی ہے اور وہ یہاں پناہ کے طالب ہیں۔ اس یقین نے اس کے جذبۂ ہمدردی کو بڑھا دیا۔ اس نے مہاجرین سے کہا: جاؤ، تم لوگ میری سلطنت میں مامون اور محفوظ ہو، جو کوئی تمھیں برا بھلا کہے گا اس پر جرمانہ عائد ہوگا۔ تم میں سے کسی کو اذیت دے کر مجھے سونے کا پہاڑ بھی مل جائے تو میں اسے پسند نہ کروں گا۔ درباریوں سے کہا: ان سفیروں کے تحفے واپس کر دیے جائیں، مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد حبشہ میں مہاجرین سکون سے رہنے لگے۔[۲]

جرمانہ کے سلسلہ میں یہ تفصیل ملتی ہے کہ نجاشی نے مہاجرین سے پوچھا کہ کیا کوئی تمھیں تکلیف پہنچاتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: ہاں! (قریش کے سفیروں کے

۱؎ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۳۲۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۱۵

۲؎ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۷۰

ورغلانے سے ہوسکتا ہے کچھ لوگوں نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہو) اس پر نجاشی کے حکم سے منادی نے اعلان کیا کہ جو کوئی انھیں تکلیف پہنچائے گا اس پر چار دینار جرمانہ ہوگا۔ مہاجرین سے دریافت کیا کہ کیا یہ کافی ہے؟ انھوں نے اسے ناکافی بتایا تو نجاشی نے اسے دوگنا کر دیا۔[1]

نجاشی نے بڑے نازک وقت میں مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔ انھیں سکون اور اطمینان کے ساتھ دین پر عمل کے مواقع حاصل تھے، اس لیے اس کی سلطنت اور اقتدار کا باقی رہنا ان کے لیے فائدہ مند تھا۔ اس کے زوال اور خاتمہ سے انھیں نقصان کا خطرہ تھا۔ چناں چہ اسی ہجرت کے دوران میں نجاشی کا ایک حریفِ سلطنت اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کے درمیان جنگ کی نوبت آگئی۔ اس موقع پر مسلمانوں کی فطری خواہش تھی کہ نجاشی اس میں کام یاب ہو اور اس کا اقتدار قائم رہے۔ کوئی ایسا شخص ملک پر قابض نہ ہو جائے جس کے بارے میں معلوم نہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ اس کا کیا رویہ ہوگا؟ اس کی تفصیل حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں۔ فرماتی ہیں:

ہم نجاشی کی سلطنت میں امن وسکون کے ساتھ رہ رہے تھے کہ اسی اثنا میں ایک شخص سلطنت کا دعوے دار بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ قسم خدا کی، اس وقت جیسا غم وحزن ہم پر طاری رہا اس طرح کا غم وحزن میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ نجاشی ہمارے حقوق پہچان رہا تھا۔ ڈر تھا کہ اس کا حریف غالب آجائے اور جو حقوق ہمیں حاصل ہیں وہ انھیں پامال نہ کر دے۔ نجاشی اپنے حریف سے مقابلہ آرائی کے لیے نیل کے پار پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نے آپس میں کہا کہ ہم میں سے کون شخص ہے جو میدانِ جنگ تک پہنچ کر صورت حال سے ہمیں آگاہ کرے۔ حضرت زبیر بن عوامؓ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ سب سے کم سن تھے، اس لیے حیرت کا اظہار کیا گیا، لیکن بہر حال ان کے لیے تیرنے کا سامان فراہم کیا گیا اور وہ دریائے نیل پار کر کے میدانِ جنگ تک پہنچے۔ ہم لوگ دعا

---

[1] ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ: ۲/۱۶۔ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۲۹

کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نجاشی کو دشمن پر غلبہ عطا کرے اور ملک پر اس کا اقتدار قائم رہے۔ اب ہم نتیجہ کا انتظار کرنے لگے کہ حضرت زبیرؓ دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے اور دور ہی سے کپڑا لہرا کر بتایا کہ خوش ہو جاؤ، نجاشی کام یاب ہو گیا ہے اور اللہ نے اس کے دشمن کو ہلاک کر دیا ہے۔ ملک پر اس کا اقتدار مستحکم ہو گیا ہے۔ فرماتی ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ کبھی ہم اتنے خوش ہوئے ہوں (غالباً مراد ہجرتِ حبشہ کے دوران میں) جتنے اس وقت خوش ہوئے۔ ہم حبشہ ہی میں رہے، یہاں تک کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مکہ واپس پہنچے[۱] (یہ پہلی ہجرتِ حبشہ کا ذکر ہے)

جنگ خیبر ۶ھ کے آخر میں یا بقول ابن اسحاق محرم الحرام ۷ھ میں ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن امیہ ضمریؓ کو نجاشی کے پاس بھیجا کہ جو اصحاب حبشہ میں رہ گئے ہیں انھیں مدینہ بھیج دے۔ نجاشی نے دو کشتیوں میں انھیں روانہ کیا۔ یہ حضرات فتح خیبر کے دن پہنچے۔ ان میں حضرت جعفرؓ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان سے چمٹ گئے اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ فرمایا: مجھے نہیں معلوم کہ آج فتح خیبر کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کی آمد کی؟ اس قافلہ میں سولہ [۱۶] آدمی تھے۔ بعض کے ساتھ ان کی بیویاں اور چھوٹے بچے بھی تھے[۲]

ہجرتِ حبشہ سے مستنبط ہونے والے دروس

ہجرتِ حبشہ کی جو تفصیل اوپر بیان ہوئی ہے اس سے بعض اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

۱-حبشہ ہجرت کرنے کی صحابہ کرام کو اس وقت اجازت دی گئی جب کہ مکہ کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو گئی، دین پر قائم رہنا دشوار سے دشوار تر ہو گیا اور دعوت کی

---

۱ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۷۵-۳۷۶۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۱/ ۶۰۰ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۳۳

۲ مہاجرین حبشہ میں سے جو افراد بدر میں شریک نہیں ہو سکے، رسول اللہ ﷺ کے قیام مکہ کے زمانہ میں مکہ واپس نہیں آئے اور ہجرتِ مدینہ کے بعد مدینہ پہنچے ان کی تعداد ابن اسحاق نے ان سولہ کے علاوہ چونتیس [۳۴] بتائی ہے۔ خواتین خالص عرب کی ۱۳ اور باہر کی ۵ تھیں۔ پوری تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۴/ ۱۵۰۵

راہیں مسدود ہو گئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہتے ہوں، وہاں دین پر عمل کی اگر آزادی ہے، دعوت کے مواقع حاصل ہیں اور اس کی راہیں کھلی ہیں تو اس ملک کو چھوڑنے یا وہاں سے ہجرت کا جواز ان کے لیے نہیں ہے۔ ان کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ وہیں قیام کریں اور دین پر عمل کرتے ہوئے اس کی دعوت و تبلیغ اور سربلندی کی جدوجہد جاری رکھیں۔ (تلاشِ معاش یا کسی دنیوی غرض سے کسی ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہونا یا رہائش اختیار کرلینا ہجرت نہیں ہے)۔

۲- ہجرت کرنے والوں نے انتہائی بے بسی اور مجبوری کی حالت میں اپنا وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا اور اپنے خویش و اقارب سے قطعِ تعلق کیا اور اجنبیت کی زندگی اختیار کی۔ کوئی تن تنہا تھا، کوئی جوان بیوی اور ننھے اور معصوم بچہ کے ساتھ تھا، کسی کے پاس سواری تھی، زیادہ تر پیدل تھے، تن بہ تقدیر ایک نامعلوم مستقبل کی طرف چل پڑے۔ وہ قدم قدم پر اس بات کا ثبوت فراہم کرتے چلے جا رہے تھے کہ اللہ کا دین ان کے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دے سکتے ہیں۔ اسی جذبہ نے انھیں دنیا اور آخرت کی کام یابی سے ہم کنار کیا۔

۳-حبشہ ایک غیر اسلامی اور عیسائی سلطنت تھی، لیکن وہاں مسلمانوں کو اسلامی عقیدے پر قائم رہنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی آزادی تھی۔ تبلیغ کے مواقع بھی حاصل تھے۔ اس پہلو سے وہ مہاجرین کے لیے دارالامن بن گیا۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر کسی ملک میں اسلام پر قائم رہنا سخت دشوار ہو جائے اور کوئی دارالاسلام، جہاں مسلمان ہجرت کر سکیں، موجود نہ ہو، تو وہ کسی غیر اسلامی ملک میں، جہاں دین پر عمل اور اس کی دعوت و تبلیغ کی آزادی حاصل ہو، ہجرت کر سکتے ہیں۔

۴-نجاشی کا ایک حریف، سلطنت کا دعوے دار بن کر اس کے خلاف کھڑا ہوا۔ دونوں کے درمیان معرکہ آرائی کی نوبت آگئی، اس میں مسلمانوں کی ہمدردی نجاشی کے ساتھ تھی، اس لیے کہ نجاشی عدل و انصاف کا علم بردار تھا، ظلم و زیادتی کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔

اس نے مملکت میں یہ اعلان کر رکھا تھا کہ کسی شخص کو مسلمانوں پر دست درازی کی اجازت نہ ہوگی، ورنہ اس پر جرمانہ عائد ہوگا۔ اس طرح نجاشی نے ان کے دین اور ان کی جان، مال اور عزت وآبرو کے لیے تحفظ فراہم کیا تھا۔ اس کے حریف کے بارے میں یہ بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی تھی کہ وہ اسی طرح کا رویہ اختیار کرے گا، اس لیے مسلمانوں کی ہمدردی نجاشی کو حاصل تھی اور وہ اس کی کام یابی کے آرزومند تھے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو مسلمان کسی غیر اسلامی سلطنت میں رہتے ہیں انھیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کس فرد یا گروہ کا اقتدار اسلام کے لیے اور خود ان کے لیے بہتر اور مفید ثابت ہوگا۔ جو اقتدار دینی رخ سے بہتر ہو اس کے حق میں ان کی ہمدردی ہونی چاہیے۔

۵- دعوت وتبلیغ کے معاملہ میں ہجرت حبشہ ایک نیا تجربہ تھا۔ مکے میں مشرکین سے سابقہ تھا۔ وہاں شرک کی نامعقولیت واضح کی جارہی تھی اور توحید کے دلائل دیے جارہے تھے۔ حبشہ میں مسلمان ایک نئی صورت حال سے دوچار تھے۔ اس عیسائی مملکت میں چاروں طرف عیسائیت کا چرچا تھا اور مسیحی عقائد زیر بحث تھے۔ ہجرت حبشہ سے پہلے مکہ ہی میں سورۂ مریم نازل ہوچکی تھی، جس میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کی صحیح حیثیت واضح کی جاچکی تھی۔ ان کی تعلیمات بھی تفصیل سے بیان ہوئی تھیں۔ سورۂ کہف میں ابن اللہ کے تصور کی تردید اور عیسائی تاریخ کے بعض واقعات، توحید کی دعوت اور اس پر استقامت کا ذکر تھا۔ اس طرح مہاجرین اس نئی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے پہلے سے علمی اور فکری طور پر تیار تھے۔ نجاشی کے دربار میں انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس کے مطالبہ پر قرآن کی تعلیمات کو قرآن ہی کے الفاظ میں پیش کیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس دور میں اور جس ماحول میں جو علمی وفکری سوالات ابھریں، اسلام کی دعوت کے لیے ان کا جواب فراہم کرنا ضروری ہے، ورنہ اسلام کی حقانیت ثابت نہ کی جاسکے گی اور دعوت کا حق ادا نہ ہوگا۔

۶- نجاشی اپنے دربار میں اعیانِ سلطنت اور مذہبی رہ نماؤں کے ساتھ موجود تھا۔

وہ سب اسلام سے بے خبر اور عیسائیت کے ماننے والے اور اس کے علم بردار تھے۔ ان کے درمیان حضرت جعفرؓ نے ایمانی جرأت کا زبردست ثبوت دیا۔ اسلام کے عقائد، توحید، رسالت اور آخرت کے تصور اور اس کے اخلاقیات کی وضاحت کی اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اسلام کے عقیدے کو بے کم و کاست پیش کیا۔ اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ نازک سے نازک حالات میں بھی دین کی ترجمانی اور اس کی تعبیر وتشریح میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، حالات اور ماحول کے زیر اثر اسلام کی ناقص اور نامکمل ترجمانی کی اجازت نہیں ہے۔ ان حضرات کا عزم وحوصلہ اور ایمانی جذبہ قیامت تک داعیانِ دین کے لیے نمونہ ہے۔

۷-مکہ میں ایمانیات پر زور تھا، توحید، رسالت اور آخرت کی تفصیل تھی، ان کے حق میں دلائل تھے، ان کے ماننے یا نہ ماننے کے نتائج سے آگاہ کیا جا رہا تھا۔ اللہ واحد کی عبادت و اطاعت کی ترغیب و تاکید اور اس کی معصیت و نافرمانی پر تہدید تھی، احکام میں نماز اور انفاق اور خلق خدا کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر تھا، اعلیٰ اخلاق کی تعلیم تھی، کھانے پینے میں حرام و حلال کے بعض حدود واضح کیے گئے تھے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد احکام شریعت تفصیل سے نازل ہوئے۔ مہاجرینِ حبشہ کے بارے میں تاریخ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان میں سے کتنے احکام کا انھیں علم تھا اور کتنے احکام پر وہ عمل کر پا رہے تھے؟ بہت سے احکام وہ ہیں جن پر عمل ایک با اختیار اور آزاد ماحول ہی میں ہوسکتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان مہاجرین کو اس طرح کی کتنی آزادی حاصل تھی۔ اس معاملہ میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ آدمی اپنی استطاعت کی حد تک ہی مکلف ہے۔ جو حکم اس کے دائرۂ استطاعت سے باہر ہے اس کا وہ مکلّف نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں اصولی بات یہ بیان ہوئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ (الاعراف: ۴۲)[1]	جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا ہے اور اچھے کام کیے ہیں، ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت کے مطابق ہی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

[1] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ امام ابن تیمیہؒ کی مشہور کتاب منہاج السنۃ النبویۃ: ۵/ ۱۱۰-۱۱۳

۸-روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی اسلام لے آئے تھے۔ متعدد واقعات سے ان کا اسلام پر ایمان و یقین، اللہ اور اس کے رسول سے محبت اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے حضرت جعفرؓ کی تقریر سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اپنے دربار میں کہا کہ یہی وہ آخری پیغمبر ہیں جن کی بشارت انجیل میں دی گئی ہے اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں آپ کی تعلیمات بالکل صحیح ہیں۔ آپ سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے موقع ہوتا تو میں آپ کی خدمت میں پہنچتا اور آپ کے پیر دھوتا، لیکن مملکت پر ان کا اتنا مضبوط کنٹرول نہیں تھا کہ وہ کھل کر اسلام کا اظہار کرتے۔ حبشہ کے عوام اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چناں چہ جب وہاں کے لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ ان کا عقیدہ بدل گیا ہے تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اس صورت حال کے پیش نظر نجاشی نے حضرت جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے پاس بلایا، ان کے لیے کشتیوں کا نظم کیا اور کہا کہ آپ حضرات ان کشتیوں پر سفر کے لیے تیار رہیں۔ اگر مجھے شکست ہو جائے تو جہاں چاہیں چلے جائیں، لیکن اگر مجھے فتح حاصل ہو تو حسبِ سابق یہیں قیام کریں۔ پھر ایک تحریر لکھی جس میں کلمۂ شہادت ''اشهد ان لّا اله الّا اللّٰه و اشهد انّ محمّدًا عبده و رسوله'' تھا اور یہ بھی تھا کہ نجاشی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کے بندے، اس کے رسول اور اس کی روح تھے اور اس کا کلمہ تھے جسے اس نے مریم کے اندر پھونکا تھا۔ اس تحریر کو نجاشی نے اپنی قبا کے نیچے دائیں جانب رکھ چھوڑا۔ اس کے بعد حبشہ کے باغی گروہ کے پاس پہنچا۔ وہ اس کے مقابلہ کے لیے صف باندھے تیار تھے۔ اُن سے کہا: لوگو! کیا میں اس ملک پر حکومت کا سب سے زیادہ مستحق نہیں ہوں؟ لوگوں نے جواب دیا: ہاں، آپ ہی اس کے مستحق ہیں۔ نجاشی نے سوال کیا: تم نے میرے اخلاق اور میری سیرت کیسی دیکھی؟ لوگوں نے جواب دیا: آپ بہتر سیرت کے مالک ہیں، لیکن آپ نے ہمارا دین ترک کردیا ہے اور یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے تھے۔ نجاشی نے ان سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ انھوں نے

جواب دیا کہ ہم انھیں ابن اللہ سمجھتے ہیں۔ اس پر نجاشی نے عبا کے اوپر سے سینے پر ہاتھ رکھا اور کہا: عیسیٰ ابن مریم اس سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ (نجاشی کی مراد اس تحریر سے تھی جو ان کی قبا کے نیچے تھی، لیکن مجمع نے سمجھا کہ وہ ان کے خیال کی تائید کر رہے ہیں)۔ وہ خوش اور مطمئن ہو گئے اور بغاوت ٹل گئی۔ نبی ﷺ تک بھی یہ بات پہنچی تھی[1]

اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایک عام آدمی ہی نہیں، صاحبِ حیثیت اور بااقتدار فرد بھی ایسے حالات میں گھر سکتا ہے کہ وہ اپنے ایمان کا اعلان اور اظہار نہ کر سکے۔ شریعت پر نجاشی کس حد تک عمل کر رہے تھے، اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ شریعت پر کھل کر عمل کرنا شاید ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اتنی بات طے ہے کہ وہ حج، ہجرت اور جہاد جیسے احکام پر عمل نہیں کر سکے اور اپنی مملکت میں اسلامی احکام بھی نافذ نہ کر سکے، لیکن اس کے باوجود کفر و شرک کے ماحول میں اسلام اور مسلمانوں سے ان کی ہمدردی جاری رہی۔ مہاجرین کو اپنے ہاں جگہ دی۔ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا۔ ان کی ہر طرح حفاظت کی، رسول اللہ ﷺ کے فرمان پر حضرت ام حبیبہؓ کا آپ سے نکاح کیا اور بڑے اہتمام سے رخصت کیا[2]

حضرت جعفرؓ کا قافلہ جب روانہ ہونے لگا تو کشتیاں فراہم کیں، سفر کا انتظام کیا اور پورے ساز و سامان کے ساتھ روانہ کیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو میرے رویہ اور سلوک کی اطلاع دیں۔ یہ میرا ایک ساتھی (عزیز) آپ حضرات کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جا رہا ہے۔ کلمہ شہادت پڑھا اور کہا کہ آپ حضرات حضورؐ سے درخواست کریں کہ وہ میری مغفرت کی دعا فرمائیں۔ خیبر پہنچنے پر نجاشی کے روانہ کردہ شخص نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ جعفر یہاں موجود ہیں۔ آپ ان سے دریافت فرمائیں کہ نجاشی کا رویہ ان کے ساتھ کیسا تھا اور ان کا عقیدہ کیا ہے؟ حضرت جعفرؓ نے تفصیل بتائی اور کہا کہ وہ آپ پر ایمان رکھتے ہیں اور آپ سے دعا کی درخواست کی ہے۔ آپؐ نے وضو کیا

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۷۸-۳۷۹۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ: ۲/ ۲۸-۲۹

[2] اس کی پوری تفصیل برہان الدین حلبی نے بیان کی ہے۔ السیرۃ الحلبیہ: ۲/ ۷۵۸-۷۵۹

اور تین مرتبہ فرمایا: اے اللہ! نجاشی کی مغفرت فرما۔ اس پر مسلمانوں نے آمین کہا۔[1]

نجاشی کا ۹ھ میں انتقال ہوا۔[2] رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے مدینہ میں منادی کرائی کہ حبشہ کے ایک صالح بندے کا انتقال ہو گیا ہے، لوگو، چلو اس کی نماز جنازہ پڑھو، اس کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: تمہارے بھائی اصحمہ (نجاشی کا نام) کا انتقال ہو گیا ہے، چلو اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے، چناں چہ آپ لوگوں کو لے کر عید گاہ تشریف لے گئے اور نماز پڑھی۔[3]

بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ نے نجاشی کی نماز جنازہ اس لیے پڑھی کہ حبشہ میں ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی۔ ان کے قریب ایسے لوگ نہیں تھے جو اسلام پر ایمان رکھتے اور نماز جنازہ پڑھتے ہوں۔[4]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نجاشی کس طرح کے ماحول میں گھرے ہوئے تھے۔ اس طرح کے حالات اور ماحول میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا، شاید اس سے زیادہ وہ نہیں کر سکتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان مجبوریوں اور معذوریوں کے ساتھ ان کے ایمان اور خلوص کی تصدیق فرمائی۔ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی اور مغفرت کی دعا فرمائی۔ ان کی کام یابی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔

(سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۰ء)

---

[1] ابن کثیر، السیرۃ النبویہ: ۲/ ۱۶

[2] علامہ ابن کثیر کہتے ہیں کہ سہیلی کے بقول نجاشی کی موت رجب ۹ھ میں ہوئی، لیکن یہ قابلِ غور ہے۔ السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۳۰۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اکثر اصحابِ علم کے نزدیک نجاشی کی موت ۹ھ میں ہوئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کا انتقال ۸ھ میں فتح مکہ سے پہلے ہوا تھا۔ فتح الباری: ۷/ ۵۸۸

[3] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب موت النجاشی۔ یہ روایت بخاری، کتاب الجنائز کے متعدد ابواب میں آئی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو، مسلم، کتاب الجنائز، باب فی التکبیر علی الجنازۃ۔

[4] ابن کثیر، السیرۃ النبویہ: ۲/ ۲۹-۳۰- غائبانہ نماز جنازہ پر فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھی جائے فتح الباری: ۳/ ۵۴۴-۵۴۵

غیر مسلم سردارانِ قبائل کا تعاون

عرب کا نظام قبائلی تھا۔اس میں قبیلہ کے افراد کے درمیان ایک دوسرے کی حمایت کا بہت ہی قوی جذبہ پایا جاتا تھا۔قبیلہ کے ایک فرد پر بھی دست درازی ہوتی تو پورے قبیلے میں آتشِ غضب بھڑک اٹھتی اور بعض اوقات انتقام لیے بغیر فرو نہ ہوتی۔ اسی طرح قبیلہ کا سردار دوسرے قبیلے کے کسی فرد کو امان یا تحفظ فراہم کر دے تو اسے پورے قبیلے کی طرف سے امان سمجھا جاتا، اپنے ہی ایک فرد کی طرح اس کی حمایت کی جاتی۔ کسی کو اس پر ہاتھ اٹھانے یا اس سے ناروا سلوک کرنے کی اجازت نہ ہوتی۔

عرب کے اس قبائلی نظام کے تحت رسول اللہ ﷺ کو آپ کے قبیلے کی حمایت حاصل تھی۔ اس میں وہ افراد بھی تھے جو اسلام کی دولت سے سرفراز تھے اور وہ بھی جو دینِ آبا پر قائم تھے۔قبیلہ کی اس حمایت کی وجہ سے آپ کو اپنے قبیلہ کے اندر اور باہر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے نسبتاً زیادہ مواقع حاصل تھے۔ اس مقصد سے آپ نے حسب ضرورت دوسرے سردارانِ قبائل کی حمایت یا ان کا تحفظ حاصل کرنے کی بھی کوشش کی اور جب انہوں نے حمایت کی تو ان کے کفر وشرک کے باوجود اس سے دعوت وتبلیغ کی راہ میں فائدہ اٹھایا۔لیکن کسی بھی موقع پر اپنے اصول ونظریات کو پیش کرنے میں مداہنت اور کفر وشرک سے مفاہمت کی راہ نہیں اختیار کی۔ دین پر آپ کی استقامت اور دعوت الی اللہ کی وجہ سے کسی بھی مرحلہ میں نصرت وحمایت سے انکار کیا گیا تو اسے گوارا فرمایا، ہر طرح کی مشکلات برداشت کیں اور کارِ دعوت جاری رکھا۔ یہی طریقہ صحابہ کرامؓ کا بھی تھا۔

ابوطالب کی حمایت

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد آپ کے چچا ابوطالب دس سال زندہ رہے۔ اس پوری مدت میں، ان کی حمایت اور پناہ آپ کو حاصل رہی۔ ہر نازک موقع پر وہ آپ کی حمایت میں کھڑے ہو جاتے، جس کی وجہ سے مخالفین کو آپ کے خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ابوطالب کی یہ حمایت کسی دینی اور اسلامی جذبہ کی وجہ سے نہیں، بلکہ آپ سے ذاتی اور قلبی تعلق اور قبائلی حمیت کی بنا پر تھی۔ یہی بات علامہ ابن کثیرؒ نے ان الفاظ میں کہی ہے۔

كان رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه و سلم أحبّ خلق اللّٰه اليه (الى أبى طالب) طبعاً، و كان ليحنو عليه و يحسن اليه و يدافع عنه و يحامي، و يخالف قومه فى ذلك مع انه على دينهم و على خلّتهم الاّ ان اللّٰه قد امتحن قلبه بحبه حبّاً طبيعيًا لاَ شرعياً[1]

رسول اللہ ﷺ ابوطالب کو طبعی طور پر خلقِ خدا میں سب سے زیادہ محبوب تھے۔ وہ آپ پر شفقت فرماتے، حسن سلوک کرتے، آپ کا دفاع اور آپ کی حمایت کرتے اور اس معاملہ میں اپنی قوم کی مخالفت کرتے، حالاں کہ وہ خود ان کے دین اور ان کے طریقے پر قائم تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کا دل آپ کی محبت کے لیے خالص کر دیا تھا۔ یہ محبت طبعی تھی، شرعی نہیں تھی۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ابوطالب کے اپنے دین پر قائم رہنے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کار فرما تھی۔ وہ ایمان لے آتے تو آپ کی حمایت جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ قریش کے نزدیک ان کی عظمت وعزت باقی نہ رہتی اور ان کی بات کا اعتبار نہ ہوتا۔ اس صورت میں وہ ان سے خوف کھاتے اور نہ احترام کرتے، بلکہ ان کے خلاف صف آرا ہو جاتے اور اپنی طاقت انہیں نیچا دکھانے میں لگا دیتے[2]

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

---

[1] ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/۴۶۱۔ نیز ملاحظہ ہو، ص: ۴۶۴

[2] حوالۂ سابق

''ابوطالب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دفاع کرتے۔ جو شخص آپ کو تکلیف پہنچانا چاہتا اسے دور رکھتے، حالاں کہ وہ خود اپنی قوم کے دین پر قائم تھے۔''[۱]

ابوطالب کی حمایت کا فائدہ

ابوطالب کی حمایت کی وجہ سے مخالفین آپ کے خلاف کوئی سخت قدم نہیں اٹھا سکے، لیکن ابوطالب کے انتقال کے بعد مخالفین کے حوصلے بلند ہو گئے۔ انہوں نے آپؐ کو ایسی اذیتیں دینی شروع کر دیں جن کی وہ پہلے ہمت نہیں کر پاتے تھے۔ خود رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ما نالت قریش منّی ما اکرهه حتی مات ابو طالب[۲]	قریش نے میرے ساتھ کوئی ناپسندیدہ حرکت ابوطالب کے انتقال تک نہیں کی۔

علامہ ابن اثیرؒ نے آپ کے اس ارشاد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابو طالب کی وفات کے بعد قریش آپ کے ساتھ وہ زیادتیاں کرنے لگے جن کی وہ ابو طالب کی حیات میں ہمت نہیں کر پاتے تھے، حتّٰی کہ کوئی سر مبارک پر مٹی ڈال دیتا، آپ مکان میں نماز کی حالت میں ہوتے تو کوئی بکری کی اوجھڑی آپ پر پھینک دیتا، آپ ایک لکڑی پر اسے رکھ کر باہر تشریف لاتے اور فرماتے: اے بنو عبد مناف! یہ کیسی ہم سایگی ہے؟ پھر اسے راستہ میں (باہر کہیں) ڈال دیتے۔[۳]

علامہ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ ''آپ کو تکلیف پہنچانے کے جو واقعات ہیں، جیسے گردن پر اوجھ ڈالنا وغیرہ، یہ سب میرے خیال میں ابوطالب کے انتقال کے بعد پیش آئے۔''[۴]

---

۱ ابن حجر، فتح الباری: ۷/ ۵۹۱

۲ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۳۰۔ یہی بات طبری نے بھی کہی ہے۔ تاریخ الامم والملوک: ۱/ ۵۵۳

۳ الکامل فی التاریخ: ۱/ ۶۰۶-۶۰۷

۴ تفصیل کے لیے دیکھی جائے: ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۱۴۶-۱۴۸۔ ابن ہشام، طبری اور ذہبی وغیرہ مورخین کا بھی یہی رجحان نظر آتا ہے، اس لیے کہ انہوں نے آپ کے ساتھ زیادتی کے واقعات کا ذکر ابوطالب کی وفات کے بعد ہی کیا ہے۔

جناب ابو طالب پوری قوم میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی حمایت اور پشت پناہی سے رسول اللہ ﷺ کو تبلیغ دین میں یقیناً مدد مل رہی تھی، آپ نے کسی بھی مرحلہ میں اس حمایت کو رد نہیں کیا اور اپنے موقف کے اظہار میں بھی کبھی پس و پیش نہیں کیا، بلکہ یہ واضح کر دیا کہ اگر ابو طالب حمایت سے دست کش ہو بھی جائیں تو آپ کی دعوتی مساعی جاری رہیں گی۔

اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی طرف سے دعوت الی اللہ کی جدوجہد جاری تھی، ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا تھا۔ اس کے ساتھ آپ کی مخالفت میں بھی زیادہ شدت آ گئی۔ اس مرحلہ میں قریش کے نمایاں افراد نے ابو طالب کو رسول اللہ ﷺ کی حمایت سے باز رکھنے کی بار بار کوشش کی۔ ایک مرتبہ ان سے کہا: آپ ہمارے درمیان سن رسیدہ ہیں اور آپ کو مقام شرف و منزلت حاصل ہے۔ ہم نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ اپنے برادر زادے کو اپنی تبلیغ سے منع کر دیں، لیکن آپ نہیں کر سکے۔ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے آبا و اجداد کو نافہم اور غلط کار کہیں، ہمیں بے وقوف سمجھیں اور ہمارے معبودوں پر تنقید کریں۔ آپ انہیں اس سے باز رکھیں یا ہمارے اور آپ کے درمیان محاذ آرائی ہو اور ہم میں سے ایک فریق ختم ہو جائے۔

ابو طالب سردارانِ قریش کی اس تہدید سے مضطرب ہو گئے۔ ان کے لیے اپنی قوم کو چھوڑنا اور ان کی دشمنی اور عداوت کا سامنا کرنا بھی دشوار تھا اور وہ اس کے لیے بھی آمادہ نہ تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی حمایت سے دست کش ہو جائیں اور آپ کو دشمنوں کے حوالہ کر دیں۔

سردارانِ قریش کے لوٹنے کے بعد ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کو یاد کیا۔ آپ تشریف لائے تو ان لوگوں کی گفتگو نقل کی اور کہا: تم مجھ پر بھی اور اپنے اوپر بھی رحم کھاؤ۔ مجھ پر اتنا بار نہ ڈالو کہ میں اس کا متحمل نہ ہو سکوں۔ رسول اللہ ﷺ کو اس گفتگو سے خیال ہوا کہ شاید آپ کے چچا نے اس معاملہ میں کچھ سوچ لیا ہے اور وہ آپ کی حمایت جاری

نہیں رکھ سکیں گے۔ اس پر آپ نے پورے عزم کے ساتھ کہا: چچا جان! قسم خدا کی، اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں اور چاہیں کہ میں اس کام کو ترک کردوں تو یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یا تو اللہ تعالیٰ اس میں کام یابی عطا کرے گا یا میں اسی سعی و جہد میں ختم ہوجاؤں گا۔ یہ کہہ کر آپ شدتِ جذبات سے آب دیدہ ہوگئے اور جانے لگے۔ ابو طالب شاید آپ کے ان کلماتِ عزیمت سے ہل گئے۔ آواز دی: یاابن اخی! (اے میرے بھتیجے) ادھر آؤ، آپ تشریف لائے تو کہا: جاؤ جس دین کی تم دعوت دے رہے ہو اسے جاری رکھو، میں کسی قیمت پر تمہیں دشمنوں کے حوالے نہیں کروں گا۔[۱]

ابو طالب کے مرض الموت کا واقعہ ہے، جسے متعدد محدثین اور سیرت نگاروں نے نقل کیا ہے۔ قریش کے نمایاں افراد جمع ہوئے اور طے کیا کہ اس وقت ابو طالب سے ملاقات ہونی چاہیے۔ ان کے بعد ہم کوئی سخت قدم اٹھائیں گے تو عرب عار دلائیں گے کہ ابو طالب کی حیات میں تو انہیں ہمت نہیں ہوئی۔ جب وہ دنیا سے چلے گئے تو ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ ان لوگوں نے ملاقات کرنی چاہی تو ان کا ایک نمائندہ ابوطالب کے پاس پہنچا اور کہا کہ قوم کے سردار موجود ہیں اور وہ آپ سے ملاقات چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا: بہت اچھا، ان سے کہو کہ اندر آجائیں۔ ان لوگوں نے ابو طالب سے کہا: آپ ہمارے بزرگ اور سردار ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنے برادر زادے کے معاملہ میں ہمارے ساتھ انصاف کریں۔ ان سے کہیں کہ وہ ہمارے معبودوں کی مذمت نہ کریں۔ ہم ان کے خدا کے بارے میں کچھ نہیں کہیں گے۔ ابو طالب نے آپ کو یاد فرمایا: 'یا ابن اخی' (اے میرے بھتیجے) یہ دیکھو تمہاری قوم کے سردار جمع ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم ان کے معبودوں پر تنقید نہ کرو اور تم جس خدائے واحد کی طرف دعوت دیتے ہو اس سے وہ تعرض نہیں کریں گے۔ ابوطالب نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اس وقت سردارانِ قبائل تمھارے سامنے موجود ہیں، بتاؤ تم ان کی اس پیش کش پر کیا کہتے ہو؟

---

[۱] ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۱/ ۳۰۲-۳۰۳

آپ نے فرمایا: میں اس سے بہتر بات ان کے سامنے پیش کر رہا ہوں:

ادعوهم الی ان یتکلموا بکلمة تدین لهم بها العرب و یملکون بها العجم.

میں انہیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ ایک کلمہ زبان سے ادا کر دیں۔ اس سے عرب ان کے سامنے سرنگوں ہوگا اور وہ عجم کے مالک ہوں گے۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

یا عم! انی اریدهم علی کلمة واحدة یقولونها تدین لهم بها العرب و تودی الیهم بها العجم الجزیة

چچا! میں ان سے ایک کلمہ چاہتا ہوں۔ اگر وہ اسے قبول کر لیں تو سارا عرب ان کے تابع ہوجائے گا اور عجم ان کا باج گزار ہوگا۔

اس پر ابوجہل اور دوسرے سرداروں نے کہا: تمہارے باپ کی قسم، وہ کیا بات ہے جس سے اتنی بڑی چیز حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے تو ہم تمہاری دس باتیں سننے کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا: وہ کلمہ ہے لا الہٰ الا اللہ۔ (تم توحید کا اقرار کرو اللہ واحد کے ساتھ جن خداؤں کو شریک کر رکھا ہے ان سے کنارہ کش ہوجاؤ)۔ اس پر سب لوگ بدک گئے اور کہنے لگے کہ انہوں نے تو سارے خداؤں کی خدائی ختم کر دی اور ایک خدا کا ذکر چھیڑ دیا۔ ہم ان کی ضرور مخالفت کریں گے۔[1]

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں: ایک یہ کہ نازک سے نازک موقع پر بھی رسول اللہ ﷺ اپنے موقف پر ثابت قدم رہے۔ ایک مرحلہ میں آپ نے محسوس کیا کہ ابوطالب شاید اپنی حمایت نہ جاری رکھ سکیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ آپ اپنی دعوت سے کسی قیمت پر دست بردار نہ ہوں گے۔

---

[1] ابن کثیر نے اس تفصیل کے لیے طبری، ابن ابی حاتم، مسند احمد، نسائی اور ترمذی کی مختلف روایات کا حوالہ دیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۷/۵۔ تفسیر سورہ ص آیت نمبر ۵) ترمذی کی روایت ہے کہ ابو طالب نے آپ سے کہا: تم اپنی قوم سے کیا چاہتے ہو؟ آپ نے فرمایا: **ارید منهم کلمة واحدة تدین لهم بها العرب و تؤدّی الیهم العجم الجزیة**۔ پھر آپ نے فرمایا: وہ کلمہ ہے 'لا الہٰ الا اللہ'۔ اس پر سرداران مجلس کہنے لگے کہ یہ بات تو ہم نے کہیں نہیں سنی۔ یہ ایک من گھڑت ہے۔ ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب من سورۃ ص۔ نیز ملاحظہ ہو: سیرۃ ابن ہشام: ۲/۳۰-۳۱

دوسری بات اس سے یہ سامنے آتی ہے کہ کلمۂ توحید قوموں کی سربلندی کا ذریعہ ہے۔ قریش اسے قبول کرلیں تو بہت جلد عرب وعجم کا اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہوگا اور دنیا کی قیادت و راہ نمائی کے مقام پر فائز ہوں گے۔ اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ مکہ میں آپ کی دعوت سیاسی غلبہ کے تصور سے خالی تھی۔ مدینہ پہنچنے کے بعد آپ نے سیاسی قائد کی حیثیت اختیار کرلی۔ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں آپ نے جو اقدامات کیے وہ مکہ کی دعوت ہی کا تسلسل تھے۔

ابولہب کی حمایت

ابوطالب کی وفات کے بعد آپ پر زیادتیاں ہونے لگیں۔ آپ پر اس کا فطری اثر ہوا۔آپ مکان ہی میں زیادہ تر رہنے لگے۔ بہت کم باہر نکلتے تھے۔

ابولہب کو اس کا علم ہوا تو اس نے آپ سے کہا کہ آپ ابوطالب کے زمانہ میں جو کچھ کر رہے تھے اسے جاری رکھیں۔قسم ہے لات (معبود) کی، جب تک میں زندہ ہوں آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ ظاہر ہے، اس کے پیچھے صرف قبائلی حمیت کارفرما تھی۔

ایک مرتبہ ابن الغیطلہ نے آپ کے ساتھ بدزبانی کی تو ابولہب آگے بڑھا اور اس کا بری طرح جواب دیا۔ وہ چیختا ہوا نکلا کہ قریش کے لوگو! ابوعتبہ (ابولہب) بے دین ہوگیا ہے۔ اس پر قریش کے لوگ صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے ابولہب کے گھر پہنچے۔ اس نے کہا: میں نے اپنے باپ عبدالمطلب کا دین نہیں چھوڑا ہے، لیکن اپنے بھتیجے پر زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔ اسے اپنی مرضی کے مطابق کام جاری رکھنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ لوگوں نے کہا: تم نے ٹھیک کیا، رشتہ داری کا حق ادا کیا ہے۔ اس کے بعد کچھ دن تک آزادی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی آمد ورفت جاری رہی۔ کوئی آپ سے تعرض نہیں کرتا تھا۔ سب کو ابولہب کا خوف تھا۔ اسی اثنا میں عقبہ بن ابی معیط اور ابوجہل بن ہشام اس کے پاس پہنچے اور کہا: کیا تمہارے بھتیجے نے تمہیں کچھ بتایا ہے کہ تمہارے باپ عبدالمطلب کا ٹھکانا کہاں ہے؟ اس نے آپ سے دریافت کیا تو آپ

نے فرمایا: وہ اپنی قوم کے ساتھ ہیں۔ اس نے ان دونوں کو آپ کے جواب سے مطلع کیا۔ ان دونوں نے کہا: وہ تو کہہ رہے ہیں کہ ان کا ٹھکانا نارِ جہنم ہے۔ اس نے پھر آپ سے پوچھا کہ کیا عبدالمطلب جہنم میں جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! جس شخص کی بھی موت عبدالمطلب کے دین پر ہوگی وہ جہنم میں جائے گا۔ ابولہب خفا ہوگیا اور کہا کہ میں تمہارا ابدی دشمن ہوں۔ تم تو کہتے ہو کہ عبدالمطلب جہنم میں جائیں گے۔ اس کے بعد اس کا اور قریش کا رویہ سخت ہوگیا[1]

ابولہب کی حمایت اور پشت پناہی خالص قبائلی عصبیت کے تحت تھی۔ آپ نے اپنی دعوتی جدوجہد میں اس سے فائدہ ضرور اٹھایا، لیکن جب اس نے عبدالمطلب کے اخروی انجام سے متعلق سوال کیا تو آپ اپنے موقف پر قائم رہے اور اس کا صاف صاف اظہار کیا کہ شرک کے ساتھ آخرت میں نجات نہیں ہوسکتی۔ اس پر وہ برہم ہوگیا اور اپنی حمایت ختم کر دی۔ آپ نے اس کی پروانہیں کی۔

مطعم بن عدی کی پناہ

ابوطالب کی وفات کے بعد ہی کا واقعہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ طائف سے واپس ہوئے تو آپ نے محسوس فرمایا کہ اب قریش پہلے سے زیادہ آپ کے معاملے میں جری ہو جائیں گے۔ حضرت زیدؓ نے بھی، جو آپ کے ساتھ تھے، کہا کہ قریش نے تو ایک طرح سے آپ کو مکہ سے نکال دیا ہے۔ آپ کو کیسے داخل ہونے دیں گے؟ آپ نے عبداللہ بن اریقط کو، جس سے واپسی میں ملاقات ہوگئی تھی، اخنس بن شریق کے پاس بھیجا کہ وہ آپ کو پناہ دے، تاکہ اللہ کا دین اس کے بندوں تک پہنچائیں۔ اس نے کہا: میں خود حلیف ہوں۔ حلیف پناہ نہیں دے سکتا۔ پھر آپ نے سہیل بن عمرو کے پاس اسی قاصد کو روانہ کیا کہ وہ آپ کو پناہ دے۔ اس نے کہا کہ بنو عامر بنو کعب کے

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۱۱۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/۱۴۸۔ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۵۰-۵۱

خلاف پناہ نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد مطعم بن عدی کے پاس قاصد آپ کی یہی درخواست لے کر گیا۔ وہ تیار ہو گیا۔ آپ مکہ پہنچے۔ رات اس کے گھر گزاری، صبح مطعم بن عدی اور اس کے چھ سات لڑکے اور اس کے بھائی کے لڑکے سب مسلح ہو کر آپ کو حرم میں لے گئے۔ آپ سے طواف کے لیے کہا اور یہ تلواریں حمائل کیے کھڑے رہے۔ ابوجہل (اور بعض روایات کے مطابق) حضرت ابوسفیان نے، جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، مطعم سے پوچھا: کیا تم نے پناہ دی ہے یا ان کے ساتھ ہو؟ اس نے کہا: میں نے پناہ دی ہے۔ انہوں نے کہا: تمہاری پناہ توڑی نہیں جائے گی، اس کا احترام ہوگا۔ تم نے جسے پناہ دی اسے ہم نے پناہ دی۔ آپ طواف سے فارغ ہوئے تو مطعم نے آپ کو گھر پہنچایا[1]

مطعم بن عدی کے اس حسن سلوک کی وجہ سے، یا اس وجہ سے کہ قریش نے بنو ہاشم کا جو مقاطعہ کر رکھا تھا، اسے ختم کرانے میں اس نے اہم رول ادا کیا تھا (یہ دونوں ہی باتیں ہوسکتی ہیں) آپ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں فرمایا کہ مطعم ان مرداروں کی سفارش کرتا تو میں انہیں چھوڑ دیتا[2]

صحابہ کرام نے بھی حسب ضرورت غیر مسلم سرداروں کی پناہ حاصل کی۔ یہ بھی ہوا کہ جب انہوں نے اسے دین کے وقار کے منافی سمجھا تو یہ پناہ رد کر دی۔

حضرت ابوبکرؓ کو ابن الدغنہ نے پناہ دی

اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو قارہ کے سردار ابن الدغنہ نے پناہ دی اور قریش کے درمیان اس کا اعلان کر دیا۔ قریش نے اس پناہ کو قبول کیا اور کہا: آپ ابوبکر سے کہیے کہ وہ اپنے رب کی عبادت اپنے گھر کے اندر کریں اور نماز میں جو

---

[1] طبری، تاریخ الامم و الملوک: ۱/۵۵۵۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/۱۵۳۔ زرقانی، شرح المواھب اللّدنیۃ: ۲/۶۶۔ ابن سعد نے اختصار کے ساتھ اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۱۲

[2] زرقانی، حوالہ سابق

چاہیں پڑھیں، اس کا اظہار و اعلان نہ کریں، اس لیے کہ اس سے ہماری عورتوں اور ہمارے بچوں کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔ چناں چہ حضرت ابوبکرؓ اس پر چند دن عمل کرتے رہے۔ بعد میں مکان کے صحن میں مسجد بنا لی اور زور زور سے نماز اور قرآن پڑھنے لگے۔ حضرت ابوبکرؓ قرآن مجید اس سوز سے پڑھتے تھے کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے تھے۔ یہ دیکھ کر قریش نے ابن الدغنہ سے کہا: تم نے ابوبکر کو پناہ دی اور ہم نے اسے مان لیا۔ انہیں گھر کے صحن میں باآواز بلند نماز پڑھنے سے منع کرو۔ اگر وہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوں تو ان سے کہو، وہ تمہاری پناہ ختم کر دیں۔ چناں چہ ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ سے ملاقات کی اور کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ عرب مجھے بدعہد کہیں۔ اب یاتو آپ اپنی نماز اور عبادت کو گھر کے اندر محدود رکھیں یا خود ہی اعلان کردیں کہ آپ میری پناہ میں نہیں ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں تمہاری پناہ ختم کرتا ہوں، مجھے اللہ کی پناہ کافی ہے۔ اس کے بعد جلد ہی ہجرتِ مدینہ کا واقعہ پیش آیا[۱]

حضرت عمرؓ کو ان کے ماموں کی حمایت

حضرت عمرؓ نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تو قریش ان پر ٹوٹ پڑے اور زدوکوب کرنے لگے۔ اس پر ان کے ماموں نے کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ میں نے اپنے بھانجے کو پناہ دی ہے۔ اس کے بعد لوگ چھٹ گئے[۲]

حضرت عمرؓ نے سوچا کہ یہ بات مناسب نہ ہوگی کہ عام مسلمان جو تکلیف برداشت کر رہے ہیں، میں اس سے محفوظ رہوں۔ چناں چہ انہوں نے اپنے ماموں سے کہا: مجھے آپ کی پناہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے کہا: ایسا نہ کرو۔ حضرت عمرؓ نے کہا: بہر حال مجھے آپ کی پناہ نہیں چاہیے۔

---

[۱] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبی واصحابہ الی المدینۃ۔ ابن ہشام میں تفصیلات میں تھوڑا سا فرق ہے۔ السیرۃ النبویۃ: ۱/۴۱۰-۴۱۱

[۲] ماموں سے مراد ابوجہل بن ہشام یا حارث بن ہشام ہو سکتے ہیں۔ یہ حضرت عمرؓ کے رشتے کے ماموں تھے۔ اس کا ذکر آچکا ہے۔

ابن اسحٰق کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ پر جب زیادتی ہو رہی تھی تو عاص بن وائل نے پناہ کا اعلان کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ماموں اور عاص بن وائل دونوں ہی نے اس کا اعلان کیا ہو۔

ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے حضرت عمرؓ کے قتل کا ارادہ کیا تو عاص بن وائل نے پناہ دی[۱]۔

حضرت عثمان بن مظعونؓ کو ولید بن مغیرہ کی پناہ

حضرت عثمان بن مظعونؓ کو ولید بن مغیرہ نے پناہ دی تھی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ایک مشرک کی پناہ کی وجہ سے وہ خود تو امن وسکون کے ساتھ رہ رہے ہیں اور دوسرے اصحاب تکلیف برداشت کر رہے ہیں تو انہوں نے اسے مناسب نہیں خیال کیا۔ وہ ولید کے پاس گئے اور کہا: اے عبدالشمّس! آپ نے اپنا ذمہ پورا کر دیا، اب میں آپ کی پناہ لوٹا رہا ہوں۔ اس نے پوچھا: آخر بات کیا ہے؟ کیا ہمارے کسی شخص سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے؟ انہوں نے کہا: ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اللہ کی پناہ پر خوش ہوں، کسی دوسرے کی پناہ نہیں چاہتا۔ اس نے کہا: اچھا تو حرم چلیے۔ میں نے علانیہ آپ کو پناہ دی تھی۔ آپ بھی علانیہ اسے لوٹا دیجیے۔ چناں چہ وہ اس کے ساتھ حرم تشریف لے گئے اور سب کے سامنے اس کی پناہ لوٹا دی[۲]۔

حضرت ابوسلمہؓ نے اپنے ماموں ابوطالب سے پناہ طلب کی۔ انہوں نے پناہ دے دی۔ اس پر ان کے قبیلہ (بنومخزوم) والوں نے ابوطالب سے کہا: ٹھیک ہے، آپ نے اپنے بھتیجے محمد (ﷺ) کو پناہ دے رکھی ہے۔ ہم اس کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن یہ کیا کہ آپ نے ہمارے آدمی کو بھی اپنی پناہ میں لے رکھا ہے۔ ہم اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ ابوطالب نے جواب دیا کہ ابوسلمہ نے مجھ سے پناہ طلب کی۔ میں نے پناہ

۱۔ ملاحظہ ہو شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیة: ۲/۸-۹۔ حلبی، السیرة الحلبیة: ۲/۱۶-۱۷

۲۔ ابن ہشام، السیرة النبویة: ۱/۴۰۷-۴۰۸

دے دی۔ وہ میرا بھانجا ہے۔ میرے بھانجے پر جو ظلم ہو رہا ہے اگر اسے روکنے کا مجھے حق نہیں ہے تو اپنے بھتیجے کو بھی پناہ دینے کا حق نہیں ہے۔ ابولہب نے بھی اس کی تائید کی اور کہا کہ اے اہلِ قریش! تم لوگ شیخ کے ساتھ بہت زیادتی کرنے لگے ہو۔ انہیں اپنی قوم کے کسی فرد کو پناہ دینے کی اجازت بھی نہیں دے رہے ہو۔ قسم خدا کی، اس سے باز آجاؤ، ورنہ وہ جو بھی قدم اٹھائیں گے ہم ان کے ساتھ ہوں گے۔ چوں کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں ابولہب کی تائید انھیں حاصل تھی اس لیے وہ اسے ناخوش کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا: آپ جو چاہیں گے وہی ہوگا۔ چناں چہ اس پناہ کو انہوں نے باقی رکھا[۱]

قریش کے جن غیر مسلم سردارانِ قبائل نے پناہ دی یا ان سے پناہ حاصل کی گئی، اس کے دو مقصد ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس وقت کے ناسازگار حالات میں آدمی ذاتی ضرر اور تکلیف سے محفوظ رہے، یا زیادہ سے زیادہ بیوی بچوں اور گھر والوں کو کسی بڑے نقصان سے بچالے۔ دوسرے یہ کہ اس سے کفر اور شرک کے ماحول میں دعوت و تبلیغ کے مواقع حاصل ہوں اور اس کی راہیں کھلیں۔ پہلی صورت میں جہاں یہ ذاتی وقار کے منافی ہو یا دینی اور ملی نقطۂ نظر سے مفید نہ ہو، اس طرح کی پناہ کو رد کر دینا چاہیے اور وہ رد کر دی گئی۔ لیکن اگر اس سے تبلیغِ دین کے مواقع حاصل ہوں اور دعوت کی راہ کھلنے کے امکانات ہوں تو اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یہ اس حکمت عملی کا ایک حصہ ہے جو مکہ کے ماحول میں اختیار کی گئی۔

مکہ سے باہر کے قبائل میں دعوت اور تعاون کی درخواست

مکہ کے سخت ترین حالات میں بھی آپ کی دعوتی مساعی جاری رہیں۔ عرب کا کوئی معروف اور نام ور شخص مکہ آتا تو آپ اسے اسلام کی دعوت دیتے اور اس کے سامنے

---

[۱] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۰۹۔ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۱۲

اللہ کی نازل کردہ تعلیمات پیش فرماتے[۱]

حج کے موسم میں جو قبائل اطرافِ حجاز سے مکہ آتے، آپ ان کو اللہِ واحد کی عبادت، شرک سے اجتناب اور بت پرستی سے احتراز کی دعوت دیتے۔ فرماتے کہ وہ آپ پر ایمان لائیں، آپ کی تعلیمات کی تصدیق کریں اور آپ کو امان اور حفاظت فراہم کریں، تاکہ جو دین اللہ نے آپ پر نازل کیا ہے اسے دوسروں کے سامنے پیش کرسکیں[۲]

رسول اللہ ﷺ کی ان کوششوں کا کوئی مثبت جواب نہیں مل رہا تھا۔ آپ نے ایک ایک قبیلہ سے مل کر درخواست کی کہ اگر تم اس دین کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتو مجھے تحفظ فراہم کرو، تاکہ میں اسے پیش کرسکوں۔ حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے:

كان النبی ﷺ يعرض نفسه على الناس بالموقف فيقول هل من رجل يحملنی الى قومه فان قريشاً قد منعونی ان ابلغ كلام ربی.[۳]	رسول اللہ ﷺ حج کے موقع پر عرفات میں لوگوں کے پاس تشریف لے جاتے اور فرماتے کیا کوئی شخص ہے جو مجھے اپنی قوم میں لے جائے۔ اس لیے کہ قریش نے مجھے اپنے رب کا کلام پہنچانے سے روک دیا ہے۔

مسند احمد میں حضرت جابرؓ سے یہ روایت کئی جگہ آئی ہے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا مکہ میں (تبلیغ عام کے حکم کے بعد) دس سال قیام رہا۔ آپ حج کے موقع پر عکاظ، مجنّہ اور منیٰ میں لوگوں کے پاس ان کی قیام گاہوں پر پہنچتے اور فرماتے:

۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۳۸-۳۹۔ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۱۵۴

۲۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۳۶۔ حلبی کے الفاظ ہیں.... **يدعوهم الى ان يمنعوه حتىٰ يبلغ رسالاَت ربّه**۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۵۳۔ یعنی آپ ایک ایک قبیلہ کو دعوت دے رہے تھے کہ وہ آپ کو تحفظ دیں، تاکہ آپ اللہ کے پیغامات لوگوں تک پہنچا سکیں۔

۳۔ ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب فی القرآن۔ ابن ماجہ، مقدمہ، حدیث نمبر ۲۰۱

من یؤوینی من ینصرنی حتیٰ ابلغ رسالة ربی و له الجنة[1]

کون ہے جو مجھے (اپنے ہاں) جگہ دے اور میری مدد کرے، تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں۔ اس شخص کو جنت ملے گی۔

ابن شہاب زہریؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ان برسوں میں حج کے موقع پر عرب کے قبائل سے ملاقات کرتے اور ہر قوم کے شریف آدمی سے بات کرتے۔ ان سے صرف اس بات کی درخواست کرتے کہ وہ آپ کو اپنے ہاں جگہ دیں اور آپ کی مدافعت کریں۔ آپؐ فرماتے:

''میں تم میں سے کسی کو کسی بات کا جبراً پابند نہیں بناتا۔ جس چیز کی میں دعوت دے رہا ہوں اگر وہ اسے راضی خوشی قبول کرے تو ٹھیک ہے اور جو اسے ناپسند کرے تو میں اسے مجبور نہیں کرتا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرے قتل کا قریش کی طرف سے جو قصد ہو رہا ہے اس سے حفاظت کی جائے، تاکہ میں اپنے رب کے پیغامات لوگوں تک پہنچا سکوں۔ یہاں تک کہ اللہ میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں جو فیصلہ چاہے فرما دے۔''

آپ کی اس درخواست کو کسی نے قبول نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ ان کی قوم انہیں اچھی طرح جانتی ہے۔ ہم کیسے سمجھ لیں کہ ایک شخص ہماری اصلاح کرے گا، جب کہ اس نے اپنی قوم میں فساد ڈال رکھا ہے اور آپ سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے۔[2]

حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ مختلف قبائل کے درمیان جس طرح اسلام کی دعوت دے رہے تھے اور اس کو عام کرنے کے لیے جو تحفظ چاہ رہے تھے، ابن سعد نے

---

[1] مسند احمد: ۴/۲۹۷۔ حدیث نمبر ۱۴۲۴۳۔ اس کے مزید حوالے آگے آرہے ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو، حاکم، المستدرک: ۲/۶۸۱، حدیث نمبر ۴۲۵۱۔ عکاظ، مجنّہ اور ذوالمجاز کی حیثیت بازاروں یا میلوں کی ہوگئی تھی۔ عرب حج کے زمانے میں عکاظ میں شوال کا پورا مہینہ قیام کرتے، پھر سوق مجنہ میں آتے اور بیس روز ٹھہرتے، اس کے بعد سوق ذی المجاز میں آتے اور ایام حج تک یہاں رکے رہتے۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۳/۱۵۳

[2] ذہبی، تاریخ الاسلام، (السیرۃ النبویۃ: ص، ۲۸۲) ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/۱۵۸۔ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۱۵۸۔

اس کی کچھ تفصیل بیان کی ہے۔ کہتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نبوت کے ابتدائی تین سال تک خاموشی سے تبلیغ کرتے رہے۔ چوتھے سال علی الاعلان اس کا اظہار کیا اور دس سال تک لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ ہر سال حج کے موسم میں آپ عکاظ، مجنہ اور ذی المجاز میں، جہاں لوگ جمع ہوتے تھے، ان کی قیام گاہوں پر پہنچتے اور ان سے کہتے کہ وہ آپ کو تحفظ فراہم کریں، تاکہ آپ اپنے رب کے احکام ان تک پہنچائیں، انہیں اللہ تعالیٰ جنت عطا کرے گا۔ لیکن آپ کو کوئی ایسا فرد نہ ملتا جو آپ کی درخواست قبول کرے اور آپ کی مدد کرے۔ آپ ایک ایک قبیلہ اور اس کی قیام گاہ کے بارے معلومات کرتے اور اس سے فرماتے: لوگو! لا الہ الا اللہ کہو، فلاح پاؤ گے۔ اس کے ذریعہ تم عرب کے مالک بن جاؤ گے، عجم تمہارے ماتحت ہوگا۔ اس پر ایمان لاؤ گے تو جنت میں بادشاہ بن کر رہو گے۔ آپ کے پیچھے ابولہب کہتا پھرتا: اس کی بات نہ مانو، یہ بے دین ہے اور غلط بات کہہ رہا ہے۔ اس پر لوگ بری طرح آپ کی تردید کرتے، آپ کو تکلیف پہنچاتے اور کہتے کہ تم سے تمہارا قبیلہ اور خاندان زیادہ واقف ہے، لیکن اس نے تمہاری بات نہیں مانی ہے۔ آپ سے بحث و تکرار کرتے، لیکن آپ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے اور کہتے: اے اللہ! اگر تو چاہتا تو یہ ایسے نہ ہوتے اور یہ سلوک نہ کرتے۔

اس طرح آپ نے حسب ذیل قبائل تک اپنی بات پہنچائی:

بنو عامر بن صعصعہ، محارب بن حصفہ، فزارہ، غسان، مرّۃ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نصر، بنو البکاء، کندہ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمۃ۔ ان میں سے کسی نے بھی آپ کی بات کا مثبت جواب نہیں دیا[1]

موجودہ دور میں جمہوری ممالک اپنے شہریوں کی جان، مال، عزت و آبرو اور

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۱۶-۲۱۷۔ ابن ہشام نے ان قبائل میں کندہ، بنو کلب، بنو حنیفہ اور بنو عامر کا ذکر کیا ہے۔ السیرۃ النبویۃ: ۲/۳۶-۳۷

آزادیِ فکر جیسے بنیادی حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری لیتے ہیں اور ان کا دفاع کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ شہریوں کے درمیان مذہب، زبان اور رنگ ونسل کی بنیاد پر فرق نہیں کرتے۔ ان حقوق کو دستوری ضمانت حاصل ہوتی ہے، اس لیے حکومت اور ریاست ان کی پابند ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اس طرح کا دستور نہیں تھا۔ البتہ قبائل اپنے رواج اور نسلی عصبیت کی بنا پر اپنے افراد کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتے تھے اور ضرورت پڑنے پر ان کا ہر طرح سے دفاع بھی کرتے تھے۔ اسی طرح قبیلہ کا سردار اعلان کر دے کہ وہ باہر کے کسی فرد کو امان اور تحفظ فراہم کر رہا ہے تو پورا قبیلہ اس کا احترام کرتا اور اس کے دفاع میں کھڑا ہو جاتا، کسی کو اس پر دست درازی کی اجازت نہ ہوتی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اسی بنا پر مختلف قبائل سے امان اور تحفظ کی درخواست کی۔ گو کہ ابتدا میں کوئی بھی قبیلہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوا، لیکن آپ کی سعی و جہد جاری رہی اور پایانِ کار اوس وخزرج نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کیا، بلکہ آپ کے تحفظ اور دفاع کا بھی وعدہ کیا۔ اسی کے نتیجے میں ہجرت کا عظیم واقعہ پیش آیا اور اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔

(یہ مضمون سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی جولائی-ستمبر ۲۰۰۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں نظرثانی اور بعض اضافوں کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے)۔

☆☆☆

مدنی دور

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ؕ﴿۲۸﴾

[الفتح:۲۸]

وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا، تا کہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے۔ اس پر اللہ کی شہادت کافی ہے۔

ہجرت اور اس کے بعد کے اہم واقعات

- اسلامی تاریخ میں ہجرت مدینہ کی اہمیت
- صلح حدیبیہ کے معاہدے کی ایک شرط
- رسولِ اکرم ﷺ کے احکامِ تبلیغ
- رسولِ اکرم ﷺ کے دعوتی مکاتیب
- ہرقل شاہِ روم کے نام مکتوبِ گرامی
- عرب کے وفود۔ دربارِ رسالت میں

اسلامی تاریخ میں ہجرتِ مدینہ کی اہمیت
(قرآن مجید کی روشنی میں)

عرب کی تاریخ ان کے کسی اہم واقعہ سے متعلق ہوتی تھی۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کے آتش نمرود سے صحیح سالم نکل آنے کا واقعہ۔ خانۂ کعبہ کی تعمیر یا اس کے صدیوں بعد اصحابُ الفیل کا واقعہ، جس میں ابرہہ کے ہاتھیوں کی فوج، جو خانۂ کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے آئی تھی، تباہ ہوگئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عظیم کرشمہ تھا۔ اس طرح کے بڑے واقعات سے اپنی تاریخ بیان کرتے تھے۔ جیسے فلاں واقعہ اصحاب فیل کے واقعہ سے اتنی مدت قبل یا بعد میں پیش آیا۔

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ اسلامی تقویم کہاں سے شروع ہو اور اس کی تاریخ کا حساب کیسے رکھا جائے؟ آپ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ روم کی تاریخ کو اپنالیا جائے۔ لیکن یہ بات سامنے آئی کہ ان کی تاریخ متعین نہیں ہے، بلکہ بدلتی رہتی ہے۔ کسی نے کہا: رسول اللہ ﷺ کی بعثت کو اسلامی تاریخ کی بنیاد بنایا جائے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ آپ کی وفات کو بنیاد مان لیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہجرت کو اسلامی تاریخ کی بنیاد ہونا چاہیے، اس لیے کہ اس نے حق و باطل کے درمیان فرق کردیا۔ حضرت علیؓ کی بھی یہی رائے تھی کہ ہجرت کو اسلامی تاریخ کی بنیاد ہونا چاہیے، جس میں رسول اللہ ﷺ سرزمینِ شرک کو چھوڑ کر مدینہ تشریف لائے۔ اس پر اتفاق ہوگیا۔ یہ سن ۱۷ یا ۱۸ھ کا واقعہ ہے۔

صحابہ کرام نے سال کا آغاز محرم سے قرار دیا جو عربی تاریخ کا پہلا مہینہ ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے سفر ہجرت کا آغاز یکم ربیع الاوّل کو ہوا اور ۱۲ ربیع الاوّل بروز دوشنبہ آپ کی مدینہ تشریف آوری ہوئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ جمعہ کا دن تھا۔[2]

مکہ میں کام یابی کی بشارتیں

مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سخت آزمائشوں سے گزر رہے تھے۔ انہیں اسلام پر کھل کر عمل کرنے اور اس کی دعوت و تبلیغ کی اجازت نہیں تھی۔ آپ کے مخالفین کی پوری کوشش تھی کہ اسلام مکہ میں قدم نہ جمانے پائے اور ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے لیے روز مشورے ہوتے اور نت نئے اقدامات کیے جاتے۔ یہ انتہائی مظلومیت کا دور تھا۔ کسی کو اس کی توقع نہیں تھی کہ یہ مظلومیت ختم ہوگی، اہلِ ایمان آزادی کی فضا میں سانس لیں گے، اسلام کو فروغ حاصل ہوگا اور وہ فتح و کام رانی سے ہم کنار ہوگا۔ ان نازک حالات میں قرآن نے بار بار کہا کہ حالات یقیناً بدلیں گے، مخالف قوتیں اپنے عزائم اور منصوبوں میں ناکام ہوں گی اور اسلام کو سربلندی حاصل ہوگی۔ یہ بات پورے زور اور قوت کے ساتھ کہی گئی کہ اللہ کے رسولوں کو اس کی نصرت حاصل رہی ہے اور اب بھی یہ حاصل ہوگی۔ یہاں مکی سورتوں کے بعض حوالے پیش کیے جارہے ہیں:

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿٥١﴾ (غافر:۵۱)	بے شک ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں بھی اور اس روز بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔

---

[1] ہجری تاریخ کے تعین کی بحث کے لیے ملاحظہ ہو طبری، تاریخ الامم والملوک: ۲/ ۳-۶

[2] ابن عبد البر، الاستیعاب، مقدمہ، ترجمۂ رسول اللہ ﷺ: ۱/ ۱۴۳-۱۴۴۔ نیز ملاحظہ ہو: ابن حجر، فتح الباری: ۷/ ۲۳۲

یہی بات ایک اور جگہ ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ﴿١٧١﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ﴿١٧٢﴾ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴿١٧٣﴾ (الصافات: ۱۷۱-۱۷۳)	ہمارا یہ فیصلہ ہمارے ان بندوں کے حق میں جو رسول بنائے گئے ہیں، پہلے ہی ہو چکا ہے کہ ان کی مدد ضرور ہوگی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہوگا۔

ایک اور مقام پر فرمایا کہ یہ دورِ جور و ستم ہمیشہ باقی نہیں رہے گا۔ ظلم کی چکی یوں ہی نہیں چلتی رہے گی، ظالموں کے سامنے ان کا انجامِ بد بہت جلد آنے والا ہے:

سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ﴿٢٢٧﴾ (الشعراء: ۲۲۷)	جن لوگوں نے ظلم (اور ہٹ دھرمی) کی راہ اختیار کی ہے انہیں جلد ہی معلوم ہوجائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔

یہ بات ایک اور موقع پر ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴿٤٥﴾ (القمر: ۴۵)	بہت جلد یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

فرمایا گیا کہ مخالفین نوشتۂ دیوار کیوں نہیں پڑھ رہے ہیں کہ ان کی تمام تدابیر کے باوجود اللہ کے دین کو پھیلنے اور عام ہونے سے روکنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ کیا وہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ خود ان ہی کے گھروں میں اس دین کے ماننے والے پیدا ہو رہے ہیں اور اس کی حمایت میں کھڑے ہو رہے ہیں، مکہ کے اطراف میں اسلام پھیل رہا ہے، زمین ان کے قدموں کے نیچے سے کھسک رہی ہے، پھر بھی وہ اس خیالِ خام میں ہیں کہ ان کا اقتدار لازوال ہے اور ان کا غلبہ وتسلط باقی رہے گا۔
(الرعد: ۴۱، الانبیاء ۴۴)

مکہ میں غلبۂ دین کی جو بشارت دی گئی اور مخالفین کو جس انجام سے آگاہ کیا گیا، ہجرت کے بعد اس کا ظہور ہوا اور اسلام عملاً غالب ہوکر رہا۔

مکہ سے ہجرت کی ترغیب

مکہ میں مسلمان جن دشوار گزار اور صبر آزما حالات سے گزر رہے تھے ان میں کہا گیا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ سرزمین تم پر مزید تنگ ہوجائے اور تمہیں اپنے دین کی خاطر اسے چھوڑنا پڑے، عزیزوں اور رشتہ داروں کی جدائی اور مال و جایداد کا خسارہ برداشت کرنا پڑے۔ اگر تم نے یہ ہمت کی اور اللہ کے لیے ہجرت کی تو اللہ کی نصرت تمہیں حاصل ہوگی، اس کے بعد تمہاری مظلومی کا دور ختم ہوگا، غلبہ اور سر بلندی کی راہ ہموار ہوگی اور دنیا و آخرت کی فلاح تمہارے حصہ میں آئے گی۔ چناں چہ سورۂ نحل میں، جو مکی ہے، ارشاد ہے:

وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (النحل: ۴۱-۴۲)

جن لوگوں نے اللہ کے لیے ہجرت کی ظلم و زیادتی کی وجہ سے جو ان پر کیا گیا تو ہم دنیا میں ان کو بہترین ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر بہت بڑا ہے۔ کاش یہ (مخالفین) جانتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تکلیفیں برداشت کیں اور جو اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

یہ بات اس وقت کہی جارہی تھی جب کہ مکہ سے اہل ایمان خاموشی سے حبشہ ہجرت کررہے تھے۔ انہوں نے بعد میں مدینہ بھی ہجرت کی۔ اس طرح انہیں دو ہجرتوں کا ثواب حاصل ہوا۔[1]

---

[1] بعض حضرات کی رائے ہے کہ ان آیات میں ہجرت مدینہ کا ذکر ہے، لیکن سورۂ نحل مکی ہے، اس میں ہجرت مدینہ کا حوالہ نہیں آسکتا۔ مفسر ابن عطیہ اندلسی کہتے ہیں کہ ان آیات میں ان اصحاب کا ذکر ہے جنہوں نے حبشہ ہجرت کی۔ یہی جمہور کی رائے ہے اور یہی صحیح ہے، اس لیے کہ اس آیت کے نزول کے وقت ہجرت مدینہ واقع نہیں ہوئی تھی۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز: ۵/۳۵۶۔ یہی بات ماوردی نے بھی کہی ہے کہ آیت کا تعلق ہجرت حبشہ سے ہے۔ الماوردی، النکت والعیون (تفسیر الماوردی): ۲/۳۹۰

جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اور اس کی رضا کے لیے ہجرت کی اور گھر بار چھوڑا ان سے دنیا میں 'بہترین ٹھکانے' کا وعدہ کیا گیا۔ اس سے مدینہ مراد ہوسکتا ہے، جو مہاجرین کا مرکز بنا، جہاں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے مفہوم میں فتح و نصرت اور اسلامی اقتدار کی توسیع بھی شامل ہے، معیشت کی فراخی اور خوش حالی بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے نیک نامی اور ذکرِ خیر بھی مراد لیے گئے ہیں۔ مفسرین کے ہاں ان مختلف پہلوؤں کا ذکر موجود ہے۔ ان سب کی گنجائش ہے۔[۱]

سورۂ عنکبوت مکی سورت ہے۔ یہ اس دور میں نازل ہوئی جب اہل ایمان پر جور و تشدد آخری حد کو پہنچ رہا تھا۔ ان حالات میں کہا گیا کہ آزمائشیں اور امتحانات اس راہ کا لازمی حصہ ہیں۔ اس سے ایمان میں اخلاص اور عدم اخلاص کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں کہا گیا کہ مکہ کی زمین تمہیں برداشت نہیں کررہی ہے تو اسے چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں تم اللہِ واحد کی عبادت کرسکو۔ ارشاد ہے:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ﴿۵۶﴾	اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین کشادہ ہے۔ پس تم میری ہی عبادت کرو۔ (العنکبوت:۵۶)

آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ گھر بار، خویش و اقارب، زمین جایداد اور کاروبار چھوڑ کر کسی اجنبی جگہ چلا جائے تو روزی روٹی کا کیا ہوگا اور زندگی کیسے گزرے گی۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ دیکھو دنیا میں کتنے ہی جان دار ہیں جو اپنا رزق اپنے سر پر اٹھائے نہیں پھرتے۔ وہ بھوکے نہیں مرتے۔ اللہ ان کو رزق دیتا ہے۔ وہ تم کو بھی رزق دے گا۔ (العنکبوت:۶۰)

اس طرح مکہ میں یہ ماحول تیار ہوا کہ اللہ کے دین کی خاطر ہر تکلیف برداشت کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے گھر بار چھوڑنا اور ترک وطن کرنا پڑے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ آدمی یہ اقدام بھی کرگزرے۔

۱؎ ماوردی، النکت والعیون: ۲/ ۳۹۰-۳۹۱

ہجرتِ مدینہ کے اشارے

سورۂ بنی اسرائیل مکی سورت ہے۔ اس میں ہجرتِ مدینہ کا پس منظر اور مستقبل میں اس کے اثرات کا تفصیل سے ذکر ہے۔

مکہ میں اسلام پر آزادی سے عمل کرنے اور اس کی دعوت و تبلیغ کی راہیں مسدود ہورہی تھیں۔ آپؐ اور آپ کے اصحاب سخت آزمائشوں اور مشکلات سے گزر رہے تھے۔ مشرکین چاہتے تھے کہ مکہ میں آپ کے قدم کسی طرح جمنے نہ پائیں۔ اس کے لیے وہ ہزار تدبیریں کررہے تھے۔ قرآن نے کہا: انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کو مکہ سے نکالنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت وہ خود بھی دیر تک یہاں نہیں رہ پائیں گے:

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾

(بنی اسرائیل: ۷۶، ۷۷)

وہ تو یہ چاہتے تھے کہ تمہیں دق کرکے اس زمین (مکہ) سے نکال دیں۔ اس صورت میں تمہارے بعد یہ بھی وہاں کم ہی ٹھہر پائیں گے۔ یہ اللہ کی سنت ہے اپنے رسولوں کے سلسلہ میں جنہیں ہم نے تم سے پہلے بھیجا ہے۔ اس میں تم کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

حکم ہوا، آپ دعا کریں:

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾ وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

(بنی اسرائیل: ۸۰، ۸۱)

اور کہو اے میرے رب! مجھے داخل کر سچائی کے ساتھ۔ میرا نکلنا بھی سچائی کے ساتھ ہو۔ تو مجھے اپنی طرف سے ایک اقتدار کو مددگار بنادے۔ کہو: حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔

ہجرت دراصل صداقت اور راستی کا سفر تھا۔ ارشاد ہے کہ دعا کیجیے کہ آپ کا

مدینہ پہنچنا اور مکہ چھوڑنا راستی کے لیے ہو، اس میں خلوص ہو اور نیک جذبہ ہو۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ سیاسی طاقت کو تمہارا مددگار بنادے۔

ان آیات میں پہلے مدینہ کا ذکر ہے، جو دارالہجرت تھا، بعد میں مکہ کا ذکر آیا ہے، جہاں سے آپ نے ہجرت کی تھی۔ اس تقدیم کی وجہ ہجرت مدینہ کی اہمیت ہے۔[1]

یہ اس امر کا اظہار بھی تھا کہ ہجرت مدینہ سے باطل کے ختم ہونے کا آغاز ہوجائے گا، فتح ونصرت کی راہیں ہموار ہوں گی اور مستقبل اسلام کا ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ کی ہجرتِ مدینہ

قریش نے دیکھا کہ مدینہ کے قبائل آپ کے ہم نوا ہوگئے ہیں اور آپ کے ساتھی آہستہ آہستہ مدینہ کا رخ کررہے ہیں تو انہیں اندیشہ لاحق ہوا کہ آپ بھی کسی وقت مدینہ پہنچ جائیں گے، اس کے بعد حالات دوسرا رخ اختیار کرسکتے ہیں۔ آپ ہمارے خلاف محاذ آرائی بھی کرسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشورے کے لیے مختلف قبائل کے سردار 'دارالندوہ' میں جمع ہوئے اور مشورہ کرنے لگے۔[2]

کسی نے کہا: ان کو زنجیر سے باندھ دو اور کسی مکان میں ڈال دو، جس طرح نابغہ اور زہیر جیسے زبان آور شعراء ختم ہوگئے، یہ بھی دنیا سے چلے جائیں گے۔ کسی نے کہا: انہیں مکہ سے نکال باہر کرو، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کہاں گئے اور ان کا کیا انجام ہوا۔ ابوجہل نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے قبیلے کے ایک معزز اور شریف نوجوان کا انتخاب کریں اور ہر ایک کے ہاتھ میں دھاری دار تلوار ہو اور وہ سب مل کر ایک ساتھ آپ پر حملہ کرکے ختم کردیں۔ اس طرح ان کے قتل میں تمام قبائل شریک

---

[1] ابن عطیہ، المحرر الوجیز: ۵/ ۵۳۰

[2] 'دارالندوہ' قصی بن کلاب کا گھر تھا۔ قریش اہم معاملات میں مشورے کے لیے یہاں جمع ہوتے اور فیصلے کرتے تھے۔ ابن ہشام: ۲/ ۹۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو'اسلام کا شورائی نظام'

ہوں گے۔ بنو عبد مناف ان سب کا مقابلہ نہ کرسکیں گے اور دیت پر آمادہ ہوجائیں گے اور وہ ادا کردی جائے گی۔ اس پر سب کا اتفاق ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے اس منصوبے سے آگاہ فرمادیا۔ آپ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سونے کی ہدایت فرمائی اور مکان سے اس طرح نکل گئے کہ مشرکین، جو مکان کو گھیرے ہوئے تھے انہیں اس کا پتہ نہ چلا اور آپ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ سفر ہجرت پر روانہ ہوگئے۔ صبح جب انہوں نے آپ پر حملہ کرنا چاہا تو دیکھا کہ آپ کے بستر پر حضرت علیؓ آرام کررہے ہیں۔ اس سے ان کے ہوش اڑ گئے اور وہ آپ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، لیکن ناکام رہے۔[1]

قرآن مجید نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ (الانفال: ۳۰)	یاد کرو جب تمہارے بارے میں وہ لوگ تدبیر کررہے تھے جنہوں نے کفر کیا ہے کہ تمہیں قید کردیں یا قتل کردیں یا تمہیں مکہ سے نکال دیں۔ وہ اپنی تدبیر کررہے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی تدبیر کررہا تھا۔ اللہ تعالیٰ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مسند احمد، مسند ابن عباس، حدیث نمبر ۳۲۴۱۔ ابن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۱۴۹/۹۔ ۱۵۱۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۲۱/ ۹۴-۹۷۔ اسی روایت میں ہے کہ مجلس میں نجد کے ایک شیخ کی شکل میں شیطان موجود تھا۔ اس نے ابوجہل کی رائے کی پرزور تائید کی۔ قاضی عیاض نے کہا ہے کہ یہ واقعہ، جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، قرآن کے مطابق ہے۔ البتہ شیطان کا انسان کی صورت میں آنا اور تائید کرنا غلط ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ شیطان کسی انسان کی شکل میں آئے اور تجویز کی تائید کرے۔ التفسیر الکبیر، جلد ۸، جزء ۱۵، ص ۱۲۴-۱۲۵۔

اسلام کی وسعت

ہجرت کے بعد اسلام نے جو وسعت اختیار کی اور اس کے جو تہذیبی، سماجی اور سیاسی رخ نمایاں ہوئے اس سے مکی اور مدنی دور کا فرق واضح ہوتا ہے۔ ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

تکمیلِ دین

مکہ میں اسلام کی اصولی تعلیمات نازل ہوتی رہیں، جن میں توحید، رسالت اور آخرت کو دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا اور مخالف فکر و خیال کی تردید کی گئی، اصولِ اخلاق بیان ہوئے، عدل و انصاف کے قیام اور حقوق انسانی کی حفاظت پر زور دیا گیا۔ اسی کے ساتھ اللہ کے دین پر صبر و ثبات کی تاکید کی گئی۔ انبیاء سابقین کی تعلیمات، راہ خدا میں ان کی جدوجہد اور استقامت کے حوالے دیے گئے۔ مدینہ میں ان تعلیمات کی اساس پر مکمل قانونِ حیات اور نظامِ شریعت عطا کیا گیا۔ اس میں عبادات (نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسے تعبدی امور) کی تفصیل تھی۔ خاندان کی تعمیر وتشکیل کے قواعد و ضوابط، معیشت و معاشرت کے قوانین، سیاست وحکم رانی کے راہ نما اصول، حدود و تعزیرات اور ان کے شرائط جیسے تمام انفرادی و اجتماعی امور شامل تھے۔ اس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں قانون شریعت نافذ ہوا اور تمام قوانین پر اس کی برتری قائم ہوگئی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان کردیا گیا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (المائدۃ:۳)	آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کردیا ہے اور تم پر اپنا احسان پورا کردیا ہے اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا ہے۔

یہ تکمیلِ دین کا اعلان تھا۔ یہ پوری زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری راہ نمائی تھی۔ اس کے بعد کسی اور راہ نمائی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

سیاسی اقتدار

مکہ میں انتہائی سخت اور نازک حالات کے باوجود اہل ایمان کو غلبہ اور کامرانی کی بشارت دی گئی۔ ہجرت مدینہ کے بعد اعلان کیا گیا کہ اللہ کا دین غالب ہوکر رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوسکتی۔ اسے زیر کرنے کی تمام کوششیں اور تدبیریں ناکام ہوں گی:

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ یَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝۳۲ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝۳۳

(التوبۃ: ۳۲، ۳۳)[1]

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مارکر) بجھادیں اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو یہ ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے، چاہے مشرکین اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔

مکہ میں اہل ایمان کو اقتدار حاصل نہ تھا۔ مدینہ میں انہیں اقتدار عطا کیا گیا۔ مکہ میں وہ آزادی سے اللہ کے دین پر عمل نہیں کر پا رہے تھے۔ اب وہ پورے اطمینان سے اس پر عمل کرسکتے تھے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال انجام دیے ہیں ان کو وہ زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے کے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے دین کو ضرور جمادے گا جسے اس نے ان کے

---

[1] یہ آیات الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۃ الفتح (آیت ۲۸) اور سورۃ الصّف (آیت ۹) میں بھی آئی ہیں۔ تینوں جگہ اظہارِ دین کا ذکر ہے۔

يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵۵ (النور: ۵۵)

لیے پسند کیا ہے اور ان کی حالتِ خوف کو ضرور حالتِ امن میں تبدیل کردے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ جو اس کے بعد کفر کا راستہ اختیار کریں وہی فاسق ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا اور اہل ایمان کو زمین کے ایک بڑے حصہ پر اقتدار حاصل ہوا۔ سن ۶ھ میں صلح حدیبیہ ہوئی، جس میں اسلام کو ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے اہل مکہ نے تسلیم کیا اور وسیع پیمانہ پر اسلام کی دعوت کے مواقع حاصل ہوئے۔ اس پر دو سال بھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ سن ۸ھ میں فتحِ مکہ کے بعد جوق در جوق قبائل کے قبائل اسلام میں داخل ہونے لگے اور فتح و نصرت کا منظر ہر طرف دیکھا جارہا تھا: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳ (النصر)

دعوتِ عام

مکہ ہی میں اسلام کو ایک عالم گیر اور ابدی دینِ حق کی حیثیت سے پیش کیا گیا، لیکن عملاً اس کی دعوت سرزمین مکہ اور حجاز کے بعض علاقوں تک محدود رہی۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی دیگر اقوام سے خطاب کیا اور ان کے سربراہوں کو خطوط تحریر کیے، انہیں اسلام کی براہ راست دعوت دی اور اس سلسلے کے ضروری اقدامات کیے۔

معاشی خوش حالی

ہجرت کے بعد اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو دنیا نے دیکھا کہ یہ معاشی لحاظ سے بھی خوش حال ریاست ہے۔ جس دعوت کا آغاز انتہائی غربت و افلاس اور بے کسی کے عالم میں ہوا وہ ایک فلاحی ریاست قائم کرنے میں کام یاب ہے۔

قرآن مجید نے مکی اور مدنی دور کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٢٦﴾
(الانفال:۲۶)

اس وقت کو یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے، زمین (مکہ) میں دبے ہوئے اور مغلوب تھے، تمھیں ڈر لگا رہتا تھا کہ لوگ اچانک تمھیں اچک نہ لے جائیں۔ اس کے بعد اللہ نے تمھیں (مدینہ میں) جگہ دی، اپنی نصرت سے تقویت پہنچائی اور پاک چیزیں کھانے کے لیے عطا کیں، تاکہ تم شکر ادا کرو۔

ہجرت کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے۔ یہاں قرآن مجید سے اس کے اسباب ومحرکات اور نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں اسلام کی دعوت سے لے کر ہجرت تک ایک فطری ترتیب نظر آتی ہے۔ مکہ میں سخت مشکلات کے باوجود کارِ دعوت جاری رہا۔ قرآن نے بار بار کہا کہ اس کا بہتر انجام سامنے آئے گا، مخالفین اپنی کوششوں میں ناکام ہوں گے اور اسلام سربلند ہوکر رہے گا۔ اس کے لیے جو تدابیر اختیار کی جاسکتی تھیں، وہ اختیار کی گئیں۔ ان ہی میں ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ بھی شامل ہے۔ یہیں سے مخالفین کی ناکامی اور اسلام کی سربلندی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے بعض مستشرقین کے اس فاسد خیال کی تردید ہوتی ہے کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی حیثیت ایک داعی اور مصلح کی تھی اور مدینہ میں آپ ایک جنگ جو اور خوں خوار شخص کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ قرآن شروع ہی سے غلبۂ دین کا اعلان کرتا رہا ہے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد اس کی راہ ہموار ہوئی اور اللہ کا دین عملاً غالب ہوا۔ ہجرتِ مدینہ اسلامی تاریخ میں ایک سنگ میل ہے، اسی لیے وہ اسلامی تاریخ کے لیے بنیاد قرار پائی۔

(سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، جولائی-ستمبر ۲۰۱۴ء)

صلح حدیبیہ کے معاہدے کی ایک شرط

ذی قعدہ سن ٦ ھ میں رسول اللہ ﷺ اور قریش مکہ کے درمیان صلح کا معاہدہ ہوا، جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ کی ایک اہم دفعہ یہ تھی:

ان لاَ یاتیک منا احد وان کان علی دینک الا رددته علینا و خلیت بیننا و بینه[1]

آپ کے پاس ہمارا جو بھی آدمی آئے گا، چاہے وہ آپ کے دین ہی پر کیوں نہ ہو، اسے آپ ہمارے پاس ضرور بھیج دیں گے اور ہمارے اور اس کے درمیان حائل نہیں ہوں گے (ہم اس کے ساتھ کوئی بھی معاملہ کرنے میں آزاد ہوں گے)۔

ابن ہشام نے اس دفعہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

من اتیٰ محمدًا من قریش بغیر اذن ولیه ردّه علیهم و من جاء قریشًا ممن مع محمد لم یرده علیه[2]

قریش کا جو شخص محمد (ﷺ) کے پاس اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر پہنچ جائے اسے وہ ان کے پاس واپس لوٹا دیں گے اور محمد (ﷺ) کے ساتھیوں میں سے کوئی قریش کے پاس آ جائے تو اسے وہ نہیں لوٹائیں گے۔

معاہدے کی اس دفعہ پر صحابۂ کرامؓ کی بے چینی

معاہدے کی یہ دفعہ بہت سے صحابہ کرامؓ کے لیے شاق گزر رہی تھی۔ حضرت عمرؓ

---

[1] بخاری، کتاب الشروط، باب ما یجوز من الشروط فی الاسلام۔ صلح حدیبیہ کے واقعات کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد الخ۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۳/۳۵٦-۳٦۸۔ طبری، تاریخ الامم والملوک: ۲/ ٦۴ اور آگے۔

[2] ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۳/۲٦٦

تو اس میں اسلام اور مسلمانوں کی سبکی اور توہین سمجھ رہے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے معاہدے کی جس طرح پابندی فرمائی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ معاہدہ ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ حضرت ابوجندلؓ بیڑیوں میں گھسٹتے ہوئے مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچے۔ ان کے باپ سہیل بن عمرو نے، جو اس وقت قریش کی نمائندگی کر رہے تھے، کہا: معاہدہ کی رو سے آپ سہیل کو ہمارے حوالہ کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا: ابھی تو معاہدہ کی تحریر مکمل نہیں ہوئی ہے، لہٰذا وہ تمہارے حوالے نہیں کیے جا سکتے، لیکن چوں کہ معاہدہ کے نکات پر پہلے گفتگو ہو چکی تھی اس لیے سہیل نے اصرار کیا کہ ابو جندلؓ کو مکہ بھیجنا ہوگا۔ آپ نے اسے تسلیم کر لیا۔ ادھر حضرت ابوجندلؓ مسلمانوں سے فرما رہے تھے کہ میں مسلمان ہوکر حاضر ہوا ہوں اور اسلام لانے کی وجہ سے جس اذیت اور تکلیف سے دوچار ہوں اسے آپ حضرات دیکھ رہے ہیں۔ کیا اس حال میں مجھے دوبارہ اہلِ مکہ کے حوالہ کردیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں تسلی دی کہ صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کوئی سبیل نکالے گا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

فردّ یومئذ ابا جندل الی ابیه سهیل بن عمرو و لم یأته احد من الرّجال الاّ ردّه فی تلک المدة وان کان مسلمًا[1]

اس روز آپ نے حضرت ابوجندلؓ کو ان کے باپ سہیل بن عمرو کے حوالہ کر دیا (اس مدت میں) مردوں میں سے جو بھی آیا اسے آپ نے واپس بھیج دیا، چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

کیا اس معاہدہ میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شامل تھیں؟

ایک سوال یہ ہے کہ اس معاہدہ میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شامل تھیں یا نہیں؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ معاہدہ میں صراحت کے ساتھ ان عورتوں کی واپسی کا بھی ذکر تھا جو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئیں، لیکن سورۂ ممتحنہ کی حسب ذیل آیت نے

---

[1] بخاری، کتاب الشروط، باب ما یجوز من الشروط فی الاسلام

عورتوں کے سلسلے میں اسے منسوخ کردیا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَ لَا هُمْ یَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ ..... (الممتحنة:۹)

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس ایمان والی عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کا امتحان لے لو۔ان کے ایمان کا (صحیح حال) اللہ جانتا ہے۔اگر وہ تمہیں ایمان والی معلوم ہوں تو انہیں کفار کے پاس نہ بھیجو۔نہ تو یہ عورتیں ان کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لیے حلال ہیں۔

ابن عطیہ اندلسی کہتے ہیں کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے فوراً بعد نازل ہوئی۔ صلح میں یہ بات شامل تھی کہ جو بھی مسلم مرد یا عورت مکہ سے مدینہ آئے وہ لوٹا دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ عورتوں کے سلسلے میں اس فیصلہ کو ختم کردیا اور ہدایت دی کہ جو عورت ہجرت کر کے مدینہ آئے وہ دار الکفر (مکہ) واپس نہیں بھیجی جائے گی[1]

بعض دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ معاہدہ کی اس دفعہ کے الفاظ عام تھے، اس لیے اس کا اطلاق مردوں کی طرح عورتوں پر بھی ہوتا تھا، لیکن سورۂ ممتحنۃ کی اس آیت نے واضح کر دیا کہ وہ اس میں شامل نہیں ہیں۔اس کی ایک وجہ کفار سے ان کا ازدواجی رشتہ ختم کرنا تھا، دوسرے اس میں ان کی کم زوری کی رعایت تھی۔ وہ جلد متاثر ہو جاتی ہیں[2]

یوں کہنا چاہیے کہ معاہدے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک ترمیم تھی کہ اس نے مہاجرات مومنات کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا۔مشرکین اسے معاہدہ کی خلاف ورزی قرار دے سکتے تھے۔ چناں چہ روایات سے معلوم ہوتا کہ انہوں نے معاہدہ کی بنا پر

---

[1] ابن عطیہ، المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز: ۸/ ۲۸۳

[2] علامہ ماوردی نے ان دونوں راویوں کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ النکت و العیون: ۴/ ۲۲۴-۲۲۵۔ نیز ملاحظہ ہو قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۸/ ۶۲

مہاجرات کی واپسی کا مطالبہ بھی کیا تھا[۱]

یہ معاہدہ صرف مردوں سے متعلق تھا

ان دونوں توجیہات سے ہٹ کر ایک اور توجیہ بھی ہوسکتی ہے۔ یہی صحیح توجیہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ معاہدہ صرف مردوں سے متعلق تھا، عورتیں اس میں شامل ہی نہیں تھیں۔ چناں چہ بخاری کی ایک روایت میں معاہدہ کی اس دفعہ میں 'احد' (کوئی) کی جگہ 'رجل' (مرد) کا لفظ آیا ہے:

لَا یأتیک منا رجل، و ان کان علی دینک، الّا رددته الینا[۲]

ہمارے مردوں میں سے جو بھی آپ کے پاس آئے گا، چاہے وہ آپ کے دین ہی پر کیوں نہ ہو، اسے آپ ہمارے پاس لوٹا دیں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ معاہدہ میں صراحت کے ساتھ مردوں کا تو ذکر ہے، لیکن عورتوں کے بارے میں وہ خاموش ہے۔ اس بنا پر جو عورتیں اسلام لانے کے بعد مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئیں، رسول اللہ ﷺ نے انہیں واپس نہیں لوٹایا۔ مشرکین کی طرف سے کبھی اعتراض ہوا بھی تو آپ نے فرمایا: معاہدہ مردوں سے متعلق ہے، عورتوں سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ وہ اس کی تردید نہ کر سکے۔[۳]

ضحاک کا بیان ہے کہ معاہدہ میں یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ کوئی مشرک

---

۱ مکہ سے جو مسلمان خواتین ہجرت کر کے مدینہ آئیں یا جو مسلمان خواتین مکہ میں مشرک شوہروں کے ساتھ تھیں ان سے متعلق تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کے مجموعۂ مضامین 'تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث' میں شامل مضمون 'غیر مسلموں سے ازدواجی تعلقات'۔ اس موضوع پر راقم کی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' میں 'ازدواجی تعلقات' کی بحث بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

۲ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد و المصالحۃ الخ

۳ حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط، جو قدیم الاسلام اور حضرت عثمانؓ کی اخیافی بہن تھیں، کا واقعہ ہے کہ وہ صلح حدیبیہ کے بعد اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر پیدل مدینہ تشریف =

عورت مکہ سے مدینہ آجائے تو اسے واپس بھیج دیا جائے گا، لیکن کسی مسلمان عورت کو جو مدینہ آئے، واپس نہیں بھیجا جائے گا، البتہ اس کے کافر شوہر کا مہر اسے سے دیا جائے گا۔ فرماتے ہیں:

كان بين رسول اللهﷺ و بين المشركين عهد ان لاَ تاتيک منّا امراة ليست على دينک الاّ رددتها الينا، فان دخلت في دينک و لها زوج ان ترد على زوجها الذى انفق عليها و للنّبى

رسول اللہﷺ اور مشرکین کے درمیان یہ عہد تھا کہ ہماری طرف سے کوئی عورت آپ کے ہاں (مدینہ) آجائے جو آپ کے دین کو نہ مانتی ہو تو آپ اسے لوٹا دیں گے۔ لیکن اگر وہ آپ کے دین کو قبول کر لے اور اس کا شوہر ہو تو آپ اسے اس کا وہ مہر واپس کر دیں گے

= لے آئیں۔ دوسرے ہی دن ان کے دو بھائی عمارہ بن عقبہ اور ولید بن عقبہ مدینہ پہنچ گئے اور معاہدہ کا حوالہ دے کر ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت سورۂ ممتحنۃ کی آیت نازل ہوئی اور انہیں واپس نہیں بھیجا گیا، لیکن اس کے ساتھ ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ اس طرح کے مطالبہ کے جواب میں آپ نے فرمایا: کان الشرط فی الرجل ولم یکن فی النساء۔ فتح الباری: ۹/۴۱۹۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۸/۶۱ یعنی معاہدہ کی شرط مردوں کے سلسلہ میں تھی، عورتوں کے متعلق نہیں تھی۔

حضرت ام کلثوم کے بارے میں حافظ ابن حجر اور علامہ قرطبی نے ایک کم زور قول یہ نقل کیا ہے کہ مکہ میں وہ حضرت عمرو بن العاص کے نکاح میں تھیں۔ فتح الباری: ۵/۳۴۸۔ قرطبی: ۸/۶۱۔ لیکن حافظ ابن حجر نے الاصابۃ فی تمییز الصحابہ میں بہت صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہجرت سے پہلے ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ہجرت کے بعد یکے بعد دیگرے کئی صحابہ سے ان کا عقد ہوا۔ ان میں حضرت عمرو بن العاصؓ بھی تھے۔ جن سے عقد کے ایک ماہ بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ حضرت ام کلثوم کے تذکرہ کے لیے ملاحظہ ہو۔ بخاری، کتاب الشروط، باب مایجوز من الشروط فی الاسلام۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۳/۳۷۵-۳۷۶۔ طبری، تاریخ الرسل و الملوک: ۲/۶۴۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۷/۳۸۶۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۴/۴۹۱۔

صلی اللہ علیہ وسلم من الشرط مثل ذٰلک[1] جو اس نے اپنی بیوی کو دیا ہے۔اسی قسم کی شرط نبی ﷺ کی طرف سے بھی تھی۔

یہ روایات اپنے مفہوم میں واضح ہیں۔ ان سے یہ بحث ختم ہو جاتی ہے کہ مکہ سے مسلمان خواتین کا ہجرت کر کے مدینہ آنا اور ان کا مکہ واپس نہ بھیجنا اصل معاہدہ میں ترمیم یا نسخ کے ذریعے عمل میں نہیں آیا، بلکہ معاہدہ کا تعلق صرف مردوں سے تھا اور اس پر پوری طرح عمل ہو رہا تھا۔ خواتین اس سے مستثنیٰ تھیں۔ قرآن مجید نے ان کے سلسلے میں ہدایات دیں۔

---

[1] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۴/ ۵۰۵۔ آلوسی، روح المعانی، جز ۲۸، ص ۷۷

(سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ، اپریل-جون ۱۹۹۶ء)

☆☆☆

رسولِ اکرم ﷺ کے احکامِ تبلیغ

اسلام اس حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا آخری دین ہے جو قیامت تک کے لیے ہے اور دنیا کے ہر خطہ اور ہر دور کے انسانوں کے لیے ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ماننے والوں پر تبلیغ واشاعت کی ذمہ داری ڈالی اور یہ ہدایت کی کہ وہ اسے تمام انسانوں تک پہنچانے اور ساری دنیا میں پھیلانے کی کوشش کریں[1]

رسول اللہ ﷺ نے اس ذمہ داری کی طرف جن پہلوؤں سے متوجہ فرمایا ہے، ان میں سے دو ایک کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

ہر شخص دین کو عام کرنے کی کوشش کرے

اللہ تعالیٰ کے آخری دین کی بنیاد پر وجود میں آنے والی اس امت کو رسول ﷺ نے واضح الفاظ میں ہدایت کی کہ جس شخص کو دین کی جو بات بھی معلوم ہو اسے عام کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں کوتاہی نہ کرے۔ ذیل میں آپ کے بعض ارشادات پیش کیے جاتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] قرآن مجید نے اس ذمہ داری کو پورے زور اور قوت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں اٹھنے والے تمام سوالات کا جواب دیا ہے۔ راقم الحروف نے 'معروف و منکر' اور 'اسلام کی دعوت' میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

بلّغوا عنّی ولو ایۃ[۱] میری طرف سے (دوسروں تک) پہنچاؤ، چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔

آیت سے مراد بظاہر قرآن مجید کی آیت ہے۔ اس کے ذیل میں حدیث بھی آجاتی ہے، اس لیے کہ حدیث قرآن مجید کی تفصیل وتشریح ہے۔ حدیث کا منشا یہ ہے کہ آدمی کو صرف ایک آیت یا حدیث ہی کا علم ہو تو بھی وہ اسے اپنی ذات تک محدود نہ رکھے، بلکہ اسے دوسروں تک پہنچا دے، تاکہ اس طرح دین عام ہوتا چلا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ دیا تھا وہ اسلامی ریاست کا منشور اور ایک لحاظ سے امت کے لیے آپ کا آخری پیغام تھا۔ اس خطبہ میں آپ نے ارشاد فرمایا:

لیبلغ الشاھد الغائب فان الشاھد عسٰی ان یبلغ من ھو اوعٰی لہٗ منہ[۲] جو یہاں موجود ہے وہ ان لوگوں تک میری یہ باتیں پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ موجود شخص ان باتوں کو کسی ایسے شخص تک پہنچا دے جو اس سے زیادہ ان کی حفاظت کر سکے۔

یہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دین وشریعت کی تبلیغ کا حکم تھا۔ یہ اس بات کی تاکید تھی کہ جس طرح آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا دین آپ کے مخاطبین تک پہنچا ہے، اسی طرح وہ اسے دوسروں تک منتقل کریں۔ اس حدیث کے ذیل میں امام نوویؒ فرماتے ہیں:

فیہ وجوب تبلیغ العلم و ھو فرض کفایۃ بحیث ینتشر[۳] اس سے علم کی تبلیغ کا وجوب نکلتا ہے۔ یہ فرض کفایہ ہے، جو اس طرح ادا ہوگا کہ علم کی نشر واشاعت ہوتی رہے۔ (افراد کے ذریعہ ہو یا جماعتوں کے ذریعہ)

---

۱ بخاری، کتاب الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

۲ بخاری، کتاب العلم، باب قول النبی رب مبلغ اوعیٰ من سامع۔ مسلم، کتاب القسامۃ، باب تغلیظ تحریم الدماء الخ

۳ نووی: شرح مسلم: ۲/ ۶۰

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور تعلیمات آپ کے دور میں زیادہ تر زبانی ایک دوسرے کو منتقل ہوتی تھیں۔ آپ نے فرمایا: تبلیغ دین کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اس سے بسا اوقات آپ کی تعلیمات ان لوگوں تک بھی پہنچ سکتی ہیں جن کا حافظہ زیادہ قوی ہے اور جو زیادہ بہتر طریقے سے اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ بعض حدیثوں میں کہا گیا ہے کہ ایک غیر فقیہ شخص بھی آپ کے ارشادات کو جوں کا توں حفظ کر لے تو وہ انہیں کسی فقیہ اور صاحبِ بصیرت فرد تک پہنچا سکتا ہے اور ایک فقیہ شخص کے ذریعہ وہ اس سے بھی بڑے فقیہ تک پہنچ سکتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:

نضر اللہ عبداً سمع مقالتی فحفظھا و وعاھا و ادّاھا فربّ حامل فقہ غیر فقیہ و رب حامل فقہ الیٰ من ھو افقہ منہ[1]

اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش وخرم اور شاداب رکھے جس نے میری بات سنی، اسے یاد رکھا، اسے سمجھا، پھر اسے (جوں کا توں) بیان کر دیا۔ بہت سے لوگ فقہ کے حامل (اس کو یاد رکھنے والے) تو ہوتے ہیں، لیکن خود فقیہ نہیں ہوتے۔ بعض فقہ کے حامل دین کی باتیں ان لوگوں تک پہنچائیں گے جو ان سے زیادہ فقیہ ہوں گے۔

اس حدیث میں ایک تو اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ علمِ دین کی تبلیغ میں پوری دیانت داری اور احتیاط سے کام لیا جائے اور بغیر کسی کمی بیشی کے اسے جوں کا توں دوسروں تک منتقل کیا جائے، اس طرح دین قیامت تک محفوظ شکل میں باقی رہے گا۔ دوسرے اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ امت میں ایسے اصحاب فقہ و بصیرت پیدا ہوتے رہیں گے جو ہر دور میں اس کی حکمت و معنویت کی بہتر طریقہ سے پیش کر سکیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام سے فرمایا کہ جو کچھ تم سیکھ رہے ہو دوسرے لوگ تم سے سیکھ رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ پھر ان سے اور لوگ سیکھیں گے۔ اس طرح دین کی تبلیغ واشاعت کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور اسے جاری رہنا چاہیے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب العلم، بحوالہ احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی۔

تسمعون و یسمع منکم و یسمع ممن یسمع منکم[۱]

تم لوگ دین کی باتیں (براہ راست) سن رہے ہو، اس کے بعد تم سے یہ باتیں سنی جائیں گی اور پھر تم سے جو لوگ سنیں گے ان سے ان کے بعد آنے والے سنیں گے۔

اس حدیث میں حاملینِ دین سے کہا گیا ہے کہ وہ تبلیغ و اشاعت کا فرض مسلسل انجام دیتے رہیں، تاکہ بغیر کسی انقطاع کے دین پھیلتا رہے۔ چناں چہ اس حدیث کے ذیل میں علامہ مناوی لکھتے ہیں:

بذلک یظھر العلم و ینتشر و یحصل التبلیغ و ھو المیثاق المأخوذ علی العلماء[۲]

اس سے علم نمایاں ہو کر سامنے آئے گا، پھیلے گا اور تبلیغ ہوگی۔ یہی وہ عہد و پیمان ہے جو علماء سے لیا گیا ہے۔

مختلف علاقوں میں تبلیغی وفود کی روانگی

رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف تو تبلیغ دین کی بار بار ہدایت اور تاکید فرمائی اور دوسری طرف اپنی حیات ہی میں عرب کے مختلف علاقوں اور قبیلوں میں مبلغین اور تبلیغی وفود روانہ فرمائے۔ اس طرح عملاً یہ ثابت فرمادیا کہ اسلام ایک عالمی دین ہے، جس کی تبلیغ پوری دنیا میں ہوتی رہنی چاہیے۔

اہلِ مدینہ کی تعلیم و تربیت کا نظم

مبلغین کو بھیجنے کا سلسلہ مکہ کے آخری دور ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ چناں چہ بیعت عقبۂ اولیٰ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اہلِ مدینہ کی تعلیم کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے بڑے دور رس نتائج نکلے۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں:

۱؎ ابوداؤد، کتاب العلم، باب فضل نشر العلم

۲؎ التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۱/۴۴۱

أمره ان يقرء هم القرآن و يعلّمهم الاسلام و يفقّههم فى الدين — آپ نے ہدایت فرمائی کہ وہ انہیں قرآن پڑھائیں، اسلام کی تعلیم دیں اور ان کے اندر دین کی سوجھ بوجھ اور بصیرت پیدا کریں۔

چناں چہ مدینہ میں حضرت مصعب بن عمیرؓ کا نام ہی مقری پڑ گیا تھا[1]

حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ساتھ عبداللہ بن ام مکتومؓ بھی مدینہ پہنچے تھے، جو اہلِ مدینہ کو تعلیم دینے میں شریک تھے۔ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں:

اوّل من قدم علينا مصعب بن عمير و ابن ام مكتوم و كانوا يقرء ون الناس[2] — سب سے پہلے ہمارے پاس (مدینہ) مصعب بن عمیر اور ابن مکتوم آئے۔ یہ حضرات وہاں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری اور اسلامی ریاست کے قیام کے بعد بڑے پیمانے پر دعوت و تبلیغ کا کام ہونے لگا۔ کبھی تو خاص اسی مقصد کے لیے مبلغین بھیجے جاتے تھے اور کبھی ریاست کے عہدے دار یہ فرض انجام دیتے تھے۔ وہ چاہے گورنر ہوں، زکوٰۃ اور صدقات وصول کرنے والے ہوں، یا فوج کے سربراہ، ان میں سے کوئی بھی، کسی بھی حال میں دعوت و تبلیغ سے غافل نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ ان کی سرکاری ذمہ داری تھی۔

یمن میں دعوت و تبلیغ

رسول اللہ ﷺ نے یمن کے مختلف علاقوں میں جن افراد کو روانہ فرمایا ان کے نام اور ان کی ذمہ داریوں کی نوعیت ذیل میں بیان کی جا رہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مقاصد میں دعوت و تبلیغ پوری طرح شامل تھی۔

---

[1] ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۲/ ۴۲۔ علاّمہ ابن عبدالبر نے اسے بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد کا واقعہ لکھا ہے، جو غالباً صحیح نہیں ہے۔ الاستیعاب فی اسماء الاصحاب۔

[2] بخاری، کتاب المناقب، باب مقدم النبی و اصحابہ

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا تو فرمایا کہ وہاں اہلِ کتاب سے سابقہ پیش آئے گا۔ یہ بھی بتایا کہ ان کے درمیان تبلیغ کس طرح ہونی چاہیے[1]

رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر حضرت معاذ کو دعوت و تبلیغ، اخلاق وقانون سے متعلق بھی بہت سی ہدایات دی تھیں[2]

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یمن کو دو بڑے علاقوں میں تقسیم فرمایا تھا۔ شمالی یمن حضرت معاذؓ کے حوالہ کیا گیا اور جنوبی یمن کے ذمہ دار حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ قرار دیے گئے[3]

ان دونوں کو نصیحت فرمائی کہ لوگوں کو سہولت اور آسانی فراہم کریں، مشکلات میں نہ ڈالیں، تعلیم وتبلیغ میں خوش خبری کا پہلو غالب رہے، اس طرح ڈرایا اور خوف نہ دلایا جائے کہ دین ہی سے نفرت پیدا ہوجائے، اتحاد و اتفاق کے ساتھ کام کریں اور اختلاف اور انتشار سے بچے رہیں۔

يسّرا و لاَ تعسّرا و بشّرا ولاَ تنفّرا و تطاوعا ولاَ تختلفا[4]	آسان رویہ اختیار کرو، مشکل میں نہ ڈالو، خوش خبری سناؤ، نفرت نہ دلاؤ، مل جل کر کام کرو اور ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرو۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ یمن میں حضرت معاذؓ کی کیا حیثیت تھی؟

۱۔ اس کی کسی قدر وضاحت راقم کی کتاب ’سبیلِ رب۔ دعوت الی اللہ کا راستہ‘ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۴/ ۲۶۰۔

۲۔ علامہ ابن کثیر نے ان سب کو جمع کردیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ السیرۃ النبویۃ: ۴/ ۱۹۴-۱۹۹

۳۔ حضرت ابوبردہ کی روایت ہے: بعث رسول اللّٰہ ﷺ ابا موسیٰ و معاذ بن جبل الی الیمن و بعث کل واحد منهما علی مخلاف و الیمن مخلافان۔ بخاری، کتاب المغازی، باب بعث ابی موسیٰ و معاذ الی الیمن۔ تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ فتح الباری: ۸/ ۴۵

۴۔ بخاری، حوالہ سابق، مسلم، کتاب الجهاد، باب تامیر الامام الامراء علی البعوث الخ ولا تختلفا کا لفظ بخاری میں نہیں ہے۔

ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ وہ قاضی تھے۔ غسانی کی رائے ہے کہ وہ والی (گورنر) مقرر کیے گئے تھے[۱]

علامہ ابن عبدالبر کی رائے ان کی کتاب 'الاستیعاب' میں زیادہ تفصیل سے ملتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یمن کو پانچ علاقوں میں تقسیم کر کے پانچ افراد کو ان کا ذمہ دار بنایا تھا۔ اس کی تفصیل انہوں نے یوں بیان کی ہے:

(۱) خالد بن سعید (صنعا) (۲) مہاجر بن ابی امیہ (کندہ) (۳) زیاد بن لبید (حضرموت) (۴) معاذ بن جبل (جند) (۵) ابوموسیٰ اشعری (زبید، زمعہ، عدن، ساحل)۔

حضرت معاذؓ کے بارے میں لکھتے ہیں:

بعثه رسول اللّٰه قاضیا الی الجند من الیمن یعلم الناس القرآن و شرائع الاسلام و یقضی بینهم و جعل الیه قبض الصدقات من العمال الذین بالیمن[۲]

رسول اللہ ﷺ نے انہیں یمن کے جند کے علاقے کے قاضی کی حیثیت سے بھیجا، تاکہ وہ لوگوں کو قرآن اور اسلامی شریعت کی تعلیم دیں اور ان کے مقدمات کا فیصلہ کریں۔ یمن میں جو آپ کے عمال (کارندے) تھے ان سے صدقات جمع کرنا بھی آپ ہی کے ذمہ تھا۔

اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً شروع میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذؓ یمن کے ذمہ دار بنا کر بھیجے گئے، لیکن بعد میں فتوحات کی توسیع کے ساتھ بعض اور حضرات کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ یہ ہدایت بھی تھی کہ زکوٰۃ و صدقات حضرت معاذؓ ہی کے پاس جمع ہوں گے۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

ان معاذًا کان قاضیا للنبی بالیمن و حاکما فی الحروب و مصدقا الیه تدفع الصدقات[۳]

معاذ یمن میں نبی ﷺ کے مقرر کردہ قاضی تھے، جنگوں کا فیصلہ وہی کرتے تھے اور صدقات و زکوٰۃ کے وصول کنندہ بھی تھے، آپ ہی کے حوالے صدقات کیے جاتے تھے۔

۱۔ فتح الباری: ۲۳۰/۳

۲۔ الاستیعاب فی اسماء الاصحاب: ۳۵۷/۳

۳۔ السیرۃ النبویۃ: ۲۰۰/۴

اہلِ مکہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد حضرت معاذؓ نے رسول اللہ ﷺ کے نائب کی حیثیت سے مکہ میں تعلیم و تربیت کا فرض انجام دیا تھا۔ عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں:

استخلف معاذ بن جبل علی اہل مکۃ حین خرج الی حنین و امرہ رسول اللّٰہ ان یعلم الناس القرآن و ان یفقههم فی الدین[1]

جب آپ (فتح مکہ کے بعد) حنین کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت معاذ بن جبل کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیں اور ان کے اندر دین کی سوجھ بوجھ اور بصیرت پیدا کریں۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد حضرت معاذؓ کو حضرت عتاب بن اسیدؓ کے ساتھ مکہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا تھا کہ اہلِ مکہ کو دین کی تعلیم دیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس کے بعد یمن بھیجا تھا۔[2]

اہلِ نجران میں اسلام کی تبلیغ

نجران کے عیسائیوں کے نمائندے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تو آپ نے مباہلہ کی دعوت دی۔ پہلے تو وہ اس

---

[1] حاکم، المستدرک: ۳/ ۲۷۰

[2] ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۴/ ۱۹۸۔ مکہ ۸ھ میں فتح ہوا۔ امام بخاری کی رائے یہ ہے کہ حضرت معاذ سن ۱۰ھ میں حجۃ الوداع سے پہلے یمن بھیجے گئے۔ جیسا کہ کتاب المغازی میں ان کے عنوانِ باب سے ظاہر ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے ۹ھ کے آخر کا واقعہ بتایا ہے۔ ابن سعد نے ربیع الآخر ۱۰ھ کی روایت بھی نقل کی ہے۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ یمن جانے کے بعد وہ وہیں رہے اور عہد صدیقی میں واپس ہوئے۔ پھر (عہد فاروقی میں) شام گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ فتح الباری: ۳/ ۲۳۰

کے لیے تیار ہوگئے، پھر ان کی ہمت نہیں ہوئی۔ انہوں نے آپس میں کہا: آپ سے مباہلہ کرنا اپنی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ انہوں نے اس شرط پر صلح کرلی کہ وہ ایک خاص مقدار میں کپڑے اور رقم فراہم کریں گے۔اس کے بعد درخواست کی:

ابعث معنا رجلاً امینًا و لَا تبعث معنا الاّ امینًا	آپ ہمارے ساتھ ایک امانت دار آدمی کو بھیجئے۔ درخواست ہے کہ امانت دار ہی کو بھیجئے۔

ان کی اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

لَا بعثنّ الیکم رجلاً امینًا حق أمین	میں تمہارے پاس ایک ایسے شخص کو بھیجوں گا جو پورا پورا امانت دار ہے۔

اس کے بعد آپ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو یہ کہہ کر روانہ فرمایا:

ھٰذا امین ھٰذہ الاُمة[1]	یہ اس امت کے امین ہیں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا اور اسلام کی دعوت دی، لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا[2] غالبًا انہوں نے مزید غور وفکر کرنے اور سمجھنے کے لیے آپ سے اپنا نمایندہ بھیجنے کی درخواست کی۔ چناں چہ مسلم کی روایت میں ہے:

ابعث معنا رجلا یعلّمنا السنة و الاُسلام[3]	آپ ہمارے ساتھ ایک ایسے شخص کو بھیجئے جو ہمیں سنت اور اسلام کی تعلیم دے۔

ایک اور روایت میں ہے:

ابعث معنا رجلا یعلّمنا القراٰن[4]	ایک ایسے شخص کو ہمارے ساتھ بھیجئے جو ہمیں قرآن کی تعلیم دے۔

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب قصة اہل نجران

[2] فتح الباری: ۸ / ۶۸

[3] مسلم، کتاب المناقب، فضائل ابی عبیدہ بن الجراح

[4] حاکم، المستدرک: ۳ / ۲۶۷

اس درخواست کے جواب میں حضرت ابوعبیدہؓ کے بھیجے جانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ صرف صلح کی رقم وصول کرنے کے لیے نہیں گئے تھے، بلکہ ان کے پیش نظر اسلام کی تبلیغ اور کتاب وسنت کی تعلیم بھی تھی۔

قبیلۂ ہمدان میں دعوت وتبلیغ

حجۃ الوداع سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالدؓ کو قبیلۂ ہمدان میں دعوت و تبلیغ کے لیے یمن بھیجا۔ وہاں آپ دعوت وتبلیغ کا فرض انجام دیتے رہے، لیکن اس میں آپ کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمدان والوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ روانہ کیے گئے۔ آپ کی کوشش اور حربی تدبیر سے پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا۔ اس کی اطلاع ملی تو رسول اللہ ﷺ بڑی ہی مسرت کا اظہار فرمایا اور سجدے میں چلے گئے۔[1]

قبیلۂ بنو الحارث میں تبلیغی کوششیں

سن ۱۰ھ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو نجران میں قبیلہ بنوالحارث کی طرف روانہ فرمایا۔ ہدایت تھی کہ تین دن تک اسلام کی دعوت دی جائے۔ اگر وہ اسے قبول کر لے تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، ورنہ جنگ کی جائے۔ چناں چہ اسی کے مطابق حضرت خالدؓ نے فوج کو حکم دیا کہ وہ چاروں طرف پھیل جائے اور یہ اعلان کرے کہ لوگو، اسلام قبول کرلو، امن و امان سے رہو گے۔ اس دعوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب لوگ اسلام لے آئے۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ نے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ فرمائی۔ یہ پوری تفصیل اس خط سے سامنے آتی ہے جو حضرت خالدؓ نے بنوالحارث کے اسلام لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تحریر کیا تھا۔ اس میں اس کوشش کا بھی ذکر ہے جو وہ ان کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں آپ کی ہدایت کے تحت کر رہے تھے۔ فرماتے ہیں:

---

[1] السیرۃ النبویۃ: ۴/ ۲۰۳۔ فتح الباری: ۸/ ۴۸

و انا مقیم بین اظھرھم اٰمرھم بما امرھم اللّٰہ به و انھا ھم عمانھاھم اللّٰہ عنه و اعلّمھم معالم الاُسلام و سنة النبی حتی یکتب الی رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلم و السّلام علیک یا رسول اللّٰہ و رحمة اللّٰہ و برکاته.

میں ان کے درمیان ٹھہرا ہوا ہوں، انہیں ان باتوں کا حکم دے رہا ہوں جن کا اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے اور ان باتوں سے منع کررہا ہوں جن سے اللہ تعالیٰ نے انہیں منع فرمایا ہے۔ انہیں اسلامی زندگی کے نشاناتِ راہ اور نبی کریم ﷺ کی سنت کی تعلیم دے رہا ہوں۔ اس وقت تک یہ خدمت انجام دیتا رہوں گا جب تک کہ آپ رسول اللہ ﷺ کا دوسرا حکم نہ آجائے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

اس خط کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالدؓ کو لکھا کہ بنو الحارث کے وفد کے ساتھ مدینہ آئیں۔ چناں چہ ان کا وفد آیا۔ اس سے تفصیلی بات چیت ہوئی اور اس کی واپسی کے بعد آپ نے عمرو بن حزمؓ کو بعض اہم ہدایات دے کر روانہ فرمایا[۱]

فتحِ خیبر کے وقت ہدایتِ نبویؐ

جنگ خیبر میں کئی روز کی کوشش کے باوجود بھی جب کام یابی حاصل نہیں ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے علم حضرت علیؓ کے حوالہ کیا اور ہدایت فرمائی:

انفذ علی رسلک حتی تنزل بساحتھم ثم ادعھم الی الاُسلام و اخبرھم بما یجب علیھم من حق اللّٰہ فیه.

وقار اور اطمینان کے ساتھ آگے بڑھو، یہاں تک کہ ان کے احاطہ میں پہنچ جاؤ، پھر انہیں اسلام کی دعوت دو اور بتاؤ کہ اسلام کی رو سے ان پر اللہ کا کیا حق لازم آتا ہے۔

اس کے بعد ایک جملہ میں آپ نے وہ مقصد بیان فرمایا جو ایک مسلمان کے پیش نظر محاذ جنگ پر بھی ہونا چاہیے۔ ارشاد ہوا:

لَاَن یھدی اللّٰہ بک رجلاً و احدًا

اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ ایک آدمی کو بھی

۱؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۴/ ۲۶۲-۲۶۵

خیر لّک من ان یکون لک حمر النعم[1] — ہدایت دے، یہ تمہارے حق میں اس سے بہتر ہے کہ تمہیں سرخ اونٹ مل جائیں۔

یہاں فی الحال اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ جنگیں کیوں ہوئیں اور ان کے کیا اسباب تھے؟ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جو فوجی مہمات بھیجی جاتی تھیں ان میں بھی تبلیغ و دعوت کا پہلو غالب رہتا تھا۔

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ خیبر

(سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، اکتوبر- دسمبر ۱۹۸۷ء)

☆☆☆

رسولِ اکرم ﷺ کے دعوتی مکاتیب

رسول اللہ ﷺ کے مکاتیب اور فرامین کا ایک بڑا ذخیرہ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے۔[1] یہ مکاتیب تین طرح کے ہیں: ایک تو وہ مکاتیب ہیں جن کے ذریعہ سے آپ نے سردارانِ قبائل اور سربراہانِ ممالک کو اسلام کی دعوت دی۔ دوسرے وہ مکاتیب ہیں جن میں آپ نے مسلمانوں کے لیے خاص خاص احکامِ شریعت کی تفصیل قلم بند کرائی ہے۔ تیسرے وہ مکاتیب ہیں جنھیں سیاسی نوعیت کے مکاتیب کہا جا سکتا ہے۔ ان کے ذریعہ سے آپ نے کسی کو پناہ دی، کسی سے معاہدہ کیا، یا عطیات وغیرہ سے نوازا ہے۔ ان سب کی اہمیت ہے اور ان سے زندگی کے مختلف گوشوں میں ہدایت اور رہ نمائی ملتی ہے۔ لیکن اس وقت صرف پہلی قسم کے مکاتیب کا ذکر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا بعثت کے بعد جب تک مکہ میں قیام رہا، اسلام کی دعوت عام نہ ہوسکی۔ قریش کے ظلم وستم نے اس کی راہ میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد قریش اور ان کے حلیف قبائل سے باقاعدہ جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اسلام کو حجاز کے دور دراز علاقوں تک پہنچانے اور اس سے آگے دنیا کو اس کی

---

[1] ان مکاتیب کی بڑی تعداد ابن سعد نے جمع کر دی ہے۔ ملاحظہ ہو الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۵۸-۲۹۱۔ محترم ڈاکٹر محمد حمیداللہ (مقیم پیرس) کی 'الوثائق السیاسیۃ' اس موضوع پر سب سے جامع تالیف ہے، جو نہایت عمدہ تحقیق کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔

طرف براہِ راست دعوت دینے کے مواقع حاصل نہیں تھے۔ اسی دوران میں صلح حدیبیہ ہوئی۔ یہ صلح اسلامی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس نے حالات کا رخ یک لخت بدل دیا۔اس کے بڑے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔اسی وجہ سے قرآن مجید نے اسے 'فتح مبین' سے تعبیر کیا ہے۔ (سورۃ الفتح:۱)

صلح حدیبیہ قریش کے ساتھ امن کا معاہدہ تھا۔اس سے حالتِ جنگ ختم ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کو اس کا موقع ملا کہ عرب کے دور و نزدیک کے قبائل اور دنیا کے سربراہانِ ممالک کو اسلام کی براہ راست دعوت دیں۔ اس دعوت کے مخاطبین کو بھی اس کے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے ٹھنڈا ماحول میسر آیا۔

دعوتی مکاتیبِ نبویؐ کا زمانہ

یہ بات محدثین اور مورخین کے درمیان طے ہے کہ یہ مکاتیب صلح حدیبیہ کے بعد لکھے گئے۔ البتہ اس کے وقت کی ٹھیک ٹھیک تعیین میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ صلح حدیبیہ ذی قعدہ سن ۶ ھ میں ہوئی۔[۱] واقدی کا بیان ہے کہ ذی الحجہ سن ۶ ھ ہی میں سفرا ان خطوط کو لے کر روانہ ہوئے تھے۔[۲] علامہ زرقانی کہتے ہیں کہ ذی الحجہ سن ۶ ھ میں آپ نے بادشاہوں کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھنے اور سفیروں کے ذریعہ انہیں بھیجنے کا فیصلہ فرمایا اور محرم سن ۷ ھ میں اس پر عمل درآمد ہوا۔[۳] اس طرح زرقانی نے ان بیانات میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ خطوط صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے لکھے گئے۔[۴] امام بخاری نے ان مکاتیب کا ذکر غزوہ تبوک

۱۔ بخاری، کتاب المغازی، غزوۃ الحدیبیۃ۔ مسلم، کتاب المناسک، باب بیان عدد عمر النبی و زمانھن
۲۔ الطبقات الکبریٰ:۱/ ۲۵۸
۳۔ طبری: تاریخ الرسل والملوک:۲/ ۶۴۴
۴۔ السیرۃ النبویۃ: ۴/ ۴۹۴

کے بعد کیا ہے[۱] یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مکاتیب سن ۹ھ میں لکھے گئے۔ان دونوں بیانات میں تطبیق اہل مغازی کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ تبوک سے بھی آپ نے بعض سلاطین کو دوبارہ خطوط لکھے[۲]

غالباً اسی وجہ سے ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ یہ مکاتیب صلح حدیبیہ سے لے کر وفات تک کی درمیانی مدت میں لکھے گئے:

كان رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم قد فرق رجالاً من اصحابه الى ملوک العرب و العجم دعاة الى اللّٰه عزو جل فى ما بين الحديبية و وفاته[۳]	رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ اور اپنی وفات کے دوران میں اپنے اصحاب میں سے بہت سے افراد کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والوں کی حیثیت سے عرب وعجم کے بادشاہوں کے پاس مختلف علاقوں میں روانہ فرمایا۔

سربراہانِ ممالک کو دعوتی خطوط اور سفرا کے اسمائے گرامی

رسول اللہ ﷺ نے جن سرداروں اور سربراہوں کو مکاتیب کے ذریعہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور جن صحابۂ کرام نے سفارت کے فرائض انجام دیے، ان کے اسم گرامی یہ ہیں:

	مکتوب الیہ	سفیر
۱-	ہرقل (قیصر روم)	دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ
۲-	کسریٰ بن پرویز بن ہرمز (شاہ فارس)	عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ
۳-	نجاشی (شاہ حبش)	عمرو بن امیہ ضمریؓ
۴-	مقوقس (حاکم اسکندریہ، مصر)	حاطب بن ابی بلتعہ لخمیؓ
۵-	حارث بن ابی شمر الغسانی (والی دمشق)	شجاع بن وہب الاسدیؓ

---

۱ بخاری، کتاب المغازی

۲ ابن حجر، فتح الباری: ۸/ ۸۹، ۹۰۔ نیز ملاحظہ ہو ۷/ ۳۰۹

۳ طبری: تاریخ الرسل والملوک: ۲/ ۶۴۵

۶- ہوذہ بن علی الحنفی (یمامہ) .... سلیط بن عمرو العادیؓ

۷- جیفر اور عبدابنی جلندی (قبیلہ ازد کے سردار) .... عمرو بن العاصؓ

۸- منذر بن ساوی عبدی (ملک بحرین) .... علاء بن حضرمیؓ

۹- ذوالکلاع بن ناکور۔ ذوعمرو (حمیر یمن) .... جریر بن عبداللہ البجلیؓ

۱۰- حارث بن عبدکلال الحمیری .... مہاجر بن امیہ مخزومیؓ

۱۱- مسیلمہ کذاب .... عمرو بن امیہ ضمریؓ۔ سائب بن عوامؓ

۱۲- فردہ بن عمرو الجذامی ......

۱۳- حارث، مسروح، نعیم (بنوعبدکلال حمیری) عیاش بن ابی ربیعہ مخزومیؓ

۱۴- جبلہ بن الایہم ......

اس فہرست میں بعض سفرا کا ذکر نہیں ہے اور بعض کے بارے میں یہ صراحت نہیں ہے کہ ان کے ذریعہ مکاتیب بھیجے گئے۔ ممکن ہے، زبانی آپ کا پیغام پہنچایا گیا ہو۔ اس پر آگے بحث آئے گی۔ ان شاء اللہ۔

ایک ہی دن روانہ ہونے والے سفرا

یہاں جن سلاطین اور امرا کا ذکر ہے ان میں سے پہلے چھ کے بارے میں ابن سعد نے صراحت کی ہے کہ محرم سن ۷ھ میں یہ سب سفرا ایک ہی دن روانہ کیے گئے۔[1] علامہ ابن قیم نے بھی یہی بات لکھی ہے۔[2]

واقدی کا بیان ہے کہ یہ سفرا ذی الحجہ سن ۶ھ میں حدیبیہ سے واپسی کے بعد (عملاً روانگی محرم سن ۷ھ میں ہوئی ہو گی) بھیجے گئے۔ ان میں سے تین ایک ساتھ روانہ

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۱۲۰

[2] زاد المعاد فی ہدی خیر العباد: ۱/ ۱۲۰۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: قیل هم الذین بعثهم رسول اللہؐ فی یوم واحد: ۱/ ۱۲۲۔ اس سے معلوم ہوتا کہ ان کے نزدیک یہ ایک کم زور قول ہے۔

ہوئے۔ مقوقس کی طرف حاطب بن ابی بلتعہؓ، غسانی کی طرف شجاع بن وہبؓ اور قیصر کی طرف دحیہ کلبیؓ[1] اس سے خیال ہوتا ہے کہ باقی سفرا الگ الگ روانہ ہوئے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ان کی روانگی ذی الحجہ ہی کی مختلف تاریخوں میں ہوئی ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اس مہم کی اہمیت بیان فرمائی

روایات میں آتا ہے کہ ان سفرا کو روانہ کرنے سے پہلے آپ نے صحابہؓ کے سامنے اس مہم کی اہمیت بیان فرمائی اور اس میں تعاون کرنے اور اسے کام یاب بنانے کی ترغیب دی۔

حضرت مسور بن مخرمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز صحابہ کے درمیان تشریف لائے اور فرمایا:

ان اللّٰہ بعثنی رحمۃ للناس کافۃ فادوا عنّی رحمکم اللّٰہ و لاَ تختلفوا کما اختلف الحواریون علیٰ عیسیٰ

اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ لہٰذا میری طرف سے اللہ کا دین دوسروں تک پہنچاؤ۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔ اس معاملے میں آپس میں اس طرح اختلاف میں نہ پڑ جاؤ جس طرح کہ حضرت عیسیٰ کے حواری اختلاف میں پڑ گئے تھے۔

صحابہ کرام نے دریافت کیا کہ ان کے اختلاف کی نوعیت کیا تھی؟ آپ نے فرمایا: حضرت عیسیٰ نے بھی اپنے حواریوں کو اسی طرح کا حکم دیا تھا جس طرح کا حکم میں تمہیں دے رہا ہوں۔ لیکن جن حواریوں کو آں جناب نے قریب کے مقامات پر بھیجا انہوں نے بخوشی حکم کی تعمیل کی اور جنھیں دور دراز کے مقامات پر بھیجا انہوں نے ناگواری محسوس کی (تعمیلِ حکم سے پیچھے ہٹے) اور کہا کہ ہم ان لوگوں کی زبان ہی نہیں جانتے جن کے پاس ہمیں بھیجا جا رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے اس کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔ جب صبح ہوئی تو ان میں سے ہر شخص ان لوگوں کی زبان

---

[1] طبری: تاریخ الرسل والملوک: ۲/۶۴۴

بولنے لگا جن کے پاس اسے بھیجا جا رہا تھا۔ (اس طرح ان کا عذر ختم ہو گیا) حضرت عیسیٰ نے فرمایا: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ تم یہ کام انجام دو۔ صحابۂ کرام نے یہ سن کر فرمایا: ہم آپ کا پیغام پہنچانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ جہاں چاہیں ہمیں روانہ فرما سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے مختلف سفرا (اس روایت میں سات سفیروں کا ذکر ہے) روانہ فرمائے۔[1]

ابن سعد کی روایت میں ہے کہ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کے سفرا ان لوگوں کی زبان بولنے لگے جن کی طرف انہیں بھیجا گیا۔[2] جب آپ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا:

هٰذا اعظم ما كان من حق الله في عباده[3]	اللہ پر اپنے بندوں کا یہ سب سے بڑا حق تھا جو پورا ہوا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معجزہ صحابہ کرام کے ساتھ پیش آیا۔ اس پر ایک اعتراض ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے سفیروں سے شاہانِ عجم نے اپنے ترجمانوں کے ذریعہ بات چیت کی تھی۔ اگر وہ ان کی زبانوں سے واقف ہوتے تو مترجم کی ضرورت نہ پیش آتی۔ اس کے جواب میں علامہ زرقانی کہتے ہیں کہ یہ شاہان عجم کے تکبر کا مظاہرہ

---

[1] اس کے ایک راوی اسماعیل بن عیاش گو حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ لیکن روایت حدیث میں وہ عام طور پر 'ضعیف' سمجھے جاتے ہیں۔ بعض محدثین نے انہیں ثقہ بھی قرار دیا ہے۔ امام احمد اور حافظ ابن معین وغیرہ نے کہا ہے کہ شامیوں سے ان کی روایات قابل اعتماد ہیں، البتہ اہلِ حجاز سے وہ کم زور روایات نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب: ۱/۳۲۶-۳۲۱۔ حافظ ابن حجر نے یہ روایت نقل کی ہے، لیکن اس کے ضعف کا ذکر نہیں کیا ہے۔ فتح الباری: ۸/۹۸۔ یہ روایت تھوڑے سے فرق کے ساتھ ابن ہشام (۴/۲۷۸-۲۷۹) میں بھی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو طبری، تاریخ الامم و الملوک: ۲/۶۴۵۔ اسی مفہوم کی روایت ابن سعد میں متعدد سندوں کے ساتھ آئی ہے، جس سے اس کا ضعف دور ہو سکتا ہے۔ الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۶۴۔ مزید حوالوں کے لیے دیکھی جائے المواہب اللدنیۃ: ۳/۳۶۵-۳۶۶

[2] الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۵۸

[3] حوالہ سابق ص ۲۶۴

بھی ہوسکتا ہے کہ انھوں نے براہِ راست بات چیت پسند نہیں کی۔[۱]

یہ معجزاتی واقعہ حضرت مسیحؑ کے حواریوں کے ساتھ پیش آیا ہو یا رسول اللہ ﷺ کے سفرا کے ساتھ، یا دونوں ہی کی اللہ تعالیٰ نے غیب سے اس سلسلہ میں مدد کی ہو، لیکن اس معجزہ کا محدثین کے ہاں ذکر نہیں ملتا، اس لیے اس پر یقین کرنا مشکل ہے، البتہ اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ کسی سے اس کی زبان میں خطاب کیا جائے۔ زبان کی اجنبیت بھی دعوت کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسری زبانیں سیکھنے کی ترغیب دی ہے اور صحابۂ کرام نے یہ زبانیں سیکھی ہیں۔

مکاتیبِ نبویؐ کی سرکاری حیثیت

ان مکاتیب کو باقاعدہ سرکاری حیثیت حاصل تھی اور وہ اسی حیثیت سے بھیجے بھی گئے۔ چناں چہ اس کے جو تقاضے تھے وہ پورے کیے گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ مشورہ آیا کہ یہ خطوط مہر بند ہونے چاہئیں، ورنہ ان کے شایانِ شان اہمیت نہیں دی جائے گی۔ آپ نے اس مشورہ کو شرفِ قبولیت بخشا اور اس پر عمل فرمایا۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے:

لما اراد النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم ان یکتب الی الروم و فی روایة ان یکتب الی العجم قیل له انهم لن یقرء وا کتابک اذا لم یکن مختومًا فاتخذ خاتما من فضة و نقشه محمّد رسول اللّٰه[۲]	جب رسول اللہ ﷺ نے رومیوں کو خط لکھنے کا ارادہ فرمایا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں جب آپ نے عجمیوں کو لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپ سے عرض کیا گیا کہ اگر آپ کا گرامی نامہ مہر بند نہ ہو تو وہ اسے ہرگز نہیں پڑھیں گے۔ چناں چہ آپ نے (مہر کے لیے) انگوٹھی بنوائی جس کا نقش محمد رسول اللہ تھا۔

---

[۱] المواہب اللدنیۃ: ۳/۳۶۵

[۲] بخاری، کتاب اللباس، باب اتخاذ الخاتم لیختم به الشئ اولیکتب الی اهل الکتاب و غیرهم۔ مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم خاتم الذهب علی الرجال۔ اسنوی نے لکھا ہے کہ اس کی کتابت =

رسول اللہ ﷺ نے ان مکاتیب میں اسلام کو اس حیثیت سے پیش فرمایا ہے کہ وہ ساری دنیا کے لیے ہے اور اس کا خطاب مشرق و مغرب اور عرب و عجم سب سے ہے۔ آپ نے سربراہانِ ممالک کو دعوت دی کہ وہ اسلام قبول کریں اور اس کی سعادتوں سے بہرہ مند ہوں۔ اگر وہ اس کا انکار کریں گے تو آخرت میں اپنی اور اپنے ماتحت افراد کی گم راہی کا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑے گا اور دنیا میں بھی اس کے نتائج کے وہ ذمہ دار ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ مکاتیب جس مقصد کے لیے لکھے تھے اسے حضرت انسؓ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

ان النبی کتب الی کسریٰ و الی قیصر و الی النجاشی و الیٰ کل جبار یدعوھم الی الاسلام[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ، قیصر، نجاشی اور ہر سرکش (حکم راں) کو خطوط لکھے اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔

ابن ہشام کہتے ہیں:

بعث رسول اللّٰہ ﷺ رسلاً من اصحابه و کتب معھم کتبا الی الملوک یدعوھم فیھا الی الاسلام[2]

رسول اللہ نے اپنے اصحاب میں سے قاصد بھیجے اور ان کے ذریعہ بادشاہوں کو خطوط روانہ فرمائے۔ ان خطوط میں آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تھی۔

یہ مکاتیب دعوتی نوعیت کے تھے

یہ مکاتیب خالص دعوتی نوعیت کے تھے۔ ان میں اسلام کو قبول کرنے کی

=اس طرح کرائی گئی تھی کہ پہلی سطر میں اللہ، دوسری سطر میں رسول اور تیسری سطر میں محمد تھا (اللہ / رسول / محمد) لیکن اس کی تائید روایات سے نہیں ہوتی۔ اسماعیلی کہتے ہیں کہ ایک سطر میں محمد دوسری میں رسول اور تیسری میں اللہ لکھوایا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب اس طرح تھی (محمد / رسول / اللہ) زرقانی علی المواہب: ۳/۴/۳۴۳

[1] مسلم، کتاب الجہاد، باب کتب النبیؐ الی ملوک الکفار الخ

[2] ابن ہشام: سیرۃ النبی: ۴/۲۷۹

براہِ راست دعوت دی گئی تھی۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔وہ یہ کہ کیا ان مکاتیب سے اسلام ان کے مخالفین کے سامنے پوری وضاحت کے ساتھ آجاتا تھا کہ وہ دلائل کی روشنی میں اس کے ردوقبول کا فیصلہ کرسکیں،اور رد کریں تو یہ کہا جا سکے کہ انہوں نے اچھی طرح سمجھنے کے بعد اسے رد کیا ہے؟

اس کے جواب میں چند باتیں پیش نظر رکھنی ہوں گی:

۱- یہ مکاتیب اپنے مخصوص پس منظر کی وجہ سے فیصلہ کن اہمیت رکھتے تھے۔یہ جس وقت لکھے گئے اسلام کی دعوت غیر معروف نہیں تھی کہ پوری تفصیل سے اسے سمجھانے کی ضرورت پیش آتی، بلکہ اس کا حوالہ دینا ہی کافی تھا۔اسلام کی دعوت نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مخالفین کے درمیان زبردست کش مکش برپا کر دی تھی۔ اس کش مکش سے حجاز کے دور دراز کے قبائل بھی واقف تھے۔ اس کش مکش نے باہر کی دنیا کے لیے بھی اس کے سمجھنے کے مواقع فراہم کر دیے تھے۔

۲- مدینہ میں اسلام عملاً قائم تھا اور اس کی بنیاد پر ایک ریاست وجود میں آچکی تھی۔ اس کے مخالفین اور دشمن بھی اسلام کو سمجھنا چاہیں تو وہ انہیں اس کے مواقع فراہم کرنے کو تیار تھی۔قرآن مجید کی ہدایت ہے۔

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ ۝ (التوبۃ:٦)	اگر مشرکوں میں سے کوئی تم سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دے دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دو۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ وہ لوگ (اللہ کے دین کو) نہیں جانتے۔

اس سے واضح ہے کہ غیر اسلامی ریاست کا کوئی فرد اسلام کو سمجھنا چاہے تو اسلامی ریاست اسے اس کا موقع ضرور فراہم کرے گی۔ اسلام کو سمجھنے کے لیے جس وقت تک قیام ضروری ہوگا، وہ قیام کر سکے گا۔ اس کے بعد اسے اسلام کو ماننے یا نہ ماننے کا کلّی اختیار ہوگا۔ اگر وہ اسلام کو نہ مانے تو اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوگی کہ اسے

بحفاظت اس ملک میں پہنچا دے جس سے وہ تعلق رکھتا ہے، تا کہ وہ اپنے وطن اور اپنے ماحول میں آزادی کے ساتھ اسلام کے بارے میں فیصلہ کر سکے۔ اس اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص محض ناواقفیت یا غلط فہمی کی بنا پر اسلام کی مخالفت نہ کرے[۱]

۳- یہ مکاتیب رسول اللہ ﷺ نے ایک ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے لکھے تھے، اس لیے ان میں جن سربراہوں کو خطاب کیا گیا تھا وہ انہیں کسی عام فرد کا خطاب سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ وہ ان پر غور کریں اور کسی نتیجہ پر پہنچیں۔ ان کو دوسروں کے مقابلہ میں اس کے بہتر مواقع بھی حاصل تھے۔

۴- یہ خطوط جن سفرا کے ذریعہ بھیجے گئے تھے وہ اسلام کے نمائندے تھے۔ وہ صرف نامہ بر نہیں تھے، بلکہ اسلام کے ترجمان تھے اور وقت ضرورت اس کی ترجمانی کرتے تھے۔

ان وجوہ سے ان مکاتیب میں جن لوگوں کو خطاب کیا گیا تھا ان کے لیے اسلام کا سمجھنا آسان تھا۔ان کی راہ میں ایسی کوئی رکاوٹ نہ تھی جو دور نہ ہوسکتی ہو۔ اس لیے ان مکاتیب کے ذریعہ اس بات کے مطالبہ کا آپ کو پورا حق حاصل تھا کہ وہ اسلام کو سمجھیں اور اسے قبول کریں۔

دعوت و تبلیغ کا ذریعہ تحریر بھی ہے

ان مکاتیب کے مطالعہ سے ضمناً یہ بات بھی نکلتی ہے کہ دعوت و تبلیغ کا ذریعہ تقریر ہی نہیں تحریر بھی ہے۔تحریر سے بھی مخاطبین پر اتمامِ حجت ہوسکتی ہے۔اس کے لیے ہرحال میں بالمشافہ بحث اور گفتگو ضروری نہیں ہے۔ قیصر و کسریٰ کے نام رسول اللہ ﷺ

---

[۱] اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست کے درمیان باہم معاہدہ کے تحت سفارتی، تجارتی اور اسی نوعیت کے دوسرے تعلقات قائم ہو سکتے ہیں۔اسلامی ریاست میں غیر اسلامی ریاست کے افراد اس طرح کے جس مقصد کے تحت بھی قیام کریں گے، اسلام کو سمجھنے میں انہیں مدد ملے گی۔
اس آیت پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو رشید رضا، تفسیر المنار: ۱۰/ ۱۷۷-۱۸۰

کے مکاتیب کا ذکر جس حدیث میں ہے اس کے ذیل میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

و فی الحدیث الدعاء الی الاسلام بالکلام و الکتابة و ان الکتابة تقوم مقام النطق[1]

حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ اسلام کی طرف دعوت زبان سے بھی دی جاتی ہے اور تحریر کے ذریعہ بھی۔یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحریر زبانی بیان کی جگہ لے سکتی ہے۔

موجودہ دور میں تحریر کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔اس کے ذریعہ زیادہ وسیع حلقہ تک اسلام کے اصول اور اس کی تعلیمات کی ترسیل کا امکان ہے اور مخاطب کو اس پر غور وفکر کا بہتر موقع ملتا ہے۔

---

[1] فتح الباری:۶/ ۶۸

(سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، اپریل-جون ۱۹۸۸ء)

☆☆☆

ہرقل شاہِ روم کے نام مکتوبِ گرامی

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مشرق میں ساسانی یا ایرانی سلطنت تھی اور مغرب میں بازنطینی یا رومی سلطنت۔ یہ اس وقت کی سب سے بڑی اور سب سے طاقت ور سلطنتیں تھیں۔ معلوم دنیا کے وسیع علاقہ پر ان کی حکم رانی تھی۔ تہذیب وتمدن اور علم وفن میں بھی یہ دنیا کی قیادت کر رہی تھیں۔ کوئی بھی حکومت ان کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کرسکتی تھی۔ ان کے اقتدار کو چیلنج کرنے کا کسی میں یارانہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں مملکتوں کے سربراہوں کو خطوط لکھے اور اسلام کی دعوت دی۔

ہرقل کے نام مکتوب گرامی کی اہمیت

رومی سلطنت کے حکم راں ہرقل کے نام مکتوب گرامی روانہ کرنے سے پہلے آپؐ نے اس کی اہمیت واضح فرمائی۔ ابن حبان میں صحیح سند کے ساتھ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ میرا یہ مکتوب قیصر (رومی بادشاہوں کا لقب) کے پاس جو شخص لے جائے گا وہ جنت کا مستحق ہوگا۔ مجلس میں سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ کیا یہ ثواب، قیصر اسلام قبول نہ کرے تو بھی ملے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اگر وہ اسلام نہ لائے تو بھی ملے گا۔[1]

---

[1] ابن قیم، زاد المعاد: ۱/ ۱۲۱۔ حدیث میں و ان لم یقبل کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کا مطلب وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ ایک روایت میں ہے: وان لم یصل، اس کے معنی ہیں: چاہے سفیر ہرقل تک نہ پہنچ پائے، تب بھی جنت کا مستحق ہوگا۔ ایک روایت میں 'وان لم یقتل' کے الفاظ ملتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر سفیر کو اس مہم میں شہادت نصیب نہیں ہوتی اور وہ صحیح سالم =

حدیث اور سیرت کی کتابیں اس پر متفق ہیں کہ اس مہم پر حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ بھیجے گئے۔ انہیں حکم تھا کہ وہ گرامی نامہ بصریٰ[۱] کے حاکم حارث بن ابوشمر غسانی کے حوالہ کر دیں، تاکہ وہ اسے ہرقل تک پہنچا سکے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غسانی نے گرامی نامہ عدی بن حاتم کے ذریعہ ہرقل کے پاس بھیجا۔ عدی بن حاتم اس وقت نصرانیت پر قائم تھے اور مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ اور حضرت دحیہ کلبیؓ ہرقل کے پاس پہنچے[۲]

مکتوبِ گرامی بھیجے جانے کا زمانہ

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ایرانیوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کے بعد روم کو فتح حاصل ہوئی تھی[۳] انہوں نے ایران سے اپنے تمام مقبوضہ علاقے واپس لے لیے اور صلیبِ اعظم، جسے ایرانی چھین کر لے گئے تھے، انہیں واپس مل گئی تھی۔ ہرقل نے اس جنگ کے سلسلے میں نذر مان رکھی تھی کہ وہ اس میں فتح یاب ہوا تو بیت المقدس پیدل جائے گا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے گا۔ چناں چہ جس وقت حمص میں اسے فتح کی خوش خبری ملی، وہ نذر پوری کرنے کے لیے پوری شاہانہ شان کے ساتھ اس طرح روانہ ہوا کہ راستہ

= خیریت سے واپس آجاتا ہے تو بھی اسے یہ ثواب ملے گا۔ ملاحظہ ہو زرقانی علی المواهب: ۳۳۵/۳

۱۔ بصریٰ مدینہ اور شام کے درمیان ایک شہر کا نام ہے۔ فتح الباری: ۱/۲۸۔ بعض لوگوں نے اسے حوران کا صدر مقام (محافظہ) بھی بتایا ہے۔ یہ شامی علاقہ کا پہلا شہر ہے جو بعد میں فتح ہوا۔ نووی: تہذیب الاسماء واللغات: ۱/۳۷

۲۔ فتح الباری: ۱/۲۸

۳۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایران کی فوجوں نے کام یابی حاصل کر لی تو کسریٰ نے (سیاسی اسباب کی بنا پر) اپنے امیر شہر براز کو قتل کر کے فرحان کو امیر بنانا چاہا۔ اس کا علم شہر براز کو کسی طرح ہوگیا تو وہ درپردہ ہرقل کے ساتھ مل گیا۔ اس کے بعد جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ فتح الباری: ۱/۲۵

میں اس کے لیے قالین کا فرش بچھایا جاتا تھا اور گلاب کی بارش ہوتی تھی۔ اس طرح اس نے بیت المقدس پہنچ کر اپنی نذر پوری کی اور نماز ادا کی۔[1]

بیت المقدس کے اسی سفر کے دوران میں اسے رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی ملا۔ اس مکتوب اور اس پر اس کے ردعمل کا حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں کہیں اختصار کے ساتھ اور کہیں تفصیل سے ذکر موجود ہے۔ یہاں صحیح بخاری اور طبری سے اس کی تفصیل پیش کی جارہی ہے[2] حسب ضرورت دوسرے ماخذ سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔

ہرقل کی افسردگی اور پریشانی

ابن ناطور شام کے نصاریٰ کا اسقف یعنی مذہبی رہنما تھا۔ بیت المقدس اور فلسطین اسی کے ماتحت تھا اور وہ ہرقل سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ وہ اس سفر کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ ہرقل ایک روز بہت افسردہ اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ دربار کے مذہبی راہ نماؤں اور بزرگوں نے وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا.....ابن ناطور کہتا ہے کہ ہرقل علمِ نجوم کا ماہر تھا..... کہ رات میں نے ستاروں کو دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ختنہ کرنے والی قوم کی بادشاہت ظاہر ہو چکی ہے۔ (وہ میری سلطنت کا خاتمہ کر کے رکھ دے گی) درباریوں نے کہا کہ آپ کی مملکت میں صرف یہود ختنہ کرتے ہیں۔ وہ آپ کے زیر اقتدار اور ماتحت ہیں۔ آپ اپنے گورنروں کو ہدایت کر دیں کہ ان کے ماتحت جو یہود ہیں سب کی گردنیں اڑا دیں۔ اس فکر و تردد سے آپ کو نجات مل جائے گی۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ غسان کے بادشاہ (بصریٰ کا حاکم) کا قاصد ایک شخص کو لے کر ہرقل کے پاس پہنچا۔ روایت میں آتا ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ ایک دوسرے

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک: ۲/ ۶۴۲

[2] بخاری میں دوجگہ اس واقعہ کا نسبتاً تفصیل سے ذکر ہے۔ ایک کیف کان بدء الوحی اور دوسری جگہ کتاب الجہاد، باب دعاء النبی الی الاسلام و النبوۃ الخ۔ طبری کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ الامم و الملوک: ۲/ ۶۴۲-۶۵۱

کو اہم خبریں پہنچایا کرتے تھے۔ اس نے عرض کیا: جہاں پناہ! اس شخص کا تعلق عرب سے ہے، جو بکریوں اور اونٹ والے ہیں۔ یہ اپنے ملک میں پیش آنے والے ایک عجیب وغریب واقعہ کی خبر دے رہا ہے[۱]

ہرقل نے اپنے ترجمان کی مدد سے اس شخص سے دریافت کیا کہ اس کے ملک میں کیا خاص بات پیش آئی ہے؟ اس کے جواب میں اس شخص نے کہا کہ ہمارے درمیان ایک آدمی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کا ساتھ دیا ہے اور کچھ لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کے درمیان کئی ایک جنگیں بھی ہوئیں۔ جب میں نے وطن چھوڑا ہے تو یہ صورت حال تھی (اس کے بعد کا حال مجھے معلوم نہیں ہے)۔

گفتگو ختم ہوئی تو ہرقل نے کہا کہ اس شخص کے کپڑے اتار دو۔ جب کپڑے اتارے گئے تو وہ مختون پایا گیا۔ اس پر ہرقل نے کہاکہ یہ ہے وہ چیز جو میں نے دیکھی۔ وہ نہیں ہے جو تم بیان کرتے ہو۔ یعنی میں نے ستاروں میں جس بادشاہت کو دیکھا ہے وہ عرب کی بادشاہت ہے، یہود کی بادشاہت نہیں ہے۔ طبری میں ہے کہ اس کے بعد اس نے اپنے معاون خاص کو حکم دیا کہ پورے شام میں کسی ایسے شخص کو تلاش کر کے لے آؤ جو نبوت کا دعویٰ کرنے والے اس آدمی کے خاندان اور قبیلہ کا ہو[۲]

خاندانِ نبوت سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کی تلاش

اس روایت سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس وقت تک رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی ہرقل کو نہیں ملا تھا، لیکن بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے: **لما جاء قیصر کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلّم قال حین قرأہ التمسوا ھٰھنا**

---

[۱] حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ کون شخص تھا، روایات میں اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی۔ اس کا امکان ہے کہ اس سے عدی بن حاتم مراد ہوں، جن کے بارے میں آتا ہے کہ بصریٰ کے حاکم نے انہیں دحیہ بن خلیفہؓ کے ساتھ بھیجا تھا۔ فتح الباری:۱/ ۳۲

[۲] تاریخ الامم والملوک :۲ / ۶۴۷

احدا من قومه لاسألهم عن رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم[۱] اس کا مطلب یہ ہے کہ گرامی نامہ ملنے کے بعد ہرقل نے آپ سے قریبی تعلق رکھنے والے کسی فرد کی تلاش کا حکم دیا تھا۔

ویسے ان دونوں روایتوں میں کوئی خاص تضاد بھی نہیں محسوس ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ ملک غسان نے جس آدمی کو روانہ کیا ہو وہ اور آپ کے سفیر حضرت دحیہؓ دونوں ایک ساتھ ہی پہنچے ہوں۔ کسی راوی نے ایک کا ذکر کیا ہو اور کسی نے دوسرے کا۔[۲]

حضرت ابوسفیان ان دنوں ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام میں موجود تھے۔ انہوں نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ بیان کرتے ہیں کہ ہم قریش کے لوگ تجارت پیشہ تھے۔ لیکن جب قریش اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان جنگیں شروع ہوگئیں تو ہماری تجارت ختم ہوگئی۔ صلح حدیبیہ ہوئی تو پھر تجارت کا موقع ملا۔ چناں چہ میں نے قریش کے چند لوگوں کے ساتھ سامانِ تجارت لے کر شام کا سفر کیا۔[۳]

۱۔ بخاری، کتاب الجہاد، باب دعاء النبی الی الاسلام و النبوۃ۔ اس کے نتیجے میں ہرقل اور حضرت ابوسفیانؓ کے درمیان طویل گفتگو ہوئی، جس کا آگے ذکر آرہا ہے۔ اسی ذیل میں حضرت ابوسفیانؓ کہتے ہیں کہ جب ہماری گفتگو ختم ہوئی تو ہرقل نے اس شخص سے نامہ مبارک لے کر (مجلس میں) پڑھا جس کے حوالے اس نے اسے کر رکھا تھا۔ بخاری، کیف کان بدء الوحی الخ

۲۔ اس امکان کو اس روایت سے تقویت ملتی ہے جو اوپر گزر چکی ہے کہ ملک غسان نے عدی بن حاتم کو حضرت دحیہؓ کے ساتھ بھیجا تھا۔

۳۔ حضرت ابوسفیان اس سفر کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مکہ کا کوئی مرد یا عورت ایسا نہیں تھا جس نے مجھے اپنا سامان نہ دیا ہو۔ حاکم کی ایک روایت میں ہے کہ ابوسفیان کا یہ تجارتی قافلہ تیس افراد پر مشتمل تھا۔ بعض روایات میں ان کی تعداد تقریباً بیس بتائی گئی ہے۔ ان لوگوں میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہرقل نے حضرت ابوسفیان اور حضرت مغیرہ دونوں کو دریافت حال کے لیے طلب کیا تھا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ حضرت مغیرہ اس سے پہلے اسلام لا چکے تھے، الاّ یہ کہ یہ کہا جائے کہ وہ ہرقل کے دربار سے واپس ہوکر مدینہ پہنچے اور اسلام قبول کیا۔ ملاحظہ ہو فتح الباری: ۱/۲۴

ہمارا قافلہ غزہ میں تھا کہ ہرقل کے کارندے اچانک ہمارے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا آپ لوگ حجاز سے آرہے ہیں جہاں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ ہم نے کہا: ہاں! انہوں نے کہا: بادشاہ نے آپ لوگوں کو طلب کیا ہے۔ آپ لوگ ہمارے ساتھ چلیں۔ چناں چہ ہم لوگ ان کے ساتھ ہرقل کے دربار پہنچے۔ وہاں وہ اپنے درباریوں اور رومی اکابر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہم لوگوں سے اپنے مترجم کے ذریعہ پوچھا کہ تم میں سے کس کا اس نبی سے قریبی رشتہ ہے؟ میں نے کہا: میں اس کا سب سے قریبی رشتہ دار ہوں۔ اس نے رشتہ کی وضاحت چاہی تو میں نے کہا: وہ میرا ابن عم (چچا زاد بھائی) ہے[1] اس نے مجھے اپنے قریب جگہ دی اور میرے ساتھیوں کو حکم دیا کہ میرے پیچھے بیٹھ جائیں۔ پھر اپنے مترجم سے کہا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں اس شخص سے اس آدمی کے بارے میں کچھ سوالات کروں گا جو نبی ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اگر یہ جھوٹ بولے تو اس کی تردید کر دیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں ابوسفیان کی گواہی

حضرت ابوسفیان فرماتے ہیں کہ میں اپنی قوم کا سردار تھا۔ مجھے جھوٹ بولنے میں شرم محسوس ہوئی۔ اگر میں جھوٹ بولتا تو گو اس وقت میرے ساتھی میری تردید نہ کرتے، لیکن بعد میں میری غلط بیانی کا چرچا ہوتا۔ اس لیے میں نے اس کے سوالات کے صحیح جوابات دیے۔ (پہلے تو) میں نے رسول اللہ ﷺ کی حیثیت اور آپ کا مرتبہ اور مقام گھٹانے کی کوشش کی اور کہا کہ آپ انہیں کچھ زیادہ اہمیت نہ دیں۔ ان کا معاملہ اتنا بڑا اور اہم نہیں ہے جتنا کہ آپ نے سنا ہے، لیکن اس نے میری ان باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور کہا کہ جو سوالات کروں ان کا جواب دو۔ میں نے کہا: بہت اچھا! ارشاد ہو۔ اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی:

اس کا پہلا سوال تھا کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے اس کا خاندان اور

---

[1] عبد مناف پر رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوسفیان کا رشتہ مل جاتا ہے۔

حسب نسب کیسا ہے؟

میں نے کہا: وہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا نسب بے آمیز اور خالص ہے۔

اس نے دوسرا سوال کیا کہ کیا اس کے خاندان میں اس سے پہلے کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟

میں نے نفی میں جواب دیا کہ کسی نے اس طرح کا دعویٰ نہیں کیا۔

اس نے پوچھا: کہیں ایسا تو نہیں کہ اس دعویٰ سے پہلے تمہارے درمیان اسے یا اس کے باپ دادا کو سلطنت اور اقتدار حاصل رہا ہو اور تم نے وہ اقتدار چھین لیا ہو؟

میں نے کہا: نہیں! اسے یا اس کے بزرگوں کو کوئی اقتدار حاصل نہیں تھا۔

اس نے سوال کیا: پہلے سے تمہیں اس کے بارے میں یہ تجربہ تو نہیں کہ وہ جھوٹ بولتا ہے؟

میں نے کہا: نہیں، اس پر جھوٹ بولنے کا الزام کبھی نہیں لگایا گیا۔

اس کے بعد اس نے پوچھا: کون لوگ اس کی بات مان رہے ہیں؟ سردارانِ قوم اس کی اتباع کر رہے ہیں یا کم زور اور چھوٹے افراد؟

میں نے کہا: ضعفا اور مساکین اور نوجوان لڑکے لڑکیاں اس کی اتباع کر رہے ہیں۔ قوم کے سن رسیدہ اور اعلیٰ افراد میں سے کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

اس نے پوچھا کہ اس کی اتباع کرنے والے بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟

میں نے کہا: وہ تو بڑھ ہی رہے ہیں۔

اس کے بعد اس کا سوال تھا کہ جو لوگ اس کے دین کو قبول کرتے ہیں کیا وہ اسے ناپسند کر کے مرتد بھی ہو جاتے ہیں؟ ایک روایت میں سوال اس طرح ہے کہ اس کی اتباع کرنے والے اس سے محبت کرتے اور اس سے گہرا قلبی تعلق رکھتے ہیں یا اس سے متنفر ہو کر اسے چھوڑ دیتے ہیں؟

میں نے کہا: ابھی تک ایسا نہیں ہوا کہ اس کے کسی ساتھی نے اسے چھوڑ دیا ہو۔
ہرقل نے پوچھا: کیا وہ وعدہ خلافی بھی کرتا ہے؟
حضرت ابوسفیان فرماتے ہیں کہ مجھے آپ کے خلاف کچھ بولنے کا موقع صرف اسی ایک سوال کے ذیل میں مل سکا۔ میں نے کہا کہ اس نے ابھی تک کوئی وعدہ خلافی نہیں کی ہے۔ البتہ اس وقت ہمارے اور اس کے درمیان ایک مدت کے لیے صلح ہوئی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ اس مدت میں کیا کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ وعدہ خلافی کرگزرے۔ قسم خدا کی، اس نے میری ان باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔
اس نے سوال کیا کہ تمہارے اور اس کے درمیان جنگیں ہوئی ہوں تو ان کا نتیجہ کیا رہا؟
میں نے کہا: کبھی اس نے فتح حاصل کی اور کبھی ہم کام یاب رہے۔
اس نے آخری سوال کیا کہ وہ کن باتوں کی تعلیم دیتا ہے؟
میں نے کہا: اس کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ واحد کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، تمہارے باپ دادا جو کچھ کہتے (اور کرتے) آئے ہیں اسے چھوڑ دو۔ وہ نماز کا، صدقہ اور انفاق کا، صداقت اور راست بازی کا، عفت و عصمت کا اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔

ہرقل کا تبصرہ

اس کے بعد ہرقل نے میری باتوں کو دہراتے ہوئے کہا کہ میں نے تم سے اس نبی کے حسب نسب کے بارے میں سوال کیا تو تم نے کہا کہ وہ تمہارے درمیان اعلیٰ نسب کا ہے۔ اللہ کے رسول اپنی قوم کے اعلیٰ خاندان میں مبعوث ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے خاندان میں اس سے پہلے کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟ تم نے کہا: نہیں۔ اگر کسی نے اس سے پہلے یہ دعویٰ کیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس شخص نے محض اس کی نقل اتاری ہے۔ میں نے تم سے سوال کیا کہ اس کے خاندان میں کیا کوئی بادشاہ گزرا ہے، جس سے تم نے اس کی بادشاہت چھین لی ہو۔ تم نے اس کا نفی میں جواب دیا۔

اگر تمہارا جواب اثبات میں ہوتا تو میں خیال کرتا کہ یہ آدمی اپنے باپ دادا کی سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا کہ کیا تم نے اس کو کذب بیانی کا مرتکب پایا ہے؟ تم نے کہا: نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص لوگوں کے معاملات میں جھوٹ نہ بولے وہ اللہ کے معاملے میں کبھی دروغ گوئی نہیں کرسکتا۔ میں نے تم سے اس کی اتباع کرنے والوں کے بارے میں معلوم کیا تو تم نے بتایا کہ کم زور لوگ اس کی اتباع کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ معاشرے کے کم زور لوگ ہی رسولوں کی اتباع کرتے ہیں۔ اس کے بعد میرا تم سے سوال تھا کہ وہ بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ تم نے بتایا کہ وہ بڑھ رہے ہیں۔ یہی حال ایمان کا ہے۔ (اس کی روشنی آہستہ آہستہ پھیلتی ہے اور پھر ہر طرف چھا جاتی ہے) میں نے تم سے پوچھا کہ جو لوگ اس کے دین کو قبول کرتے ہیں ان میں سے کوئی اسے ناپسند کر کے مرتد بھی ہوجاتا ہے؟ تم نے کہا: ایسا نہیں ہوتا۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب ایمان کا سرور دل میں داخل ہوجاتا ہے تو آدمی اس سے کبھی پھر نہیں سکتا۔ میں نے تم سے پوچھا: کیا وہ دھوکا بھی دیتا ہے؟ تم نے کہا: نہیں۔ یہ رسولوں کا وصف ہے کہ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ میں نے تم سے دریافت کیا کہ وہ کن باتوں کی تعلیم دیتا ہے؟ تم نے بتایا کہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور بت پرستی کو چھوڑ دو۔ اسی طرح وہ نماز، انفاق، سچائی اور راست بازی، عفت وعصمت، وفائے عہد اور دیانت و امانت کا حکم دیتا ہے۔ (انبیاء کی تعلیم اسی نوعیت کی ہوتی ہے) میں نے تم سے اس کے اور تمہارے درمیان ہونے والی جنگوں کا حال پوچھا تو تم نے بتایا کہ نتیجہ کبھی اس کے حق میں ہوتا ہے اور کبھی تمہارے حق میں۔ رسولوں کا اسی طرح امتحان ہوتا ہے، بالآخر فتح ان ہی کی ہوتی ہے۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سچے نبی ہیں) میرا خیال تھا کہ ان کے ظہور کا وقت قریب آگیا ہے، لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ تمہارے درمیان ظاہر ہوگا۔ تم جو کچھ کہتے ہو اگر وہ صحیح ہے تو بہت جلد میرے قدموں کے نیچے کی اس زمین پر اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ اگر میرے لیے

اس تک رسائی ممکن ہوتی تو مشقت برداشت کر کے میں اس کے پاس پہنچتا۔ اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پیر دھوتا۔

ہرقل کے نام مکتوبِ نبویؐ

پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی طلب کیا، جسے آپ نے حضرت دحیہ کلبیؓ کے ذریعہ بصریٰ کے حاکم کے پاس بھجوایا تھا، تاکہ وہ اسے ہرقل تک پہنچا دے۔ مکتوب گرامی یہ تھا:

بسم الله الرحمٰن الرحيم من محمد عبده ورسوله الى هرقل عظيم الروم سلام على من اتبع الهدىٰ اما بعد فانى ادعوك بدعاية الاسلام اسلم تسلم يؤتك اللّٰه اجرك مرتين فان تولّيت فان عليك اثم الاريسيين وَ يَا اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوْا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد (ﷺ) کی طرف سے جو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے، روم کی عظیم شخصیت ہرقل کے نام۔ سلامتی ہے اس شخص پر جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی اتباع کرے۔ اما بعد! میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کرو، امن اور سلامتی پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں (اہل کتاب ہونے کی حیثیت سے) دوگنا اجر عطا کرے گا۔ اگر تم اللہ کی ہدایت سے انکار کرتے ہو تو تم پر (اپنے گناہ کے علاوہ) ملک کے کاشت کاروں (رعایا) کا بھی گناہ ہوگا۔ (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:) اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا رب نہ بنائے۔ اگر اس دعوت کو قبول کرنے سے وہ منہ موڑیں تو ان سے کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو اسی کے اطاعت گزار ہیں۔

---

[1] بخاری، حوالہ سابق۔ مکتوب گرامی کے آخر میں حوالہ سورۂ آل عمران کی آیت ۶۴ کا ہے۔

حضرت ابوسفیان فرماتے ہیں کہ ہرقل نے جب آپ کی نسبت ان خیالات کا اظہار کیا اور نامہ گرامی پڑھ کر فارغ ہوا تو دربار میں شور وشغب شروع ہوگیا اور آوازیں بلند ہونے لگیں۔ (اس کیفیت کے پیدا ہوتے ہی) ہمیں دربار سے رخصت ہونے کا حکم دیا گیا۔ باہر نکل کر میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آپؐ کا معاملہ بہت ترقی کر چکا ہے۔ روم کا بادشاہ بھی آپ سے خوف کھا رہا ہے۔ میرے دل میں اسی وقت یہ بات بیٹھ گئی کہ آپ غالب ہوکر رہیں گے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام قبول کرنے کی سعادت بخشی[۱]۔

---

[۱] بخاری، کیف کان بدء الوحی۔

حضرت ابوسفیان اور ہرقل کی اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے دشمن تھے وہ بھی آپ کے بے داغ کردار کی شہادت دینے پر مجبور تھے۔ آپ کے اعلانِ نبوت کے بعد ہی سے حضرت ابوسفیان آپ سے مسلسل برسرِ پیکار تھے، بلکہ آپ کے مخالفین کی قیادت کرتے رہے، بارہا جنگیں ہوئیں، لیکن اس کے باوجود انہیں آپ کی سیرت میں کوئی خامی محسوس نہیں ہوئی۔ حضرت ابوسفیان تنہا نہیں تھے، بلکہ ان کے ساتھ بیس تیس افراد کا قافلہ تھا۔ قافلہ کا ہر فرد آپ کا ہم وطن تھا۔ اس کے سامنے آپ کی پوری زندگی کھلی کتاب کی مانند تھی۔ ان میں سے کوئی ایک بھی نہ تو اس وقت اور نہ اس کے بعد ہمت کر سکا کہ آپ کے اخلاق و کردار پر انگشت نمائی کر سکے۔ سب کے سب خاموشی سے حضرت ابوسفیان کے بیان کی تصدیق کر رہے تھے۔

ہرقل نے حضرت ابوسفیانؓ سے آپ کی تعلیمات، سیرت و اخلاق، آپ کے ساتھیوں کی استقامت اور دشمنوں کے ساتھ آپ کے رویہ کو معلوم کر کے آپ کے نبی برحق ہونے کی گواہی دی۔ اس سے خیال ہوتا کہ حضرت ابوسفیان اور ان کے ساتھیوں کے دلوں میں ایک طوفان برپا ہوگیا ہوگا۔ انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ جس شخص سے ہم تقریباً بیس برس سے لڑ رہے ہیں، اسے ایک اجنبی شخص، جو بہت بڑی سلطنت کا فرماں روا ہے، اپنے دعویٰ میں سچا کہہ رہا ہے۔ اس شخص سے ہماری جنگ صداقت سے جنگ ہے، جو کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ان میں سے کتنے ہی دلوں کی دنیا اسی وقت بدل گئی ہوگی اور وہ اپنے رویہ پر نظرِ ثانی کے لیے مجبور ہو چکے ہوں گے۔

بخاری کی دوسری روایت

دربار کے لوگوں اور روم کے اکابر نے جس طرح ہرقل کی رائے کی مخالفت کی اس کی تفصیل بخاری کی ایک اور روایت میں ملتی ہے:

ہرقل نے روم کے پادری کو، جو اس کا خاص آدمی تھا اور اس کی طرح صاحب علم بھی تھا، اس سلسلہ میں خط لکھا۔ اس کے بعد وہ حمص روانہ ہوگیا۔ وہ حمص ہی میں تھا کہ روم کے اس پادری کا جواب اسے ملا۔ اس میں اس نے ہرقل کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا کہ جس نبی کی آمد کا انتظار تھا وہ یہی نبی ہیں۔ اس کے بعد ہرقل نے روم کے تمام اکابر کو محل میں جمع کیا اور اس کے سب دروازے بند کرا دیے۔ اس نے ان سے خطاب کیا کہ اے اہل روم! میں تمہیں رشد و فلاح کی بات بتانا چاہتا ہوں۔ اس سے تمہاری سلطنت بھی باقی رہ سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اس نبی کی اتباع کرو۔ یہ سنتے ہی سب کے سب جنگلی گدھوں کی طرح بدک کر دروازوں کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن دروازے بند تھے۔ ہرقل نے جب یہ کیفیت دیکھی اور اسے ان کے ایمان لانے کی توقع نہیں رہی تو اس نے دوبارہ ان کو جمع ہونے کا حکم دیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی بات صرف یہ دیکھنے کے لیے کہی تھی کہ تم اپنے دین پر کس حد تک ثابت قدم ہو۔ اب مجھے تمہاری استقامت پر اطمینان ہوگیا ہے۔ یہ سن کر سب لوگ اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑے اور مسرت اور خوشی کا اظہار کرنے لگے[1]

طبری کی روایت

طبری کی روایت میں اس کی کچھ اور تفصیل ملتی ہے۔ اس میں ہے کہ ہرقل

---

[1] بخاری حوالہ سابق۔ ابن سعد میں بھی یہ تفصیل موجود ہے البتہ روم کے پادری کا ذکر نہیں ہے۔ ہرقل کے خطاب میں چند جملوں کا اضافہ ہے۔ وہ یہ کہ اے اہل روم! کیا تم چاہتے ہو کہ رشد و فلاح حاصل ہو، تمہاری سلطنت باقی رہے۔ عیسیٰ بن مریم نے جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔ لوگوں نے اسے جاننا چاہا تو اس نے آپ کی اتباع کا ذکر کیا۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۲۵۹

نے حضرت دحیہؓ کو روم کے پادری، جس کا نام روایت میں ضغاطر بتایا گیا ہے، کے پاس بھیجا اور کہا کہ رومی مجھ سے زیادہ اس کی عظمت کے قائل ہیں اور اس کی بات کو اہمیت دیتے ہیں۔ حضرت دحیہؓ اس کے پاس پہنچے اور ہرقل کا پیغام پہنچایا۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت اس کے سامنے پیش کی۔ ضغاطر نے یہ سن کر کہا کہ خدا کی قسم، تم نے جس شخصیت کا ذکر کیا ہے وہ واقعتاً اللہ کے رسول ہیں۔ ان کی صفات سے ہم واقف ہیں۔ ان کے نام تک کی صراحت ہماری کتابوں میں ہے۔ پھر وہ کمرہ میں گیا۔ اپنا سیاہ لباس اتارا، سفید کپڑے پہنے اور اپنا عصا لیے ہوئے کلیسا میں پہنچا جہاں رومی موجود تھے۔ وہاں اس نے اعلان کیا: اے اہل روم! میرے پاس احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے ایک خط آیا ہے۔ اس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ پر ایمان کی دعوت دی ہے۔ (مجھے ان کی صداقت پر یقین ہے) یہ کہہ کر اس نے کلمہ شہادت اشهد ان لا اله الا الله و ان محمدا عبده و رسوله پڑھا۔ اس نے جیسے ہی اپنے اسلام کا اعلان کیا، عوام اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے قتل کر ڈالا۔

حضرت دحیہؓ ہرقل کے پاس دوبارہ پہنچے اور اسے اس کی اطلاع دی۔ اس نے کہا: میں نے تم سے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اسلام قبول کرنے میں ہمیں اپنی جان کا اندیشہ ہے۔ خدا کی قسم! ضغاطر ان کے نزدیک مجھ سے زیادہ عظمت کا مالک تھا اور اس کی بات کا زیادہ اعتبار تھا[۲]

طبری کی دوسری روایت

ایک اور روایت میں اس کی مزید کچھ تفصیل ملتی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ہرقل شام سے قسطنطنیہ روانگی کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور دعوت کی خبر اسے ملی۔ اس نے رومیوں کو جمع کیا اور کہا کہ میں نے ایک بات سوچی ہے،

---

۲ طبری، تاریخ الامم والملوک: ۲/ ۶۵۰-۶۵۱

اسے تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اس پر غور کرو۔ لوگوں نے سوال کیا: وہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا رسول ہے۔ ان کا ذکر ہماری کتاب (انجیل مقدس) میں موجود ہے۔ اس میں (آنے والے رسول کے) جو اوصاف بیان ہوئے ہیں، وہ بھی ہم ان کے اندر پاتے ہیں۔ آؤ، ان کی اتباع کریں، تاکہ ہماری دنیا اور آخرت دونوں سلامت رہے۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ اس کا مطلب ہے کہ ہم عرب کے ماتحت ہوجائیں، جب کہ ہم ایک وسیع سلطنت کے مالک ہیں، ہماری آبادی ان سے کہیں زیادہ ہے اور ہمارے پاس ان سے بہتر شہر ہیں۔ ہرقل نے کہا: اس سے تمہیں اتفاق نہیں ہے تو آؤ، اسے ہر سال جزیہ دیں، تاکہ مال دے کر اس سے جنگ سے بچے رہیں۔ ان لوگوں نے اس سے بھی اختلاف کیا اور کہا: اس کا مطلب ہے کہ ہم عرب کے سامنے ذلیل اور چھوٹے بن کر رہیں اور وہ ہم سے خراج وصول کریں، جب کہ ہم تعداد میں ان سے بہت زیادہ ہیں، ہماری سلطنت اور حکومت زیادہ بڑی ہے اور ہمارے شہر زیادہ محفوظ ہیں۔ خدا کی قسم، ہم اس تجویز پر بھی عمل نہیں کر سکتے۔ ہرقل نے کہا: اچھا تو آؤ، اس سے صلح کر لیں۔ اس طرح کہ سوریا (اس سے مراد فلسطین، اردن، دمشق وغیرہ جنوب کا علاقہ ہے) اس کے حوالہ کر دیں اور وہ شام سے تعرض نہ کرے۔ رومیوں نے اس سے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ سوریا ان کے حوالہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ یہی تو شام کا شاداب علاقہ ہے۔

جب ان سب باتوں کو ماننے سے رومیوں نے انکار کر دیا تو اس نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ تم اپنے شہروں ہی میں رہ کر اس کے مقابلہ میں کام یاب رہو گے۔ پھر وہ سوار ہو کر روانہ ہوا۔ جب درب پہنچا تو اس نے شام کی طرف رخ کر کے کہا: اے ارضِ شام! تجھے الوداعی سلام کر رہا ہوں۔ یہاں سے قسطنطنیہ روانہ ہوگیا۔[1]

---

[1] طبری: تاریخ الامم والملوک: ۲/ ۶۵۱

ہرقل کا رویّہ

حدیث اور تاریخ کی یہ تفصیلات بتاتی ہیں کہ ہرقل کو اس بات کا یقین تھا کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ اس یقین کی بنیاد ایک تو اس کی مذہبی معلومات تھیں۔ وہ انجیل کی ان پیشین گوئیوں سے بخوبی واقف تھا جن میں ایک آخری نبی کی آمد کی خوش خبری دی گئی ہے۔ اس نبی کی جو اعلیٰ خصوصیات اور پاکیزہ صفات بیان ہوئی ہیں وہ سب آپ کی ذات پر پوری طرح منطبق ہو رہی ہیں۔ (موجودہ عیسائی دنیا نے ان پیشین گوئیوں کو تاویل کے خراد پر چڑھا رکھا ہے)

روایات میں علم نجوم سے اس کی واقفیت کا بھی ذکر ہے۔ یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ اس علم کی حیثیت کیا ہے اور اس پر اعتماد کیا بھی جا سکتا ہے یا نہیں؟ کہنا صرف اس قدر ہے کہ اس نے اپنے اس علم کی روشنی میں اس خیال کا اظہار کیا کہ آپ کے دورِ اقتدار کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ چیز اس کے لیے باعثِ تشویش بھی تھی۔

حضرت ابوسفیانؓ سے اس کی گفتگو ظاہر کرتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی سیرت، دعوت اور اس کے انقلاب انگیز نتائج سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس گفتگو کے بعد اسے آپ کی رسالت پر مزید اطمینان ہوگیا۔ گو کہ اس کے ایک دو جملوں سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے اس بات کا پورا یقین نہیں تھا کہ آپ ہی رسولِ موعود ہیں، لیکن اس میں اس بات کا امکان ہے کہ اس نے اپنے یقین کا کھل کر اظہار سیاسی مصلحت کے تحت نہ کیا ہو۔

یہ اس کا ایک انداز بیان بھی ہوسکتا ہے اس لیے کہ اس کی گفتگو کا پورا رخ ہی دوسرا ہے۔ اس نے آپ سے انتہائی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا اور یہاں تک کہا کہ وہ سراقدس کو بوسہ دینے اور پائے مبارک کو دھونے میں اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ گرامی نامہ پڑھتے ہوئے اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی۔[1]

---

[1] فتح الباری:۱/۲۸

یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب دل اندر سے آپ کے رسول ہونے کی گواہی دے رہا ہو۔

ہرقل نے روم کے مشہور شہر رومیہ کے مذہبی رہ نما ضغاطر[۱] کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا اور اس کی رائے طلب کی تو اس نے اس کے خیال کی نہ صرف یہ کہ تائید کی، بلکہ آگے بڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔

اس نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ حضرت مسیحؑ کی تعلیمات، رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی اتباع کرنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ اسی میں دنیا اور آخرت کی کام یابی ہے۔ اس نے یہ سمجھانے کی بھی کوشش کی کہ آپ کی مخالفت کام یاب نہ ہوگی، آپ کا دین غالب ہو کر رہے گا اور آپ کے ہاتھوں اس کی سلطنت زوال سے دوچار ہوگی۔ لیکن اس کی قوم نے اس کی ان باتوں کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے جنگ سے بچنے کی متبادل صورتیں بھی پیش کیں، لیکن قوم نے ان سب کو رد کر دیا تو اسے ان کی طرف سے مایوسی ہوگئی۔

سب سے اہم سوال خود ہرقل کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ کیا ایمان فی الواقع اس کے دل میں اتر گیا تھا؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ وہ دل سے ایمان تو لے آیا تھا، لیکن اس کے اظہار کی جرأت نہ کر سکا۔ ضغاطر کے ساتھ اس کی قوم کے رویہ کو دیکھ کر اسے یقین ہوگیا کہ قوم اسے برداشت نہ کر سکے گی، اس کی حکومت چھن جائے گی اور اسے اپنی زندگی سے ہی ہاتھ دھونا پڑے گا۔[۲]

دوسری رائے یہ ہے کہ اس اطمینان کے باوجود کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، وہ

---

[۱] ضغاطر کے نام کی صراحت بخاری میں نہیں ہے۔ اسے "صاحب له برومية و كان نظيره في العلم" کہا گیا ہے۔ یعنی رومیہ میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا، جو خود بھی ہرقل کی طرح (عیسائیت کا) عالم تھا۔ اس سے خود ہرقل کے صاحب علم ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

[۲] اس طرح کی کئی روایات ملتی ہیں کہ ہرقل نے ایمان لانے میں اپنی سلطنت اور اپنی جان کے لیے خطرہ کا اظہار کیا تھا۔ فتح الباری: ۱/ ۲۸

آپ پر ایمان نہیں لایا۔ یہی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کو خط کے ذریعہ اپنے اسلام لانے کی اطلاع دی اور کچھ دینار بھی خدمت میں بھیجے۔ آپ نے خط دیکھ کر فرمایا کہ اللہ کے اس دشمن نے جھوٹ کہا ہے۔ وہ اسلام نہیں لایا، بلکہ نصرانیت پر ہی قائم ہے۔ جو دینار اس نے بھیجے تھے وہ تقسیم فرما دیے۔[1]

صلح حدیبیہ پر دو سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ سن ۸ھ میں غزوۂ موتہ پیش آیا۔ اس میں ہرقل ایک لاکھ کا لشکر لے کر مسلمانوں کے خلاف میدانِ جنگ میں آ گیا۔ مزید ایک لاکھ فوج دوسرے قبائل کی اس کے ساتھ جمع ہوگئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے رسول ہونے کا گو اسے یقین تھا، لیکن پھر بھی وہ کفر کی روش پر قائم رہا۔ اسلام اگر صحیح معنوں میں دل میں جاگزیں ہوجائے تو آدمی دنیا و ما فیہا کو ٹھکرا دیتا ہے۔ اس کی نگاہ میں اس سے بڑی دولت اور کوئی نہیں ہوتی۔ اگر کسی وقتی مجبوری کی بنا پر وہ اس کا اظہار نہ کر سکے تو یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اسلام کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہوجائے۔

---

[1] زاد المعاد: ۱/۱۲۱۔ مزید روایات کے لیے ملاحظہ ہو۔ فتح الباری: ۱/۲۸

(سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۸۸ء)

☆☆☆

عرب کے وفود۔ دربارِ رسالت میں
(یہ وفود تبلیغِ دین کا ذریعہ تھے)

رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی تو مدینہ منورہ نے آپ کا پرجوش جذباتِ محبت وعقیدت سے استقبال کیا۔ مدینہ پہنچ کر آپ نے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی، جہاں تمام امور، اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی شریعت کے مطابق انجام پاتے تھے۔ اس ریاست کے قیام پر ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ دور و نزدیک کے قبائل سے اس کے تعلقات قائم ہونے شروع ہو گئے اور مختلف قبائل کے وفود مدینہ آنے لگے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا وفد مضر کی شاخ مزینہ کا تھا، جو رجب سن ۵ھ میں حاضر ہوا[1]

فتح مکہ نے ثابت کر دیا کہ اسلام ایک ناقابل تسخیر قوت ہے۔ اسے دبایا اور مٹایا نہیں جا سکتا۔ جو قبائل اسلام کی بقا اور اس کی کام یابی کے بارے میں تردد کا شکار تھے ان کا تردد ختم ہو گیا اور قبیلے کے قبیلے دائرۂ اسلام میں آنے لگے۔ اس سلسلہ میں لگاتار مدینہ ان کے وفود کی آمد شروع ہو گئی۔ رمضان سن ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور سن ۹ ھ میں ان وفود کی آمد اس کثرت سے ہوئی کہ مورخین اسے 'سنة الوفود' (وفود کا سال) کے نام سے یاد کرتے ہیں[2]

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۱۹۲۔ اس پر مزید بحث کے لیے دیکھی جائے ابن کثیر کی السیرة النبویة: ۴/ ۷۷ اور آگے۔

[2] ابن ہشام، السیرة النبویة: ۴/ ۲۱۴

فتح مکہ کے بعد تیزی سے اشاعتِ اسلام کی وجہ

فتح مکہ کے بعد قبائل عرب کے اس تیزی سے اسلام قبول کرنے کی وجہ حضرت عمرو بن سلمہؓ بیان کرتے ہیں:

كانت العرب تلوم باسلامهم الفتح فيقولون اتركوه و قومه فانه ان ظهر عليهم فهو نبي صادق فلما كانت وقعة الفتح بادر كل قوم باسلامهم و بادر قومي باسلامهم[1]

عرب اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی قوم کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ ان پر غلبہ حاصل کر لیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ سچے نبی ہیں۔ چناں چہ جب مکہ فتح ہوگیا تو ہر قوم نے اسلام قبول کرنے میں تیزی دکھائی۔ میری قوم (بنو سلمہ) نے بھی اپنے اسلام کے سلسلہ میں جلدی کی۔

مغازی کے امام محمد بن اسحٰق (م ۱۵۱ھ) نے اسی بات کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اہلِ عرب اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اور قریش کے درمیان جو کش مکش چل رہی ہے وہ کسی نتیجہ تک پہنچے (تاکہ وہ اپنے بارے میں فیصلہ کر سکیں) اس لیے کہ قریش کی حیثیت لوگوں کے امام کی تھی، وہ بیت اللہ اور حرمِ محترم کے متولی تھے اور حضرت اسماعیلؑ سے ان کا نسلی تعلق خالص اور بے آمیز تھا۔ پورا عرب ان کے مقام و مرتبہ کو تسلیم کرتا تھا۔ ان ہی نے رسول اللہ ﷺ سے جنگ کا آغاز کیا تھا۔ جب مکہ فتح ہوگیا، قریش نے سپر ڈال دی اور سب کے سب اسلام کے زیر سایہ آگئے اور اس کی اطاعت قبول کر لی تو اہل عرب کو یقین ہوگیا کہ اب وہ رسول اللہ ﷺ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہر طرف سے گروہ درگروہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اسی کیفیت کو قرآن مجید نے سورۃ النصر میں بیان فرمایا ہے: اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحِ الخ[2]

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب (بغیر عنوان) رواہ نسائی مختصراً۔ کتاب الاذان، باب اجتزاء المرء باذان غیرہ فی الحضر۔

[2] ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۴/ ۲۱۴

مدینہ منورہ میں حاضری دینے والے وفود

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ جو وفود حاضر ہوئے، ابن سعد نے نام بنام ان کی تفصیل فراہم کی ہے۔ اس کے مطابق ان کی تعداد بہتّر [۷۲] ہے۔[1] تحقیق کے بعد اس میں کمی بیشی کا امکان ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ وفود اسلام قبول کرتے، کبھی اس بات کی اطلاع دیتے کہ وہ اسلام لا چکے ہیں، اس کے بعد آپ کی صحبت میں رہ کر دین سیکھتے، اسلامی زندگی کا عملی مشاہدہ کرتے، نماز کے اوقات اور اس کے طریقۂ ادا سے واقفیت حاصل کرتے، احکام شریعت کی تفصیل معلوم کرتے، بعض اوقات آپ ضروری مسائل اِملا کرادیتے، ان کی مشکلات اور مسائل حل فرماتے اور کبھی انعامات اور عطیات سے بھی نوازتے۔

مدینہ علم دین کا مرکز تھا۔ جو وفود اس مرکز سے فیض یاب ہوئے ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ واپس جا کر اپنے قبیلوں میں دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیں۔ قرآن مجید نے ہر قبیلہ کو متوجہ کیا کہ اس میں سے کچھ لوگ مدینہ حاضر ہو کر علم دین حاصل کریں، اس میں بصیرت پیدا کریں اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کے درمیان 'انذار' کا فرض انجام دیں۔ (التوبۃ: ۱۲۲)[3]

جو وفود مدینہ پہنچ کر علم دین حاصل کرتے رسول اللہ ﷺ انہیں ان کی دعوتی و تبلیغی ذمہ داری کی طرف متوجہ فرماتے۔ بعض وفود کے سلسلہ میں ہمیں اس کی صراحت

۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۲۹۱-۳۵۹

۲۔ علامہ ابن کثیر نے ان وفود کے استقصاء کی کوشش کی ہے، البتہ ان کے ہاں ابن سعد کے بیان کردہ بعض وفود کا ذکر نہیں ہے۔ السیرۃ النبویۃ: ۴/ ۷۶-۱۸۴

۳۔ اس آیت پر کسی قدر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'معروف و منکر' طبع جدید: ص، ۲۷، ۷۳۔

بھی ملتی ہے۔ اس طرح کی چند ایک ہدایات یہاں پیش کی جا رہی ہیں:

وفد عبد القیس

۱- سن ۸ھ میں قبیلہ عبدالقیس، جس کا تعلق بنو ربیعہ سے تھا، حاضرِ خدمت ہوا۔ عرض کیا:

ان لَا ناتیک الّا فی الشھر الحرام و بیننا و بینک ھذا الحی من الکفار مضر۔ مرنا بامر فصل نخبر بہ من وراء نا و ندخل بہ الجنۃ[۱]

ہم آپ کی خدمت میں صرف اشھر حرم ہی میں حاضر ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر موجود ہیں (مضر اور ربیعہ کے درمیان جنگ رہتی تھی) اس لیے آپ ہمیں فیصلہ کن بات بتا دیں جس سے ہم اپنے لوگوں کو باخبر کریں جو ہمارے پیچھے رہ گئے ہیں (شریک نہیں ہوسکے ہیں) اور ہم خود بھی جنت میں داخل ہوسکیں۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ دین سیکھتے تھے ان کے سامنے ازخود یہ بات رہتی تھی کہ دوسروں کو اس کی دعوت دینی ہے اور اسے ان تک پہنچانا ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

مرنا بامر نعمل بہ و ندعو الیہ من وراء نا[۲]

ایسی بات کا حکم دیں جس پر ہم بھی عمل کریں اور جو لوگ ہمارے پیچھے رہ گئے ہیں انہیں بھی اس کی دعوت دیں۔

---

۱ بخاری، کتاب الایمان، باب اداء الخمس من الایمان۔ مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللہ تعالیٰ الخ

۲ مسلم، کتاب الایمان۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وفد، خدمت اقدس میں مدینہ حاضر ہو کر اسلام لایا۔ طبقات ابن سعد: ۱/ ۳۱۴۔ لیکن اس وفد کا آپ کو 'اے اللہ کے رسول' کہہ کر خطاب کرنا یا یہ کہنا کہ راستہ میں کفار مضر کی وجہ سے ہم صرف اشھر حرم میں حاضر ہو سکتے ہیں، اسی طرح آپ کے اس سوال پر کہ کیا تم ایمان باللہ کا مطلب سمجھتے ہو؟ یہ جواب دینا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ لوگ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے =

رسول اللہ ﷺ نے وفد کو اللہ واحد پر ایمان لانے کا حکم دیا۔اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

أ تدرون ما الْایمان باللّٰه وحده کیا تم جانتے ہو اللہ واحد پر ایمان کا کیا
قالوا اللّٰه و رسولهٗ اعلم قال شهادة مطلب ہے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ اور

= فتح الباری: ۱/۹۸۔ اس کی تائید ایک واقعہ سے ہوتی ہے۔ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس قبیلہ کے ایک فرد منقذ بن حیان اپنی تجارت کے سلسلہ میں مدینہ آیا کرتے تھے۔ ہجرت کے بعد وہ سازوسامان کے ساتھ تجارت کے لیے مدینہ پہنچے۔ وہ بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ہوا۔ آپ کو دیکھ کر وہ کھڑے ہوگئے۔ آپ نے ان کی اور ان کے قبیلہ کے مختلف افراد کی نام بنام خیریت دریافت کی۔ وہ آپ سے متاثر ہوئے اور اسلام لے آئے۔ سورۃ فاتحہ اور سورۃ العلق یاد کی اور نماز پڑھنے لگے۔ جب وہ واپس جانے لگے تو آپ نے قبیلہ عبدالقیس کے بعض لوگوں کے نام ایک خط دیا۔انہوں نے وہاں پہنچنے کے بعد اس خط کو اپنے پاس ہی رکھا، لیکن کچھ دن بعد ان کی بیوی کو اس کا علم ہوگیا۔اس نے اپنے باپ منذر بن عائذ بن الحارث سے اس کا ذکر کیا اور بتایا کہ مدینہ سے واپسی کے بعد سے ان کے شوہر استنجا کرنے اور قبلہ رو ہو کر ایک نئی طرح کی عبادت کرنے لگے ہیں۔ پھر منذر اور ان کے درمیان بات چیت ہوئی۔منذر کے دل میں بھی اسلام اتر گیا۔ اس نے مضر اور محارب کے قبائل سے اس سلسلے میں گفتگو کی، آپ کے مکتوب کا ذکر کیا، انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔اس کے بعد ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ان کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جائے۔ نووی، شرح مسلم: ۱/۳۳۔ اس واقعہ کی تفصیلات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔حافظ ابن حجر نے اسے جس طرح نقل کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ منذر بن عائذ کو ایک راہب نے آنے والے پیغمبر کی خبر دی تھی اور ان کی علامات بتائی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد اس نے اپنے خواہرزادہ عمرو بن قیس کو مکہ بھیج کر معلومات حاصل کیں۔ جب عمرو بن قیس نے دیکھا کہ راہب کی بیان کردہ تمام علامات آپ کے اندر پائی جاتی ہیں تو وہ اسلام لے آئے اور واپس جا کر منذر بن عائذ کو بھی اس کی اطلاع دی تو انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا، لیکن اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا۔ بالآخر سن ۸ھ میں اپنے قبیلہ کے وفد کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۳/۳۳۰

ان لَا الٰه اِلّا اللّٰه و ان محمداً رسول اللّٰه[۱]

اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس کا مطلب ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحمَّدٌ رسولُ اللّٰهِ کی شہادت دینا۔

مطلب یہ کہ یہ بات ہر دم ذہن میں محفوظ رہنی چاہیے کہ ایمان باللہ، رسالت پر ایمان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ پھر ایمان بالقلب ہی کافی نہیں، اس کی شہادت دینا بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور رمضان میں روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ یہ بھی بتایا کہ انہیں مالِ غنیمت میں سے خمس بیت المال میں جمع کرنا ہوگا۔ انہیں ان برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا جن میں اس زمانہ میں شراب تیار ہوتی تھی۔[۲]

ظاہر ہے، ان تمام احکام کی تفصیل بھی بتائی گئی ہو گی۔ خود وفد کے ارکان بھی اپنے علم میں اضافہ کی کوشش کرتے رہے ہوں گے۔ چناں چہ وفد کے ایک رکن عبداللہ بن الاشج کے بارے میں صراحت سے آتا ہے:

کان عبد اللّٰه الأشج یسأل عن رسول اللّٰه عن الفقه و القرآن[۳]

عبداللہ الاشج رسول اللہ سے فقہ (احکام) اور قرآن کے بارے میں سوالات کرتے تھے۔

قبیلہ عبدالقیس کا یہ وفد جب واپس ہونے لگا تو آپ نے فرمایا:

احفظوهن و اخبروا بهن من ورائکم[۴]

ان باتوں کو اچھی طرح سے یاد کرلو اور جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں انہیں ان سے باخبر کرو۔

ایک روایت میں 'وابلغوهن من ورائکم' کے الفاظ بھی آتے ہیں[۵] مطلب یہ کہ دین کی ان باتوں کو اچھی طرح حفظ کرلو اور جو لوگ حاضر نہیں ہوسکے ہیں ان تک

---

۱ بخاری، کتاب الایمان، باب اداء الخمس من الایمان۔ مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللہ الخ

۲ بخاری ومسلم، حوالہ سابق۔ شراب کے برتنوں کے استعمال کی ممانعت ابتدائی دور میں تھی، تاکہ لوگوں کا ذہن شراب کی طرف سے بالکل ہٹ جائے، بعد میں اچھی طرح صاف کرکے ان کے استعمال کی اجازت دے دی گئی۔

۳ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۳۱۵

۴ بخاری ومسلم، کتاب الایمان۔ حوالہ سابق

۵ بخاری، کتاب التمنی

انہیں پہنچاؤ۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس سے مراد قبیلہ کے وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو مدینہ نہیں پہنچے تھے اور اس سے مراد اپنے بعد والے بھی ہو سکتے ہیں، یعنی دین کی ان تعلیمات کو اپنی آئندہ نسلوں تک منتقل کرو۔[1]

یہ وفد تیرہ، چودہ سواروں پر مشتمل تھا۔ بعض روایتوں میں ارکانِ وفد کی تعداد چالیس بتائی گئی ہے۔ ممکن ہے، نمایاں افراد سواریوں پر آئے ہوں اور باقی افراد پیادہ ہوں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس وفد کے صرف سات ارکان کے نام ملتے ہیں، لیکن حافظ ابن حجر نے وفد کے کافی افراد کے نام جمع کر دیے ہیں۔[2]

اس وفد نے دس روز مدینہ میں قیام کیا[3] اور دین کی تعلیم حاصل کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بہت بڑی جماعت ایسی تیار ہوگئی جو دین کی بنیادی تعلیمات اور اس کے ضروری مسائل سے واقف تھی۔ اس پوری جماعت کو تبلیغ و دعوت کے کام پر لگادیا گیا۔ یہ گو ایک خاص قبیلہ کا ذکر ہے، لیکن اس سے یہ قیاس کرنا دشوار نہیں ہے کہ اسلام لانے والے ہر وفد کو تبلیغ دین کی اسی طرح ہدایت دی جاتی رہی ہوگی۔ چناں چہ امام بخاری نے اس حدیث پر ایک جگہ یہی باب (عنوان) قائم کیا ہے۔

باب وصاة النبی ﷺ وفود العرب ان یبلغوا من ورائھم[4]	نبی ﷺ کی وفودِ عرب کو تاکید کہ وہ اپنے بعد والوں تک دین کی باتیں پہنچائیں۔

قبیلۂ عمرو بن سلمہ

۲- عمرو بن سلمہؓ کہتے ہیں کہ ہمارا قبیلہ جہاں آباد تھا وہ قافلوں کی گزرگاہ تھی۔ مختلف قبائل وہاں سے گزرتے تھے۔ ہم ان سے رسول اللہ ﷺ کے احوال دریافت

---

[1] فتح الباری: ۱/ ۱۰۶

[2] فتح الباری: ۱/ ۹۷

[3] طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۱۵

[4] بخاری، کتاب التمنی

کرتے تھے۔ وہ ہمیں آپ کے بارے میں بتاتے، جو وحی آپ پر نازل ہوتی اس کا ذکر کرتے۔ ان کی یہ باتیں میرے دل میں جاگزیں ہوجاتیں۔ میری یادداشت اچھی تھی۔ میں نے ان سے سن کر قرآن مجید یاد کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح اس کا کافی حصہ حفظ کرلیا۔ فتح مکہ کے بعد عرب کے مختلف قبائل اسلام میں داخل ہونے لگے تو میرے والد بھی مدینہ پہنچے، تاکہ اپنی قوم کے اسلام لانے کی اطلاع دیں۔ ابن سعد میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا، میرے والد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مقیم رہے۔ جب واپس ہوئے تو ہم نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے کہا: خدا کی قسم، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے آرہا ہوں۔ پھر انہوں نے بتایا کہ آپ نے فلاں فلاں بات کا حکم دیا ہے اور ان امور سے منع فرمایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کون سی نماز کس وقت پڑھی جائے۔[۱] عمرو بن سلمہ کے والد کے ساتھ ایک پورا وفد تھا۔ چنانچہ ابوداؤد کی روایت ہے:

انطلق ابی وافدا الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فی نفر من قومه فعلّمهم الصلوة[۲]	میرے باپ اپنی قوم کی ایک جماعت کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں روانہ ہوئے۔ آپ نے ان سب کو نماز کی تعلیم دی۔

نماز کی تعلیم کا ذکر انہوں نے ایک خاص سیاق میں کیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ دیگر امور دین بھی انہوں نے لازماً سیکھے ہوں گی۔ چناں چہ ایک اور روایت میں ہے:

تعلّموا القراٰن و قضوا حوائجهم[۳]	وفد کے لوگوں نے قرآن مجید سیکھا اور اپنی ضروریات پوری کیں

رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ کو اپنے علاقہ میں مراجعت کے بعد باقاعدہ جماعت

---

۱ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۳۳۶

۲ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالامامۃ

۳ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۳۳۶

کے ساتھ نماز قائم کرنے کا حکم دیا۔ امامت کے بارے میں فرمایا:

اذا حضرت الصلوٰۃ فلیؤذن احدکم و لیؤمکم اکثر کم قراٰنا	جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک آدمی اذان دے اور تم میں سے جس شخص کو قرآن زیادہ یاد ہو وہ تمہاری امامت کرے۔

حضرت عمرو بن سلمہؓ فرماتے ہیں کہ جب لوگوں نے دیکھا کہ قرآن مجھے سب سے زیادہ حفظ ہے، اس لیے کہ آپ کی خدمت میں رہ کر لوٹنے والے قافلوں سے سن کر میں قرآن حفظ کر رہا تھا، تو انہوں نے مجھے امامت کے لیے آگے بڑھا دیا۔ اس وقت میری عمر سات آٹھ سال کی تھی[۱]

وفدِ بنولیث

۳۔ تبوک کی تیاری جاری تھی کہ بنولیث بن بکر بن عبدمناف بن کنانہ کا وفد مدینہ منورہ پہنچا[۲] اس میں حضرت مالک بن حویرث بھی تھے۔ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیس دن رہے۔ آپ بڑے رحیم اور رقیق القلب تھے۔ جب آپ نے محسوس فرمایا کہ ہمیں بیوی بچوں کی یاد آنے لگی ہے اور ہم واپس ہونا چاہتے ہیں تو ارشاد فرمایا:

ارجعوا الی اھلیکم فاقیموا فیھم و علّموھم و مروھم و صلوا کما رأیتمونی اصلّی فاذا حضرت الصلوٰۃ فلیؤذن لکم احدکم و لیؤمکم اکبر کم[۳]	اپنے بیوی بچوں میں واپس جاؤ، ان کے درمیان قیام کرو اور انہیں (دین) کی تعلیم دو اور (اس کی پابندی کا) انہیں حکم دو، نماز اس طرح پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک آدمی اذان دے اور جو تم میں سب سے بڑا ہو وہ تمہاری امامت کرے۔

۱؎ پورا واقعہ بخاری میں ہے۔ کتاب المغازی، باب بغیر عنوان۔ بعض تفصیلات اور کتابوں سے لی گئی ہیں۔ ان کا موقع پر حوالہ دیا گیا ہے۔

۲؎ طبقات ابن سعد: ۱/ ۳۰۵۔ فتح الباری: ۲/ ۷۵

۳؎ بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافرین۔ مسلم، کتاب المساجد، باب من احق بالامامۃ۔ =

یہ درحقیقت گھر اور خاندان والوں کی تعلیم و تربیت اور نماز با جماعت کی تاکید اور اس کے آداب کا بیان ہے۔

ضمام بن ثعلبہ - قبیلۂ بنو سعد کے نمائندہ

۴- سن ۹ھ میں بنو سعد بن بکر نے ضمام بن ثعلبہ کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا۔[1] وہ مدینہ آئے۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے درمیان تشریف فرما تھے۔ انہوں نے دریافت کیا، ان میں ابن عبدالمطلب کون ہیں؟ صحابہ نے آپ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ خوب صورت ہستی، جو ٹیک لگائے تشریف فرما ہیں، یہی ابن عبدالمطلب ہیں۔ انہوں نے آپ سے عرض کیا: میں آپ سے کچھ سوالات کروں گا۔ میرے انداز میں درشتی ہوگی۔ آپ برا نہ مانیں۔ آپ نے فرمایا: میں برا نہیں مانوں گا۔ جو تمہارا جی چاہے، سوال کرو۔ انہوں نے کہا: آپ کے سفیر (مبلغ) نے ہم سے کہا ہے

= نماز کی امامت میں عمر سے زیادہ علم کی اہمیت ہے۔ یعنی علم والے کو زیادہ عمر والے پر ترجیح حاصل ہوگی۔ لیکن یہاں آپ نے بڑی عمر والے کو امام بنانے کا اس لیے حکم دیا تھا کہ یہ سب لوگ تقریباً ایک ہی عمر کے نوجوان تھے۔ چناں چہ اسی حدیث میں آتا ہے۔ نحن شببة متقاربون (ہم تقریباً ہم عمر نوجوان تھے) مدینہ میں انہیں قیام کا موقع بھی مساوی ملا تھا، اس لیے علمی لحاظ سے بھی وہ برابر تھے: و کنا یومئذ متقاربین فی العلم (ہم سب علم میں قریب قریب یکساں تھے)۔ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالامامۃ۔ ظاہر ہے اس صورت میں عمر کو ترجیح حاصل ہوگی۔

[1] اسے سن ۷ھ کا بھی واقعہ بتایا گیا ہے (الاستیعاب: ۲/ ۳۰۴) حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت ہے کہ یہ رجب سن ۵ھ کا واقعہ ہے۔ (طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۹۹) لیکن حضرت ابن عباسؓ ہی کی ایک دوسری روایت سے، جو بخاری وغیرہ میں ہے، اس کی تردید ہوجاتی ہے۔ اسے وہ مدینہ میں اپنے سامنے کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ فتح مکہ کے بعد مدینہ آئے تھے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ ضمام بن ثعلبہ کی آمد سن ۹ھ میں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ بنو سعد غزوہ حنین کے بعد اسلام لائے اور غزوہ حنین شوال ۸ھ میں ہوا تھا۔ سن ۹ھ ہی میں دوسرے وفود بھی بکثرت آئے۔ فتح الباری: ۱/ ۱۱۳۔ نیز الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۳/ ۳۹۶۔

کہ آپ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا: سفیر نے سچ کہا۔ انہوں نے پوچھا: کس نے یہ آسمان پیدا کیا؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے پیدا کیا۔ انہوں نے سوال کیا: یہ زمین کس نے پیدا کی؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے پیدا کی۔ انہوں نے پوچھا: کس نے زمین میں پہاڑ نصب کیے اور اس میں پائی جانے والی چیزیں پیدا کیں؟ آپ نے فرمایا: یہ ساری چیزیں اللہ نے پیدا کیں۔ انہوں نے کہا: اس خدا کی قسم دے کر آپ سے پوچھتا ہوں جس نے آسمان و زمین پیدا کیے اور پہاڑ کھڑے کیے، کیا اسی نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے اپنا رسول بنا کر مبعوث فرمایا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اسی نے مجھے اپنے رسول کی حیثیت سے بھیجا ہے۔ انہوں نے اسی طرح قسم دے دے کر نماز، روزہ، زکوٰۃ، اس کے مصارف، حج اور دیگر احکام شریعت کے بارے میں سوالات کیے۔ آپ نے ان سب کا اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے یہ کہہ کر کہ میں ان سب باتوں پر ایمان لاتا ہوں شہادتین کا اقرار کیا اور کہا کہ جو فرائض آپ نے بتائے ہیں میں انہیں ادا کروں گا اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سے اجتناب کروں گا۔ نہ تو اس سے زیادہ کچھ کروں گا اور نہ اس میں کمی ہوگی۔ پھر انہوں نے قبیلہ میں واپسی کے بعد سب سے پہلے لات وعزیٰ کی مذمت کی (کہ یہ حمد و ستائش کے مستحق نہیں ہیں)۔ قبیلہ والوں نے ڈرایا کہ دیکھو اس حرکت کی وجہ سے کہیں تم برص، جذام یا جنون میں نہ مبتلا ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا تمہارا برا ہو، لات وعزیٰ میں نفع وضرر کی بالکل طاقت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بھیجا ہے۔ اس پر اپنی کتاب نازل کی ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ اس نے تمہیں ان خرافات سے نجات دے دی ہے۔ میں تو اللہ واحد اور آپ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں۔ جن باتوں کا علم میں نے آپ سے حاصل کیا ہے ان کی تعلیم دے رہا ہوں۔ ان کی تذکیر وتبلیغ سے قبیلہ کے تمام مرد اور عورت اسلام لے آئے۔ مساجد کی تعمیر ہوگئی، اذان اور نماز ہونے لگی[1]

---

[1] اس واقعہ کی کم و بیش تفصیلات حدیث اور تاریخ کی متعدد کتابوں میں ملتی ہیں۔ ملاحظہ ہو بخاری، کتاب العلم، باب القراءۃ والعرض علی الحدیث۔ مسلم، کتاب الایمان، باب السؤال عن =

قیس بن نشبہ - نمائندہ بنو سلیم

۵- قبیلۂ بنو سلیم میں ایک صاحب قیس بن نشبہ تھے[۱] وہ دور جاہلیت میں عبادت و ریاضت میں لگے رہتے تھے اور سابق آسمانی صحیفوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا علم ہوا تو غزوہ خندق کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا: میں اپنی قوم کا نمائندہ اور سفیر ہوں۔ وہ میری بات مانتی اور اطاعت کرتی ہے۔ میں آپ سے بعض وہ سوالات کروں گا جن کا وہی شخص جواب دے سکتا ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہو۔ انہوں نے سات آسمانوں، فرشتوں اور ان کی غذا جیسے غیبی امور کے بارے میں سوالات کیے۔ آپ نے ان کے جوابات دیے اور اسلامی تعلیمات ان کے سامنے پیش کیں۔ جب اوامر و نواہی کو انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تو اسلام لے آئے اور وعدہ کیا کہ میری قوم کے ایک ہزار گھڑ سوار حاضرِ خدمت ہوں گے۔ اس کے بعد اپنی قوم میں واپس پہنچ کر انہوں نے کہا: اے بنو سلیم! میں نے روم اور فارس کی باتیں سنی ہیں، اشعار عرب سے واقف ہوں، حمیر کی زبان دانی دیکھی ہے۔ محمد ﷺ کا کلام ان سب سے مختلف ہے۔ لہٰذا ان کی اطاعت کرو (وہ کوئی غیر نہیں) تمہارا ننہیالی رشتہ بھی ان سے ہے۔ اگر وہ کام یاب ہوئے تو تم فائدے میں رہو گے اور تمہاری قسمت اچھی ہوگی، اگر وہ کام یاب نہ ہوں تو عرب تمہارے خلاف اقدام کی ہمت نہیں کر سکتے۔ میں نے جس وقت ان سے ملاقات کی تو ان کے معاملہ میں میرا دل پتھر سے زیادہ سخت تھا، لیکن ان کی بات چیت اور کلام سے وہ آہستہ آہستہ نرم پڑ گیا۔ میری بات مانو اور اس دین میں قسمت نے جو تمہارا حصہ رکھا ہے اسے حاصل کر لو۔

= ارکان الاسلام۔ مسلم میں ضمام بن ثعلبہ کے نام کی صراحت نہیں ہے 'رجل من اہل البادیۃ' (دیہات کا ایک شخص) کہا گیا ہے۔ مسند احمد: ۳/۔ سیرت ابن ہشام: ۴/۲۲۸-۲۲۹۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۹۱۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۲/۳۰۴-۳۰۴

[۱] ابن سعد نے قیس بن نُسیبہ بتایا ہے۔ الطبقات الکبریٰ: ۱/۳۰۷۔ لیکن ابن کثیر (السیر ۃ النبویۃ: ۴/۷٦) اور حافظ ابن حجر (الاصابۃ: ۳/۲٦۰) نے قیس بن نشبہ لکھا ہے۔

رسول اللہ ﷺ انہیں حِبر ' (عالم) فرماتے تھے۔ ان کی تبلیغ کا یہ نتیجہ نکلا کہ سن ۸ھ میں بنوسلیم کے نو سو اور بعد میں ایک ہزار افراد نے قدید میں آپ سے ملاقات کی اور فتح مکہ، طائف اور حنین میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان غزوات میں ان کا الگ جھنڈا اور الگ شعار بھی رکھا تھا[1]

قبیلہ جہینہ کے نمائندے

۶- عمرو بن مرہ الجہنی کہتے ہیں کہ ہمارے قبیلہ جہنیہ کا ایک بت تھا، جس کی ہم سب تعظیم کرتے تھے۔ میں اس کا مجاور اور خادم تھا۔ جب مجھے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر ملی تو میں نے یہ بت توڑ پھینکا، آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اسلام لایا اور حق کی گواہی دی، جو کچھ بھی آپ نے اللہ کی طرف سے حرام و حلال کی تفصیل بتائی اس کی تصدیق کی اور اسے تسلیم کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنی قوم میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا۔ ان کی کوشش کے نتیجہ میں پوری قوم اسلام لے آئی۔ صرف ایک شخص نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ عمرہ بن مرہ نے اس کے حق میں بددعا کی تو اسے لقوہ ہوگیا، وہ بول نہیں پاتا تھا، بینائی ختم ہوگئی تھی، احتیاج کی زندگی اس نے گزاری[2]

---

[1] ایک روایت میں ان کی تعداد سات سو بتائی گئی ہے۔ ابن سعد میں ہے کہ یہ نو سو کی تعداد میں تھے۔ جب انہوں نے ملاقات کی تو آپ نے قیس بن نشبہ کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ خوب صورت، خوش کلام اور صادق الایمان کہاں ہے؟ ان لوگوں نے عرض کیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ آپ نے فرمایا: انہوں نے ایک ہزار افراد کے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے اور بنوکنانہ کے درمیان جنگ کے خطرہ کی وجہ سے ایک سو افراد وہیں رہ گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اللہ نے چاہا تو اس سال اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ چناں چہ بعد میں وہ لوگ بھی آگئے اور سب کے سب فتح مکہ، طائف اور حنین میں شریک ہوئے۔

بنوسلیم کے واقعہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۳۰۷-۳۰۹۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۴/ ۱۷۶-۱۷۷۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۵/ ۳۸۱-۳۸۲

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۳۳۳-۳۳۴۔ حافظ ابن حجر نے اس واقعہ کا حوالہ دیا ہے اور ان کے مزید حالات بیان کیے ہیں۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۴/ ۵۶۲-۵۶۴

وفدِ بنو کلاب

۷-ضحاک بن سفیان کی کوشش سے بنوکلاب کا پورا قبیلہ اسلام لے آیا۔ سن ۹ھ میں اس کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اسلام کے طریقہ کے مطابق سلام کیا اور اپنے اسلام لانے کی اطلاع دیتے ہوئے عرض کیا کہ ضحاک بن سفیان نے ہمارے درمیان کتاب اللہ اور آپ کی بتائی ہوئی سنت کے مطابق عمل کیا اور آپ کی رسالت پر ایمان لانے کی ہمیں دعوت دی، ہم نے اسے قبول کر لیا، انہوں نے ہمارے اغنیا سے صدقات وصول کیے اور ہمارے فقرا پر تقسیم کیے۔[1]

وفدِ قبیلۂ صداء

۸-سن ۸ھ میں رسول اللہ ﷺ نے قیس بن سعد بن عبادہ کو قبیلۂ صداء کی سرکوبی کا حکم دیا۔ وہ چار سو افراد کا لشکر لے کر روانہ ہوئے اور قریب ہی ایک مقام پر خیمہ زن ہو گئے۔ قبیلہ صداء کو اس کی اطلاع ملی تو اس کا نمائندہ خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ لشکر کو واپس بلا لیں۔ میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ میری قوم آپ کا ساتھ دے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے لشکر کو واپسی کا حکم دیا۔ اس کے بعد اس قبیلہ کے پندرہ افراد نے خدمت میں حاضری دی، اسلام قبول کیا اور بیعت کر کے واپس ہوئے۔ ان کے ذریعہ قبیلہ میں اسلام پھیلا اور حجۃ الوداع میں اس کے سو افراد نے آپ سے نیاز حاصل کیا۔[2]

رسول اللہ ﷺ کے دربار میں عرب کے مختلف علاقوں کے وفود آئے۔ اسلام کو سمجھا اور قرآن و سنت کی تعلیم حاصل کی۔ یہ وفود ان علاقوں میں اسلام کی اشاعت کا سبب بنے۔ ان کے ذریعہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کا نور پھیلا اور بہت جلد عرب ساری دنیا کے امام اور قائد بن گئے۔

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۱۹۸۸ء)

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۳۰۰۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۴/ ۱۷۳

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۳۲۶-۳۲۷۔ ابن عبدالبر: الاستیعاب: ۲/ ۱۰۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ السیرۃ النبویۃ: ۴/ ۱۶۱-۱۶۳۔

علمی احسانات

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ﴿۲﴾ (الجمعۃ:۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اُمّیوں (ناخواندہ قوم) میں ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو انہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالاں کہ وہ اس سے قبل صریح گم راہی میں پڑے ہوئے تھے۔

محمد عربی ﷺ

کے دنیائے علم پر عظیم احسانات

- کتاب وسنت اساسِ دین ہیں
- علم وحکمت کا کوئی بدل نہیں
- فروغِ علم کے اقدامات
- اصحابِ صفہ (تعلیمی اور معاشی جائزہ)

کتاب وسنت اساسِ دین ہیں

سوال:

عام طور پر مقررین اور واعظین اپنے خطبوں میں ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

''میں تمہارے درمیان دو چیزوں کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب، دوسری میری سنت۔ جب تک ان دونوں کو پکڑے رہوگے، گم راہ نہ ہو گے۔ میرے مطالعہ میں جو حدیث گزری ہے اس میں صرف ایک چیز کا ذکر ہے اور وہ ہے اللہ کی کتاب۔ براہ کرم واضح فرمائیں کہ دوسری چیز 'سنت' کا اضافہ کس حدیث میں آیا ہے؟''

جواب:

کتب حدیث میں خطبۂ حجۃ الوداع کی جو تفصیلات مروی ہیں ان میں ابوداؤد کی روایت میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

انی قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ، کتاب اللّٰہ[1]

قریب قریب یہی الفاظ ابن ماجہ کے بھی ہیں۔[2]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے تمہارے درمیان اللہ کی کتاب چھوڑی ہے۔ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو گم راہ نہ ہوگے۔ لیکن بعض روایتوں میں اللہ کی کتاب کے ساتھ سنت رسول اللہ کا بھی ذکر ہے۔ حاکم نے حضرت ابوہریرۃؓ سے

---

[1] ابوداؤد، کتاب المناسک، باب صفۃ حجۃ النبیؐ

[2] ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب حجۃ رسول اللہ ﷺ

خطبۂ حجۃ الوداع ہی کے ذیل میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعد هما کتاب الله و سنّتی و لن یتفرّقا حتّٰی یردا علٰی الحوض[۱]

میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ ان کے بعد تم ہرگز گم راہ نہ ہو گے۔ وہ دو چیزیں ہیں اللہ کی کتاب اور میری سنت۔ یہ دونوں جدا نہ ہوں گی، یہاں تک کہ وہ حوض کوثر پر آئیں گی۔

اس مفہوم کی روایت مؤطا امام مالک میں بھی موجود ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب الله و سنة نبیه[۲]

میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے راہِ راست سے نہ بھٹکو گے۔ وہ ہیں اللہ کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سنت۔

اس سے قرآن مجید کے ساتھ حدیث اور سنت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ یہ دین کے دو بنیادی مآخذ ہیں۔ یہ ہدایت کے وہ سرچشمے ہیں جن سے قیامت تک رہ نمائی حاصل کی جاتی رہے گی اور اختلافات میں رجوع کیا جاتا رہے گا۔ اگر حدیث صحت کے ساتھ ثابت ہو جائے تو قرآن کے بعد اسی کا مقام ہوگا اور اسی پر اعتماد کیا جائے گا۔

یہ موضوع بعض پہلوؤں سے خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے، اس لیے اس کی مزید تھوڑی سی وضاحت مناسب ہوگی۔

دین کے معاملے میں ارشاداتِ رسول ﷺ حجت ہیں

بعض احادیث میں اس بات پر سخت تنقید کی گئی ہے کہ آدمی دین کے معاملہ میں صرف قرآن مجید کو حجت سمجھے اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کو نظر انداز کردے۔

حضرت ابورافعؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَا الفین احدکم متکئا علی — ایسا ہرگز نہ ہو کہ میں تم سے کسی کو اس حال

---

[۱] مناوی، التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۱/ ۴۴۷

[۲] موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب النھی عن القول بالقدر

اریکته یأتیه الْامر من امری مما امرت به او نهیت عنه فیقول لَا ادری ما وجدنا فی کتَاب اللّٰه اتبعناه۔[1]

میں دیکھوں کہ وہ اپنے تخت پر ٹیک لگائے بیٹھا ہے (عیش وعشرت کی زندگی گزار رہا ہے)۔ اس کے پاس میں نے جن امور کا حکم دیا ہے ان میں سے کوئی حکم آئے یا جن چیزوں سے منع کیا ہے ان میں سے کسی چیز کا ذکر ہو اور وہ اس کے جواب میں کہے کہ میں یہ نہیں جانتا ہم تو اس پر عمل کرتے ہیں جو کتاب اللہ میں موجود ہے۔

اسی مفہوم کی ایک اور حدیث حضرت مقدام بن معدی کربؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

الَا انی اوتیت القرآن و مثله معه الَا یوشک رجل شبعان علی اریکته یقول: علیکم بهٰذا القراٰن مما وجدتم فیه من حلال فاحلوه و ما وجدتم فیه من حرام فحرموه و ان ما حرم رسول اللّٰه کما حرم اللّٰه.[2]

سن لو! مجھے (اللہ کی طرف سے) قرآن اور اس کے ساتھ اس جیسی چیز (سنت) دی گئی ہے۔ سن رکھو! قریب ہے کہ کوئی آسودہ حال شخص اپنے تخت پر بیٹھ کر (آسائش کی زندگی گزارتے ہوئے) کہے کہ اس قرآن کو پکڑے رہو اس میں جو حلال ہے اسے حلال سمجھو اور اس میں جن چیزوں کو حرام دیکھو اسے حرام سمجھو۔ لیکن یاد رکھو، اللہ کے رسولؐ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ بھی اللہ کی حرام کردہ چیزوں کی طرح حرام ہیں۔

ان احادیث سے ثابت ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ آپ کی سنت یا آپ کی تعلیمات بھی دین کی اساس ہیں۔ دونوں کے ذریعے دین کی تکمیل ہوتی ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی۔

[2] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ ابوداؤد، دارمی، ابن ماجہ۔ ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ اسی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے بعض ان ممنوعات کا ذکر فرمایا جن کے بارے میں قرآن خاموش ہے اور جو آپ کی شریعت کے لازمی احکام ہیں۔

احکامِ نبویؐ شریعت کا لازمی جز ہیں

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ اس کے رسول کی اطاعت کو بھی لازم قرار دیا ہے۔ اس میں کوتاہی سے انسان کے تمام اعمالِ خیر بے نتیجہ ہوسکتے ہیں:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴿٣٣﴾ (محمد:۳۳)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔

ارشاد ہے کہ اللہ کے رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿٨٠﴾ (النساء:۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو اس سے روگردانی کرے تو ہم نے ایسے لوگوں پر آپ کو نگراں بنا کر نہیں بھیجا ہے۔

ایک موقع پر فے (غنیمت) کی تقسیم کے ذیل میں اصولی بات یہ کہی گئی:

وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٧﴾ (الحشر:۷)

رسول تمہیں جو دے اسے لے لو اور جس سے منع کردے اس سے باز رہو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ بے شک اللہ کا عذاب سخت ہوتا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے صراحت کی ہے کہ اس کے پس منظر میں تو مالِ غنیمت کی تقسیم کا ذکر ہے، لیکن اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہے کہ آپ کے تمام احکام کو دل و جان سے قبول کیا جائے۔ اس لیے کہ ان کی حیثیت دراصل اللہ کے احکام کی ہے۔ اس میں آپ کے تمام اوامر و نواہی داخل ہیں۔ چناں چہ صحابہ کرامؓ نے آیت کے اس عموم میں آپ کے ان احکام کو شریعت کا لازمی جز قرار دیا ہے جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے اور جو صرف سنت سے ثابت ہیں۔[1]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، قرطبی، جلد ۹، جزء ۲۸، ص ۱۳، ۱۴

علم و حکمت کا کوئی بدل نہیں

رسول اللہ ﷺ کا دنیا پر احسان ہے کہ آپ نے اسے جہالت سے نکالا اور علم کی روشنی عطا کی۔ آپ نے علم کی اہمیت ہی واضح نہیں کی، بلکہ اسے دینی رخ عطا کیا، اس کی فضیلت بیان کی، اس کی ترغیب و تشویق دی اور اس کو فلاح دارین کا ذریعہ قرار دیا۔ اگر علم کو دینی رخ نہ ملے تو آدمی خدائی ہدایت سے محروم ہوتا اور ضلالت میں بھٹکتا رہتا ہے۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کے بعض ارشادات پیش کیے جا رہے ہیں، جن سے علمِ دین کی اہمیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ یہ ارشادات مشکوٰۃ المصابیح کی کتاب العلم سے لیے گئے ہیں۔ بعض حوالے براہ راست اصل مآخذ سے بھی دیے گئے ہیں۔

فہمِ دین ۔ عطیۂ الٰہی

عن معاویة قال: قال رسول الله ﷺ من یرد الله به خیراً یفقهه فی الدین و انما انا قاسم و الله یعطی[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جس کسی کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں بصیرت عطا کرتا ہے اور میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں، دینے والا اللہ ہے۔

یہ حدیث واضح طور پر بتاتی ہے کہ اللہ جب کسی کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنا چاہتا ہے تو اسے فہمِ دین سے نوازتا ہے۔ لفظ 'خیر' عربی میں عموماً دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنیٰ ہیں مال و دولت اور جایداد۔ اس کا ثبوت قرآن مجید کی اس

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین۔ مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب النہی عن المسئلۃ۔

آیت میں ملتا ہے:

وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ (العٰدیٰت:۸) — اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔

'خیر' کا دوسرا مفہوم بھلائی اور سعادت ہے۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کریمہ اس مفہوم کو واضح کرتی ہے:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ:۲۶۹) — اور جسے حکمت عطا ہوئی درحقیقت اسے 'خیرِ کثیر' عطا کیا گیا۔

اس حدیث میں خیر کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دوسرا لفظ، جس کی یہاں اہمیت ہے، وہ ہے تفقہ فی الدین ۔ اس کے معنیٰ ہیں فہمِ دین اور دینی امور میں فراست اور بصیرت۔ قرآن و احادیث کی معنویت کو سمجھنا، ان کی گہرائی میں اترنا، دین و شریعت کے احکام کے علل و اسباب اور ان کے منشا سے ٹھیک ٹھیک واقفیت، حالات پر ان کا انطباق اور قرآن و حدیث سے صحیح اخذ و استنباط تفقہ فی الدین ہے ۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی رحمتِ خاص سے نوازنا چاہتا اور اس پر نیکی اور بھلائی کے دروازے کھولنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین کے معاملے میں باریک بینی، سوجھ بوجھ اور قرآن و سنت کے احکام کو حالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو علم کے ساتھ فہم اور فقہ و بصیرت سے بھی نوازتا ہے۔ اس میدان میں جو ان کے وارث ہوتے ہیں انہیں بھی اللہ تعالیٰ حسبِ توفیق اس کا ایک حصہ عطا کرتا ہے۔ ان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ قرآن کی حکمتوں اور باریکیوں سے واقف ہوں اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے معانی و مطالب کی تہہ تک پہنچ کر حالات پر انہیں منطبق کرسکیں۔

اسلامی تاریخ میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جیسی شخصیات کی اہمیت یوں ہی نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان ہستیوں نے دین کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا، برسہا برس حصولِ علم، غور و فکر اور تدبر میں

لگے رہے، اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں تفقّہ فی الدین اور فہم و بصیرت کی عظیم نعمت سے نوازا۔ فقیہ وہ ہے جو حالات کے مطابق اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا انطباق کر سکتا ہو۔

اس حدیث میں دوسری بات جو کہی گئی ہے وہ بھی بہت اہم ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تو محض اس خیر کا اور اس بھلائی کا تقسیم کرنے والا ہوں جو اللہ نے مجھے دیا ہے۔ ذرا غور فرمایئے، ان الفاظ میں کس قدر بے نفسی اور خاک ساری کا اظہار ہے۔ ہمارا اور آپ کا یقین ہے کہ بنی نوع آدم میں سب سے زیادہ تفقہ فی الدین رسول اللہ ﷺ ہی کو حاصل تھا۔ آپ کی ہم سری کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا، چہ جائے کہ آپ سے آگے بڑھنے کا خیال اس کے ذہن میں آئے۔لیکن رسول اللہ ﷺ کو اپنی اس عظمت پر، اپنی اس حکمت پر، اس فہم دین پر کوئی غرّہ نہیں ہے، بلکہ آپ صاف طور پر اظہار فرماتے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ یہ علم و فہم میرا اپنا کمال نہیں ہے، بلکہ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اور اسی کی عطا و بخشش کو میں اس کے بندوں تک منتقل کر رہا ہوں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ علم و فہم دونوں ایسے سرمایے ہیں جن کے حاصل ہونے پر استکبار، غرور و پندار میں آدمی کے مبتلا ہونے کا سخت اندیشہ رہتا ہے۔ شیطان بھی علم دین حاصل کرنے والے کو ہر طریقے سے، ہر جہت سے اور ہر پہلو سے شکست دینے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ لیکن اس وقت وہ مایوس ہو جاتا ہے جب طالب علم شیطان کی وسوسہ اندازیوں کو نظر انداز کر کے اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ اب آخری تیر جو شیطان کے ترکش میں رہ جاتا ہے وہ ہے ریا اور استکبار۔ عالم یا فقیہ مارے گئے اگر انھوں نے اپنے کھلے ہوئے دشمن کے اس تیر کا ہدف بننے سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھا، کیوں کہ کوئی اگر فقیہ ہے تو یہ اس پر اللہ کی رحمت اور اس کی نوازش ہے۔ اسی نے اس کو دینی بصیرت عطا کی ہے۔ اس نے دیا ہے تو اس کو کسی بھی وقت سلب بھی کر سکتا ہے۔ غرور اس چیز پر کیوں ہو جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہو اور جس کے ہمیشہ باقی رکھنے پر وہ قادر نہ ہو۔

قابلِ رشک افراد

عن ابن مسعود قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم لاحسد الّا فی اثنتین رجل اٰتاہ اللّٰہ مالاً فسلّطہ علی ھلکتہ فی الحق و رجل اٰتاہ الحکمۃ فھو یقضی بھا و یعلّمھا[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قابلِ رشک صرف دو خوبیاں ہیں ۔ایک یہ کہ اللہ نے کسی کو مال و دولت سے نوازا ہو اور وہ اسے حق کی راہ میں صرف کرتا ہو۔دوسری خوبی یہ ہے کہ آدمی کو اللہ نے حکمت عطا کی ہو اور وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہو۔

حدیث میں لفظ 'حسد' آیا ہے۔ یہ ہماری زبان میں جلن کے معنی میں مروّج ہے، لیکن ظاہر ہے، یہاں اس کا یہ مفہوم نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد رشک ہے۔ حسد اور رشک میں فرق ہے۔ حسد میں یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ فلاں شخص کی خوبی ضائع ہو جائے۔ اس کیفیت میں محسود کو نقصان پہنچانے کا پہلو ہی غالب رہتا ہے۔ لیکن رشک میں نقصان پہنچانے یا برا چاہنے کا کوئی پہلو نہیں ہوتا، بلکہ خواہش یہ ہوتی ہے کہ فلاں شخص کی فلاں خوبی میرے اندر بھی پیدا ہو جائے۔ حسد کو دین میں گناہ اور فسق کہا گیا ہے اور رشک مطلوب اور پسندیدہ شئے ہے۔ صحابہؓ، تابعینؒ، ائمہ کرام اور بزرگانِ دین رشک ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ باقاعدہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ! مجھے فلاں شخص کی خوبیاں عطا کر دے۔ اسی پسندیدہ اور مطلوب جذبے کی تائید اس حدیث میں کی گئی ہے۔ فرمایا گیا کہ قابل رشک ہی نہیں، بلکہ انتہائی قابل رشک (کیوں کہ قابلِ رشک تو ساری خوبیاں ہیں) دو خوبیاں ہیں: ایک یہ کہ اللہ نے کسی کو مالِ کثیر عطا کیا ہو اور وہ حق کی راہ میں، جہاد میں، غریبوں، محتاجوں، یتیموں، بیواؤں اور ہر جائز مستحق پر اس کو بے دریغ لٹاتا ہو، اس کے دل میں مال کی محبت جاگزیں نہ ہو، بلکہ دین کی جب اور جہاں کوئی ضروت پیش آئے اس کے خزانوں کے منھ کھل جائیں۔ وہ صرف واجبات

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ۔ مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھا، باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمہ الخ

ہی کی ادائی اپنے مال سے نہ کرتا ہو، بلکہ اس سے ہٹ کر بھی ہر کارِ خیر میں اپنا مال لٹانے پر ہر آن آمادہ ہو۔ اگر زکوٰۃ کی ادائی کوئی شخص پورے اہتمام کے ساتھ کرتا ہے تو یہ کوئی رشک کی بات نہیں ہے، رشک کی بات تو یہ ہے کہ اس کے علاوہ خرچ کرتا ہو اور بے پناہ خرچ کرتا ہو۔قرآن مجید نے اس طرح انفاق کرنے والوں کی تعریف کی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بے خوف اور غم سے پاک زندگی کا وعدہ فرمایا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرۃ: ۲۷۴)	جو لوگ اپنے اموال شب و روز خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے ان کو نہ تو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

قرآن وحدیث میں حق کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت کا ذکر ہے۔ یہاں وہ فضول خرچیاں مراد نہیں ہیں جو شادی بیاہ اور ختنہ جیسے مواقع پر اپنی ساکھ اور شان و شوکت کے مظاہرے کے لیے کی جاتی ہیں، مال کا یہ مصرف معصیت اور گناہ میں داخل ہے۔ دوسرا شخص، جس پر رشک کرنا چاہیے، وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ حکمت کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرتا اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔لوگوں کے معاملات کا صحیح فیصلہ وہی کرسکتا ہے جسے اللہ نے حکمت سے نوازا ہو، جسے دین میں درک حاصل ہو، جس کی قرآن و سنت کی گہرائیوں پر نظر ہو اور جو اللہ اور رسول کے احکام اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کو جانتا ہو۔ احادیث میں عدل و انصاف کرنے والوں کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز سات قسم کے لوگ عرش کے سایے میں ہوں گے۔ ان میں ایک امام عادل بھی ہوگا،یعنی وہ امیر یا قائد یا حاکمِ وقت جو عدل کرتا ہو۔ عدل وہی کرسکتا ہے جو دین کا علم وفہم رکھتا ہو، اور اسے دوسروں تک کمال درجہ حکمت اور بصیرت کے ساتھ منتقل کرتا ہو۔ ایک ہے علم سکھانا اور دوسرا ہے علم کو حکمت کے ساتھ پیش کرنا۔ یہی دوسری صفت آدمی کو قابلِ رشک بناتی ہے۔ وہ صرف علم کو اس کی تفصیلات کے ساتھ بتاتا ہی نہیں ، بلکہ اس کی باریکیوں اور مصلحتوں کو بھی سکھاتا اور سمجھاتا ہے۔

جنت میں بلند مرتبہ حاصل کرنے والا

عن الحسن مرسلاً قال: قال رسول اللہ ﷺ من جاءہُ الموت و ھو یطلب العلم لیحیِ بہٖ الاسلام فبینہ و بین النبیین درجۃً واحدۃً فی الجنۃ[1]

حضرت حسن بصری سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو موت اس حالت میں آئے کہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کے لیے علم حاصل کر رہا تھا تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجے کا فرق ہوگا۔

کتنی قابلِ رشک ہے وہ موت جو علم دین حاصل کرنے کی راہ میں آئے۔ یہاں محض علم دین حاصل کرنے کی فضیلت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس علمِ دین کی فضیلت کا بیان ہے جو اس لیے حاصل کیا جائے کہ اس کے ذریعے سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرنی ہے۔آج بے شمار لوگ پڑھ تو رہے ہیں۔ دینی مدارس ان سے زندہ ہیں، لیکن انہیں اپنے مقصد کا شعور تک نہیں ہے اور فراغت کے بعد عام لوگوں کی طرح وہ بھی دنیا کی طلب میں لگ جاتے ہیں۔ ایسا علم کس کام کا؟ اللہ کے یہاں قدر اس علم کی جستجو اور تلاش کی ہے جو اسلام کو زندہ کرنے کی غرض سے کی جائے ،جو قرآن و سنت کی پیروی عام کرنے کے مقصد سے کی جائے، جو لوگوں کے معاملات دین و شریعت کے مطابق فیصل کرنے کے لیے کی جائے اور جو دین کی تفہیم و تلقین کی خاطر کی جائے۔اس بلند مقصد سے حصول علم میں اگر کسی کو موت آجائے تو جنت میں انبیاء کے بعد سب سے زیادہ بلند مرتبہ اسی کا ہوگا۔ حدیث کے الفاظ ہیں 'ایسے طالب علم اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجے کا فرق ہوگا۔' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا مرتبہ گو بہت بلند ہوگا۔ لیکن کوئی بھی شخص بڑی سے بڑی قربانی اور اعلیٰ سے اعلیٰ جد و جہد کے بعد بھی اللہ کے رسولوں کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا، البتہ جو شخص علم حاصل کر کے احیاء دین کی کوشش کرتا ہے وہ پیغمبروں کا کام کرتا ہے، اس لیے پیغمبروں کے بعد اس کا مرتبہ و مقام ہوگا۔

---

[1] رواہ الدارمی، حضرت حسن بصری تابعی ہیں۔ انہوں نے جس صحابیِ رسولؐ سے یہ حدیث سنی ہے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، اس لیے اصطلاح میں یہ حدیث مرسل کہلاتی ہے۔

طلبِ علم کے لیے نکلنا اللہ کی راہ میں جہاد ہے

عن انسؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتیٰ یرجع[1]

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص علم کی طلب میں نکلے وہ اللہ کے راستے میں ہے جب تک کہ وہ لوٹ نہ آئے۔

اس حدیث میں طلبِ علم میں وقت ضرورت سفر کی ترغیب ہے اور اسے 'فی سبیل اللہ' یعنی جہاد کہا گیا ہے۔ جہاد اصلاً اللہ کے دین کو سربلند کرنے، دنیا سے فتنہ و فساد کو ختم کرنے، امن و امان اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ یہی مقصد طالب علم کا ہونا چاہیے۔ جو شخص اس کے لیے سفر کرے وہ راہِ خدا میں ہے۔ جب وہ علم سے آراستہ ہو کر لوٹے گا تو اسی مقصد کو بہتر طریقہ سے پورا کرے گا اور اس کے ذریعہ سے دینی فکر و عمل کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوگا۔

سب سے بڑا سخی

عن انس بن مالکؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ ھل تدرون من اجود جوداً؟ قالوا اللہ و رسولہ اعلم فقال اللہ تعالیٰ اجود جوداً ثم انا اجود بنی آدم و أجودھم من بعدی رجل علم علماً فنشرہ یأتی یوم القیامۃ امیراً وحدہ او قال امۃً واحدۃً[2]

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ سب سے زیادہ سخی کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے زیادہ سخی اللہ ہے، پھر میں ہوں اور میرے بعد وہ شخص سخی ہے جو علم حاصل کرے اور اسے پھیلائے۔ ایسا شخص قیامت کے روز امیر بن کر اٹھے گا، یا یہ فرمایا ایک امت کی حیثیت سے اٹھے گا۔

---

[1] رواہ الترمذی و الدارمی

[2] رواہ البیہقی فی شعب الایمان

صحابہ کرامؓ کا یہ طریقہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ جب کوئی سوال فرماتے تو وہ ہمہ تن گوش ہوجاتے اور کہتے کہ اللہ اور اس کے رسول کو اس کا زیادہ علم ہے۔ صحابہ اپنی سمجھ کے مطابق سوال کا جواب دینے کی کوشش نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ یہ خیال کرتے کہ اب کوئی نئی بات بتائی جارہی ہے، اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے تھے۔ خیال رہے کہ اپنی علمی کم مائیگی کا احساس ہی وہ وصف ہے جو علم میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جس کے اندر اپنی کم علمی کا احساس ہی نہ ہو اس نے مزید حصول علم کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلیا۔

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ سب سے بڑا سخی اور فیاض اللہ ہے۔ اس کے جود وسخا کے خزانے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ وہ سب کو دیتا ہے اور بھرپور دیتا ہے۔ زندگی دیتا ہے، صحت دیتا ہے، جوانی دیتا ہے، مال و دولت دیتا ہے، عزت اور شہرت دیتا ہے، کسی میں کوئی کمی پائی جاتی ہے تو اس کے اسباب دوسرے ہو سکتے ہیں، اس کی فیاضی میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کے بعد اللہ کے آخری رسول ﷺ سب سے زیادہ سخی ہیں۔ اللہ نے آپ کو جو کچھ دیا اسے دل کھول کر بانٹتے ہیں، جس طرح رسول اللہ کو بے پناہ علم کا خزانہ اللہ سے ملتا تھا، اسی طرح آپ بے حد وحساب اسے لوگوں پر لٹا دیتے تھے۔ کبھی آپ نے اسے پوشیدہ نہیں رکھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج پورا عالم اس علم وحکمت سے روشن ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی علم کے اثرات دکھائی دیتے ہیں وہ سب آپؐ ہی کا طفیل ہے۔ آپؐ نے علم کی تقسیم میں یہ سخاوت نہ دکھائی ہوتی تو علم کا یہ دور دورہ ممکن نہ تھا۔

اللہ کے رسول ﷺ کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جو علم حاصل کرے اور اسے پھیلائے، یعنی علم کی دولت حاصل ہونے کے بعد اسے لوگوں میں تقسیم کرنے لگے۔ علم حاصل کرنا بھی بڑی خوبی ہے، لیکن اس سے بڑی اور اہم خوبی یہ ہے کہ دنیا میں اسے پھیلایا جائے۔ جو کچھ آدمی نے حاصل کیا ہے اسے دوسروں کے درمیان عام کر دے۔ علم دین بہت لوگ حاصل کرتے ہیں، لیکن اس کی اشاعت کم ہی لوگ کر پاتے ہیں۔ ان لوگوں کی حیثیت بخیل کی سی ہے، جو اپنے علم پر سانپ بن کر بیٹھے رہتے ہیں اور کسی کو مستفید

ہونے کا موقع نہیں دیتے۔ حالاں کہ اس طرح وہ اپنے علم کو ضائع کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف علم کو پھیلانے سے علم نہ صرف یہ کہ وہ محفوظ رہتا ہے، بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایسا عالم قیامت کے روز سردار بن کر اٹھے گا۔ چاہے دنیا میں فقیروں کی زندگی بسر کرتا رہا ہو، پھٹے بوریے پر سوتا رہا ہو، فاقہ کرتا رہا ہو اور دنیا میں اس کی کوئی حیثیت نہ رہی ہو اور مولوی، ملا، مولانا کہہ کر لوگ اس کا مذاق اڑاتے رہے ہوں۔ کیا یہ کوئی معمولی اعزاز ہے؟ اور پھر آخرت کی بادشاہت اور سرداری کا کیا کہنا۔ وہ تو لازوال اور پائے دار ہوگی۔ راوی کے مطابق شاید رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا شخص قیامت میں امتِ واحد بن کر اٹھے گا۔ ان الفاظ میں بڑی معنویت ہے۔ وہ شخص امت واحد کی حیثیت رکھتا ہے جو دین کی اشاعت کا یا اس کی تجدید کا سبب بنتا ہے اور اس ایک شخص کے ذریعے اس کے بعد بھی علم کا چراغ روشن رہتا ہے اور لوگ فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کو امتِ واحدہ کہا گیا ہے، اس لیے کہ ان کے ذریعے پوری دنیا میں وحدانیت کا علم بلند ہوا، آج تک بلند ہے اور قیامت تک بلند رہے گا۔

عالم کی عبادت گزار پر فضیلت

عن أبی الدرداءؓ قال انّی سمعت رسول اللهﷺ یقول: من سلک طریقا یطلب فیه علماً سلک الله به طریقاً من طرق الجنة و انّ الملٰئکة لتضع أجنجتها لطالب العلم و ان العالم یستغفر له من فی السمٰوات ومن فی الأرض و الحیتان فی جوف الماء و ان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علیٰ سائر

حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہﷺ کو یہ فرماتے سنا: جس نے علم کی طلب میں کوئی راستہ طے کیا اللہ نے اس کے لیے جنت کے راستوں میں سے ایک راستہ کھول دیا اور فرشتے طالب علم کے راستے میں اپنے پر بچھاتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساری چیزیں حتیٰ کہ پانی میں رہنے والی مچھلیاں بھی عالم کے حق میں مغفرت کی دعا کرتی ہیں۔ عالم کی فضیلت عابد پر اسی طرح ہے جس طرح چودھویں

الکواکب و ان العلماء ورثۃ الأنبیاء و ان الأنبیاء لم یورّثوا دیناراً و لاَ درھماً و انّما ورثوا العلم، فمن أخذہ أخذ بحظٍّ وافر[1]

کے چاند کی فضیلت ستاروں پر ہے اور علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء کو درہم و دینار کی وراثت نہیں دی گئی ہے، بلکہ علم کی وراثت دی گئی ہے۔ جس نے اس ورثہ کو پا لیا اس نے حصہ وافر پایا۔

اس حدیث میں کئی باتیں بیان ہوئی ہیں: پہلی بات علم دین کے طلب کی اہمیت ہے۔ جو شخص علم دین کی تلاش میں دوڑ دھوپ، محنت اور وقت صرف کرتا ہے اور جو مال خرچ کرتا ہے وہ جنت سے اسے قریب کرتا ہے۔ اللہ اس کی ان کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جنت کا صلہ اس کے لیے تیار ہے اور فرشتے اس کی راہ میں پر بچھاتے ہیں، یعنی اسے ہر قسم کی آسانیاں فراہم کرتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے فرشتے ساری دنیا کا نظم ونسق چلاتے ہیں۔ فرشتے طالب علم کے لیے سازگار حالات پیدا کرتے ہیں اور نظامِ کائنات کو اس کے حق میں معاون بناتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ علم دین سے زمین وآسمان کی ہر شئے کا ایک قلبی تعلق ہوتا ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر تمام اشیا یہاں تک کہ پانی میں مچھلیاں بھی اس کے حق میں دعائے مغفرت کرتی ہیں۔ سوچنے کی بات ہے، جس کے حق میں پوری کائنات استغفار کرے اللہ کی رحمت اس کی جانب کیوں نہ متوجہ ہو گی!

تیسری بات عابد پر عالم کی فضیلت کی ہے۔ عابد کی عبادت، اس کے زہد اور تقویٰ کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن اس کے باوجود وہ عالم کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ فضیلت یوں ہی نہیں ہے۔ عملی دنیا اسے اس کا مستحق بناتی ہے۔ مثال کے طور پر زید ڈرائیور ہے اور بکر مسافر ہے۔ اس میں اہمیت زید ہی کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ گاڑی چلانے کا کام بہر حال زید ہی انجام دیتا ہے۔ بکر میں بہت سی خوبیاں ہوسکتی ہیں، لیکن اپنی ان خوبیوں کے باوجود وہ موٹر کی اسٹیرنگ نہیں تھام سکتا۔ اگر ایسا کرے گا تو خود ہی

---

[1] رواہ احمد و الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ و الدارمی

نہیں، بلکہ سارے مسافروں کو ہلاکت میں ڈال دے گا۔ یہی حیثیت عالم کی ہے۔ امت کی رہ نمائی، سربراہی اور قیادت وہی کرے گا، پیچیدہ مسائل کا حل وہی بتائے گا، قرآن و سنت کے احکام وہی سنائے گا، اللہ اور اس کے رسول کا مقصد و منشا وہی واضح کرے گا، نزاعی معاملات کا فیصلہ وہی کرے گا۔ جو محض عابد و زاہد ہے اس کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ لوگوں کا مرجع بن جائے اور دین کے معاملے میں لوگوں کی رہ نمائی کرے۔ اگر بالفرض اپنے تقویٰ اور عبادت و ریاضت کے اثر سے عوام کے اندر وہی منصب سنبھالتا ہے جو عالم کا ہے تو اس کا اور اس کے پیروؤں کا وہی حال ہوگا جو بکر اور بس کے مسافروں کا ہوگا۔ آج جو لوگ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو جاتے ہیں اور اذکار و نوافل کا اہتمام کرنے لگتے ہیں عوام ان کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور انہیں رہ نما تصور کرنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ ایک شخص جو قرآن کی محض تلاوت کرتا ہو اور دوسرا وہ جو قرآن کے معنی ومفہوم سے نہ صرف یہ کہ واقف ہے، بلکہ اس کی باریکیوں تک اس کی رسائی ہے، دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ قرآن کی آیات کا مطلب وہ بتائے گا جو اس کو جانتا ہو، یا وہ جو محض تلاوت کرتا ہو اور اس کے مقصد و مدعا کو نہ جانتا ہو؟ جو دین کا فہم رکھتا ہو اور اس پر عبور رکھتا ہو وہی قرآن وسنت کی راہ دکھا سکتا ہے۔ یہ کام زاہد و عابد کا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح ستاروں کی چمک سے بھی لوگوں کو راستہ مل جاتا ہے، لیکن بہر حال وہ ایک جھلملاتا ستارہ ہی ہے، عالم کی طرح آفتاب و ماہ تاب نہیں ہے۔ چوتھی بات عالم اور انبیاء کے تعلق کی ہے۔ انبیاء کو اللہ تعالیٰ علم کے خزانے عطا کرتا ہے، وہ اس خزانے کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اور علماء جو اس دولت کو حاصل کرتے ہیں وہ انبیاء کے وارث ہیں۔ دنیا میں وراثت مال و دولت، جایداد کی چلتی ہے، لیکن انبیاء علم کا ورثہ چھوڑتے ہیں اور علماء اسی ورثے کے حامل ہوتے ہیں۔ مال و دولت کا ورثہ تو آخر کار ختم ہو جاتا ہے چاہے وہ کتنا ہی زیادہ ہو، لیکن علم کی وراثت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ علماء کو انبیاء کا وارث اس لیے کہا گیا ہے کہ جو کام انبیاء کا ہوتا تھا

وہ اب علماء کے سپرد ہے۔ لوگوں کی رہ نمائی کرنا، اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو بیان کرنا، اس کے احکام وقوانین کی تشریح کرنا، لوگوں کو صحیح راستہ بتانا انبیاء کا کام تھا اور اب یہی کام علماء کا ہے۔

خیر کی تعلیم دینے والے کا مقامِ بلند

عن أبی أمامة الباهلیؓ قال: ذکر لرسول اللہﷺ رجلان، أحدهما عابد و الآخر عالم، فقال رسول اللہﷺ فضل العالم علی العابد کفضلی علی أدناکم، ثم قال رسول اللہﷺ ان اللہ و ملئکة و أهل السمٰوات و الارض حتی النملة فی جحرها و حتی الحوت لیصلّون علی معلّم الناس الخیر[1]

حضرت ابوامامہ باہلیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہﷺ سے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا، ان میں سے ایک عابد ہے اور دوسرا عالم۔ (ان میں سے کسے فضیلت حاصل ہے؟) آپؐ نے فرمایا: عالم کی فضیلت عابد پر اسی طرح ہے جس طرح مجھے تم میں کے ایک عام آدمی پر ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے، آسمان اور زمین میں رہنے والے، یہاں تک کہ چونٹیاں اپنی بلوں میں اور مچھلیاں پانی میں اس شخص کے لیے دعا کرتے ہیں جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے۔

اوپر والی حدیث میں 'العلماء ورثة الأنبیاء' کہا گیا ہے۔ اس حدیث میں اس کی مزید تشریح ہے۔ حدیث میں دو آدمیوں کا ذکر، ہوسکتا ہے بطور مثال ہو، اس کا بھی امکان ہے کہ اس طرح کا کوئی واقعہ ہی پیش آیا ہو، لیکن یہ ایک سوال ہے جو عام طور پر ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ ایک شخص عابد ہے، دین کی بنیادی باتوں سے واقف ہے، لیکن اس کی اصل توجہ عبادت پر ہے۔ اسی میں اس کے شب و روز صرف ہوتے ہیں۔ دوسرا شخص فرائض و واجبات کا اہتمام تو کرتا ہے، لیکن انسانوں کے درمیان نیکی اور بھلائی کو عام کرنے میں مصروف ہے، ان میں سے کس شخص کو فضیلت حاصل ہے؟ اس کے

---

[1] ترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة حدیث نمبر ۲۶۸۵

جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا:

فضل العالم علی العابد کفضلی علی أدناکم

تم میں سے ایک عام آدمی کی بہ نسبت مجھے جو فضیلت اور برتری حاصل ہے وہی برتری عالم کو عابد پر حاصل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے یہ مقدس الفاظ تعلیم و تعلم کو آسمان کی رفعت عطا کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: جو شخص انسانوں کے درمیان خیر کو عام کر رہا ہے اسے تو اللہ تعالیٰ کا لطف وعنایت حاصل ہے اور زمین و آسمان کی تمام مخلوق اس کے لیے دعا کرتی ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے عابد کے مقابلے میں عالم کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے یہ آیت تلاوت فرمائی:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر:۲۸)

اللہ سے اس کے نیک بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح علم سے انسان کے اندر خدا کا خوف اور خشیت پیدا ہوتی ہے۔ جس کے اندر خدا کی خشیت ہو اس کا مقام یقیناً بلند ہے۔

---

[1] رواہ الدارمی، عن مکحول مرسلاً

[اس مضمون کا بیش تر حصہ ایک درسِ حدیث ہے، جسے بعد میں جناب اسرار احمد خاں نے قلم بند کیا تھا اور ماہ نامہ 'زندگی' شوال ۱۴۰۱ھ/ اگست ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اب حذف و اضافہ کے بعد اسے یہاں پیش کیا جارہا ہے۔]

فروغِ علم کے اقدامات

علم کی توسیع و اشاعت میں اسلام کا کردار اتنا نمایاں ہے کہ اس کا اعتراف نہ کرنا یا اسے نظرانداز کرنا تاریخ سے بے خبری اور تعصب کی دلیل ہے۔لیکن بہت سے پڑھے لکھے لوگ ان دونوں کم زوریوں میں گرفتار ہیں۔اسلام انسان کی زندگی اوراس کے مسائل کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر کا حامل ہے۔کوئی بھی مسئلہ ہو اسے وہ اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اس پر اس کی چھاپ ضرور ہوتی ہے۔جن لوگوں کو اس کے فکر ونظر سے اتفاق نہیں ہے وہ اس کے کسی بڑے سے بڑے کارنامہ کو بھی تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔انھیں یہ بات ناگوار گزرتی ہے کہ اسلام کی طرف کوئی خوبی منسوب کی جائے۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں انسان کی کام یابی کا دار و مدار اللہ تعالیٰ کے دین پر ہے۔اس نے علم کو بھی اسی جہت سے دیکھا ہے۔اس کے نزدیک علم بنیادی طور پر اس دین کو جاننے اور اس میں گہری بصیرت پیدا کرنے کا نام ہے۔ موجودہ دور میں جن علوم کو دنیاوی علوم کہا جاتا ہے انہیں بھی وہ دینی رخ عطا کرتا اور دین کے تابع بنا کر رکھتا ہے۔ انہیں وہ دین کو سمجھنے، سمجھانے اور اسے فروغ دینے کا ذریعہ تصور کرتا ہے۔سائنسی علوم بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے ہیں۔ اسلام کے نزدیک خدمت خلق کی حیثیت عبادت کی ہے۔ لہٰذا ان علوم کا حاصل کرنا اور انہیں فروغ دینا کارِثواب ہے۔ معاشرہ کو ان میں سے جس علم کی جتنی ضرورت ہو اس کی اہمیت اتنی ہی

بڑھ جاتی ہے اور اس کا حصول ضروری ہو جاتا ہے۔[۱]

علم کے مختلف شعبے ہیں۔ آج کے دور میں ہر شعبہ شاخ در شاخ ہو گیا ہے۔ اس میں نوع انسانی کے لیے کس شعبہ کی کیا افادیت ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ اس وقت تو ہم دنیائے علم پر رسول اللہ ﷺ کے بعض احسانات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ علم کے فروغ کے لیے آپؐ نے کیا اقدامات کیے اور کس طرح اسے زمین کے گوشے گوشے میں پھیلانے کا انتظام فرمایا؟ آپؐ کے ان احسانات سے دنیائے علم بلکہ دنیائے انسانیت کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتی۔

دین کے بنیادی علم کو ہر مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے، لیکن آپؐ ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے جو اس وقت علمی مراکز سے دور اور مروجہ علوم وفنون سے بڑی حد تک ناواقف تھی۔ آپ کو سب سے پہلے اسی قوم سے خطاب کا حکم دیا گیا۔ آپؐ

۱۔ امام غزالی نے علوم کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ شرعی اور غیر شرعی۔ شرعی علوم وہ ہیں جو اللہ کے رسولوں کے واسطہ سے ملتے ہیں۔ غیر شرعی علوم ان کے نزدیک وہ ہیں جو عقل اور تجربہ سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ علوم محمود، مذموم اور مباح تینوں طرح کے ہیں۔ جن علوم سے دنیا کے مصالح وابستہ ہیں ان کا حصول پسندیدہ ہے۔ جن علوم پر علوم دنیا کا انحصار ہے، جو بقائے حیات کے لیے ضروری ہیں اور جن سے بے نیازی برتی نہیں جا سکتی جیسے طب اور ریاضی تو ان کا حصول فرض کفایہ ہے۔ اسی طرح کاشت کاری، پارچہ بافی، سیاست وریاست، خیاطی اور باربری کے فن تو یہ سب فرض کفایہ ہیں۔ اس لیے کہ اگر کسی آبادی کی ان فنون کی طرف توجہ نہ ہو تو پوری آبادی کا نقصان ہو گا بلکہ اس کی ہلاکت یقینی ہو جائے گی۔ اگر کوئی شخص (یا اشخاص) آبادی کی اس نوع کی ضرورت پوری کر دے تو سب کی طرف سے یہ فرض کفایہ ادا ہو جائے گا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین: ۱/ ۱۵۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے علم کا کتنا وسیع تصور دیا ہے۔ وہ ہر اس علم کی ترغیب دیتا، اسے ضروری قرار دیتا اور اس کی سرپرستی کرتا ہے جس سے نوع انسانی کو فائدہ پہنچے اور جس سے غفلت اس کے نقصان کا باعث ہو۔

نے اس کے سامنے اللہ کا دین پیش فرمایا۔اس کا سیکھنا اپنے ہر ماننے والے کے لیے ضروری قرار دیا۔اس کی فضیلت بیان کی،اس کے حصول کی ترغیب دی اور اس کی اہمیت واضح فرمائی۔حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم[۱] ہر مسلمان پر علم کا طلب کرنا فرض ہے۔

مشہور محدث اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں: اس حدیث کی سند پر اہل علم نے گو جرح کی ہے لیکن اس کے معنیٰ صحیح ہیں[۲]۔

حدیث کا منشا یہ ہے کہ کوئی بھی شخص دین کے بنیادی علم سے ناواقف نہ رہے۔ اس سلسلہ میں علامہ ابن عبد البر نے اسلام کے نقطۂ نظر کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے دین کے بنیادی عقائد سے واقف ہونا،نماز روزہ اور صاحبِ مال ہے تو زکوٰۃ اور حج کے احکام کا جاننا ضروری ہے۔ اسی طرح

۱۔ رواہ ابن ماجہ والبیہقی وقال **ھذا متنہ مشھور و اسنادہ ضعیف و قد رُوی من اوجہ کلھا ضعیفۃ** (مشکوٰۃ، کتاب العلم) اس حدیث کی مختلف سندوں کو علامہ ابن عبد البر نے جمع کیا ہے لیکن سب میں ضعف ہے۔ (ملاحظہ ہو جامع البیان العلم وفضلہ/۲۶-۲۹)۔ یہ حدیث جن طرق سے مروی ہے ان پر علامہ سخاوی نے بھی بحث کی ہے اور مختلف محدثین کی رائیں نقل کی ہیں۔بعض محدثین نے جہاں اسے کم زور بتایا ہے وہیں بعض نے اسے قابلِ قبول بھی قرار دیا ہے۔ علامہ مزّی کہتے ہیں: **ان طرقہ تبلغ رتبۃ الحسن**۔ ابن قطان اس کی ایک سند کے بارے میں فرماتے ہیں: **انہ غریب حسن الاسناد**۔ علامہ عراقی بیان کرتے ہیں: **صحح بعض الائمۃ بعض طرقہ**۔ یہ تو اس کی سند سے متعلق بحث ہے۔جہاں تک اس کے مفہوم کا تعلق ہے اسے کسی صاحب علم نے غلط نہیں قرار دیا ہے۔ بعض مصنّفین کے ہاں 'طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم' کے بعد 'مسلمۃ' کا اضافہ بھی ملتا ہے۔ مطلب یہ کہ علم کا طلب کرنا مسلمان مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے۔ علامہ سخاوی کہتے ہیں: **لیس لھا ذکر فی شیء من طرقہ و ان کان معناھا صحیح** یعنی یہ حدیث جن سندوں سے مروی ہے ان میں سے کسی میں یہ اضافہ موجود نہیں ہے، گو اس کے معنی صحیح ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ **المقاصد الحسنۃ فی بیان کثیر من الاحادیث المشتھرۃ علی الالسنۃ**،۱۳۰-۱۳۱۔

۲۔ جامع بیان العلم،ص۲۹۔

حرام و حلال کے موٹے موٹے مسائل سے باخبر ہونا بھی اس کے لیے لازمی ہے۔اس حد تک دین سے واقفیت فرض عین ہے۔اس کے بعد فرماتے ہیں:

ثم سائر العلم، و طلبه و التفقه فيه و تعليم الناس اياه و فتواهم به في مصالح دينهم و دنياهم والحكم به بينهم فرض على الكفاية يلزم الجميع فرضه فاذا قام به قائم سقط فرضه عن الباقين بموضعه لاَ خلاف بين العلماء في ذلك[1]

جہاں تک دینی علوم کا تعلق ہے، ان کا طلب کرنا، ان میں گہری سوجھ بوجھ پیدا کرنا، لوگوں کو ان کی تعلیم دینا، ان کے دین و دنیا کے مصالح اور ضرورتوں میں اس علم کی روشنی میں فتویٰ دینا اور اس کے مطابق فیصلہ کرنا فرض کفایہ ہے، جو سب پر لازم ہے،لیکن اگر کوئی شخص اس ذمہ داری کو سنبھال لے تو باقی لوگوں سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا۔ اس میں علماء کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔

کسی بھی گروہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا ہر فرد دین کا وسیع علم حاصل کرے، اس میں تبحر اور گہری بصیرت پیدا کرے،لیکن پوری جماعت کو اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ دینی علم و بصیرت رکھنے والے افراد اس میں مسلسل پیدا ہوتے رہیں اور کوئی بھی وقت اور زمانہ ان سے خالی نہ رہے ،ورنہ پوری جماعت اللہ تعالیٰ کے نزدیک جواب دہ قرار پائے گی۔ اس گروہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جن افراد کو علم دین میں یہ مقام حاصل ہو ان کی طرف زندگی کے مختلف مسائل میں رجوع کرے اور ان سے دینی رہ نمائی حاصل کرے۔یہی بات علماء دین نے اس طرح کہی ہے کہ علم دین میں کمال پیدا کرنا تو ہرایک کے لیے ضروری نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ جو مسئلہ درپیش ہو اس میں وہ اہلِ علم سے اسلام کا نقطۂ نظر معلوم کرے۔[2]

اسلام پوری زندگی کو اپنے احاطے میں لیتا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ اس کا ماننے والا

---

[1] جامع بیان العلم :ص ۳۲

[2] ملاحظہ ہو جامع بیان العلم: ص ۳۰۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں: حالات کے لحاظ سے انسان پر علم کا حصول فرض ہوتا چلا جاتا ہے۔تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ احیاءعلوم الدین:۱/ ۱۳

ہر فرد کم از کم اس کے اصول و مبادی سے واقف ہو اور تفصیلی معاملات میں اس کے ماہرین سے رہ نمائی حاصل کرے تاکہ جہالت اور بے خبری کی وجہ سے وہ اس کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھے۔اس طرح اسلام کا ماننے والا زندگی کے ہر مرحلہ میں اس کا علم حاصل کرنے کا پابند ہے۔اسلام کے علم کے بغیر وہ کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔

علم دین کے حصول کی ترغیب

رسول اکرم ﷺ نے علم کو ضروری قرار دینے کے ساتھ مختلف پہلوؤں سے اس کی ترغیب بھی دی تاکہ دل کی آمادگی کے ساتھ اس کے حصول کی کوشش کی جائے۔اس سلسلہ کی بہت سی روایات میں سے صرف دو روایات یہاں پیش کی جارہی ہیں۔

۱۔ حضرت ابوامامہ باہلیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک عابد اور ایک عالم کا ذکر کیا گیا اور دریافت کیا گیا کہ ان دونوں میں سے کس کا درجہ بلند ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم

عابد کے مقابلہ میں عالم کو اسی طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح تم میں کے ایک عام آدمی کے مقابلہ میں مجھے فضیلت حاصل ہے۔

پھر عالم کی فضیلت اور برتری بیان کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا:

ان اللّٰہ و ملئکۃ و اھل السمٰوٰت و الاُرضین حتی النملۃ فی جحرھا و حتٰی الحوت لیصلون علی معلم الناس الخیر[1]

جو شخص لوگوں کو خیر اور بھلائی کی تعلیم دیتا ہے اس پر تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نازل فرماتا رہتا ہے۔ فرشتے اور آسمانوں اور زمینوں میں رہنے والے یہاں تک کہ چونٹیاں اپنی بلوں میں اور مچھلیاں پانی میں اس کے لیے دعائیں کرتی ہیں۔

اس حدیث میں جہاں عالم کی فضیلت بیان ہوئی ہے وہیں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ یہ فضیلت اسے کیوں حاصل ہے؟ عبادت انسان کا ایک ذاتی عمل ہے۔ جو شخص

---

[1] ترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ

شب وروز عبادت میں مصروف ہے اور اللہ تعالیٰ سے لَو لگائے ہوئے ہے وہ اس سے خود فائدہ اٹھاتا ہے، خلقِ خدا کو اس سے کوئی نفع نہیں پہنچتا، لیکن عالم اپنے عمل سے خود بھی استفادہ کرتا ہے اور دنیا کو بھی فیض پہنچاتا ہے۔ نفع رسانیِ خلق وہ مبارک عمل ہے جس پر زمین و آسمان کی ہر چیز دعائیں کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ رحمت کی بارش برساتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جس علم سے خلقِ خدا کو فائدہ نہ پہنچے اور دنیا میں خیر کی تعلیم عام نہ ہو وہ اس فضیلت کا مستحق نہیں ہے۔

دین کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہے۔ قرآن کی ایک ایک آیت سیکھنے کا کیا ثواب ہے، اس کا اندازہ حضرت عقبہ بن عامرؓ کی ایک روایت سے ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم مسجد نبوی کے صفہ (وہ چبوترہ جو نادار مسلمانوں کے لیے بنایا گیا تھا) پر بیٹھے ہوئے تھے، رسول اکرم ﷺ تشریف لائے۔ فرمایا تم میں سے کون یہ چاہتا ہے کہ بطحان یا عقیق (مدینہ سے قریب ہی دو وادیوں کے نام ہیں) میں جائے اور کسی گناہ یا قطع رحم کا ارتکاب کیے بغیر بڑے بڑے کوہانوں والی دو اونٹنیاں لے آئے۔ ہم نے عرض کیا حضور! یہ تو ہم میں سے ہر شخص چاہے گا۔ آپ نے فرمایا:

افلا یغدو احدکم الی المسجد فیعلم او یقرأ اٰیتین من کتاب اللّٰہ خیر لہ من ناقتین و ثلاث خیر لہ من ثلاث و اربع خیر لہ من اربع و من اعدادھن من الْاِبل[1]	ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ تم میں سے کوئی شخص مسجد جائے وہاں کسی کو کچھ تعلیم دے یا (خود تعلیم حاصل کرے) اور اللہ تعالیٰ کی کتاب سے دو آیتیں پڑھے یہ اس کے حق میں اس طرح کی دو اونٹنیوں سے بہتر ہے، تین آیتوں کا پڑھنا تین اونٹنیوں سے اور چار آیتوں کا پڑھنا چار اونٹنیوں سے بلکہ جتنی آیتیں وہ پڑھے گا اتنی اونٹنیوں سے بہتر ہے۔

اس سے قرآن مجید کے علم کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اس کی چند آیتوں کا علم بھی دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بدر جہا بہتر اور برتر ہے۔

---

[1] مسلم، فضائل القرآن، باب فضل قرأۃ القرآن فی الصلوٰۃ الخ

علم کو محنت سے حاصل کرنے کی ہدایت

یہ حقیقت بھی حدیث میں ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ علم محض خواہش اور تمنا سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے جد وجہد اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت معاویہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

یا ایھا الناس تعلموا انما العلم بالتعلم و الفقه با التفقه و من یرد اللّٰہ بهٖ خیرا یفقهه فی الدین[1]

لوگو علم حاصل کرو۔ علم تو سیکھنے ہی سے آتا ہے اور فقہ دین میں سوجھ بوجھ پیدا کرنے سے آتی ہے۔ اللہ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کا فہم اور بصیرت عطا کرتا ہے۔

اس حدیث میں ایک اور بات بھی سمجھائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح سے ہر علم اس کے اساتذہ اور ماہرین سے حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح علم دین اللہ کے رسولوں اور ان کے جانشینوں کے ذریعہ ملتا ہے۔ جو شخص اس علم کا اکتساب کرنا چاہے اسے اس علم کے حاملین کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور ان سے باقاعدہ سیکھنا ہوگا۔ ان سے بے نیاز ہوکر وہ علم دین کا اکتساب نہیں کر سکتا۔

ایک حدیث میں علم کو سب سے بڑی دولت قرار دیا گیا ہے اور اس کے حصول کی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما اکتسب مکتسب مثل فضل علم یهدی صاحبه الی هدی او یرده عن ردیً و لاَ استقام دینه حتیٰ استقام عمله[2]

کسی اکتساب کرنے والے نے علم جیسی فضیلت والی کوئی دوسری چیز حاصل نہیں کی۔ علم نیک کاموں کی طرف اس کی رہ نمائی کرتا اور ہلاکت کے کاموں سے بچاتا ہے۔ انسان کا دین اس وقت تک درست نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا عمل درست نہ ہو۔

---

[1] یہ حدیث امام بخاری کی تعلیقات میں سے ہے اسے انہوں نے ترجمہ باب میں نقل کیا ہے۔ (کتاب العلم، باب العلم قبل القول الخ) طبرانی وغیرہ نے اسے سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: سندہ حسن۔ فتح الباری: ۱/۱۱۸ یہ اور اس کی ہم معنی روایات کے لیے ملاحظہ ہو: المقاصد الحسنة: ص ۵۲۔

[2] طبرانی: المعجم الصغیر: ص ۱۴۰۔ یہ حدیث طبرانی نے اپنی المعجم الکبیر میں بھی روایت کی ہے۔ =

ایک اور حدیث میں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ آدمی اس دنیا میں عالم یا متعلّم بن کر رہے۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ انہوں رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

اغد عالما او متعلّما او مستمعًا او محبًّا و لَا تکن الخامس فتھلک[۱]	نکلو عالم کی حیثیت سے یا متعلّم کی حیثیت سے یا سامع کی حیثیت سے یا ان سے محبت کرنے والے کی حیثیت سے۔ پانچویں کوئی صورت نہ اختیار کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

مطلب یہ کہ آدمی کسی کو کچھ سکھائے یا خود سیکھے۔ وہ اس حیثیت میں نہیں ہے تو علمی مجلسوں میں شریک ہو کر توجہ سے اہل علم کی باتیں سنے اور فائدہ اٹھائے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے تو کم از کم ان تینوں طرح کے لوگوں سے محبت کرے۔ یہی چار صورتیں کام یابی کی ہیں۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ دل علم کی محبت سے خالی ہو اور آدمی علم اور اہلِ علم سے نفرت کرے۔ یہ صورت کسی بھی شخص کے لیے تباہ کن ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک شخص کا ذکر خیر ہوا۔ آپ نے فرمایا:

اولم تروہ یتعلم القرآن[۲]	کیا تم لوگ دیکھتے نہیں ہو کہ وہ قرآن کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے ان ارشادات کے ذریعہ سے کسبِ علم کی فضا پیدا کی، علمی جدو جہد کا وقار قائم کیا اور جو لوگ اس جدوجہد میں لگے ہوئے تھے انہیں معاشرہ میں عزت و سربلندی کا مقام عطا فرمایا۔

= اس میں آخری فقرہ **حتی استقام عقلہ** (جب تک کہ اس کی عقل و فہم درست نہ ہو) ہے۔ علامہ منذری کہتے ہیں: **اسناد ھما متقارب**۔ الترغیب والترہیب: ۱/ ۵۳

۱۔ طبرانی: المعجم الصغیر: ص ۱۶۲۔ قال السیوطی: رواہ البزار و الطبرانی فی الاوسط۔ رجالہ ثقات، مناوی، التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۱/ ۱۷۸۔ اس کی ہم معنی روایات اور آثار کے لیے ملاحظہ ہو جامع بیان العلم ص ۵۶-۵۷۔ نیز **المقاصد الحسنۃ** ص ۳۲

۲۔ مسند احمد: ۶/ ۶۶

حصولِ علم کے لیے صحابہؓ کا اہتمام

ان تعلیمات و ترغیبات کے نتیجہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے علم دین کو سیکھنے کا جو اہتمام فرمایا اس کی بعض مثالیں یہاں پیش کی جارہی ہیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں میرے ایک پڑوسی تھے۔ہم دونوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ باری باری رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں شریک ہوں گے۔ چناں چہ ایک روز میں آپ کی مجلس میں حاضر ہوتا اور کوئی وحی نازل ہوتی تو وہ انھیں سناتا اور جو واقعات پیش آتے ان سے انھیں باخبر کرتا،اسی طرح دوسرے روز وہ آپ کی مجلس میں شریک ہوتے اور ساری باتیں مجھے بتاتے تھے[1]

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں دو بھائی تھے۔ان میں سے ایک آپ کی خدمت میں مستقل حاضر رہتا اور علم حاصل کرتا دوسرا معاش کے لیے کوئی کام کرتا تھا۔ اس دوسرے بھائی نے آپؐ سے پہلے بھائی کی شکایت کی کہ وہ معاش لیے کوئی جد وجہد نہیں کر رہا ہے۔آپ نے فرمایا: **لعلک ترزق به**[2] مطلب یہ کہ اسے حصول علم سے منع نہ کرو،شاید تمہیں اسی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ روزی دے رہا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بھی ان صحابہ میں سے تھے جنھوں نے علم دین کے لیے خود کو وقف کر رکھا تھا۔ وہ سن ۶ھ میں اسلام لائے۔ اس وقت سے رسول اللہ ﷺ کی حیات کے آخری لمحات تک آپ سے علم دین حاصل کرنے میں مصروف رہے۔ اس کے سوا دنیا کے کسی کام سے انھیں دل چسپی نہ تھی۔ خود فرماتے ہیں:

انَّ ابا هريرة كان يلزم رسول الله لشبع بطنه و يحضر مالا يحضرون و يحفظ ما لَا يحفظون[3]

ابوہریرہؓ نے تو رسول اللہ ﷺ کی صحبت لازم کرلی تھی، بھوکا رہ کر، جن مواقع پر اور لوگ موجود نہ ہوتے وہاں وہ موجود ہوتا اور جو باتیں وہ محفوظ نہ کر پاتے انھیں محفوظ کرتا۔

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب موعظة الرجل ابنته لحال زوجها
[2] ترمذی، ابواب الزہد، باب ما جاء في الزهادة عن الدنيا
[3] بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم

علم دین سے شوق کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک مرتبہ سوال کیا: **من اسعد الناس بشفاعتک یوم القیامۃ!** (وہ خوش قسمت کون ہے جو قیامت کے روز آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق ہوگا؟) آپ نے خوش ہوکر فرمایا:

لقد ظننت یا ابا ھریرۃ! ان لا یسألنی عن ھٰذا الحدیث احد اول منک لما رأیت من حرصک علی الحدیث اسعد الناس بشفاعتی یوم القیامۃ من قال: لَا اله الاّ اللّٰه خالصا من قلبه[1]

اے ابوہریرہ! حدیث کا جو شوق میں تمہارے اندر دیکھتا تھا، اس وجہ سے میں سوچتا تھا کہ تم ہی سب سے پہلے یہ سوال مجھ سے کروگے۔ قیامت کے روز وہی خوش بخت میری شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق ہوگا جس نے خلوص دل سے لا الٰہ الا اللہ کہا ہوگا۔

حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کرنے میں ابوہریرہؓ باہمت تھے۔ وہ آپ سے بہت سی ان باتوں کے بارے میں سوالات کرتے تھے جن کے بارے میں ہم سوال نہیں کر پاتے تھے۔[2]

بہت سے صحابہ اپنی تمام تر عائلی اور معاشی مصروفیات کے باوجود صبح و شام کے اوقات میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور علم دین حاصل کرتے۔ چناں چہ حضرت طلحہ بن عبیداللہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ ہم لوگ صاحبِ جائداد تھے، ہمارے گھر اور بیوی بچے تھے جس کی وجہ سے مصروفیت رہتی تھی۔ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں صبح و شام حاضر ہوتے اور پھر واپس چلے جاتے، لیکن حضرت ابوہریرہؓ کا معاملہ مختلف تھا۔

کان ابوھریرۃ مسکیناً لَا مال له و لَا اھل ولَا ولد انما کانت یده مع ید النبی ﷺ و کان یدور معه

ابوہریرہ ایک غریب آدمی تھے، نہ ان کے پاس مال تھا، نہ بیوی بچے۔ ان کا ہاتھ نبی ﷺ کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ جہاں آپ جاتے وہاں وہ بھی ساتھ

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب الحرص علی الحدیث

[2] حاکم، المستدرک: ۳/۵۱۰

حیث مادار و لاَ نشک انہ قد علم ما لم نعلم سمع مالم نسمع۔[۱]

جاتے۔اس لیے ہمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی باتیں جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے اور انہوں نے وہ باتیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں۔

ان واقعات سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علمِ دین کی کتنی زبردست طلب پیدا فرما دی تھی،صحابہ کرام اس کے لیے اپنی مصروفیات میں سے کس طرح وقت نکالتے تھے،اس کی خاطر انہوں نے کتنی قربانیاں دیں اور اپنی راحت اور آرام کو تج کر کس طرح علم دین حاصل کیا۔

دین کی تعلیم کا حکم

رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف علم دین کے حصول کو ضروری قرار دیا اور اس کے سیکھنے کا شوق اور جذبہ پیدا فرمایا، دوسری طرف اس بات کی ترغیب دی کہ دین کا جو علم حاصل ہو دوسروں کو اس کی تعلیم دی جائے۔حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تعلّموا الفرائض و القراٰن و علّموا الناس فانی مقبوض[۲]

فرائض (جو سنت میں بیان ہوئے ہیں) اور قرآن سیکھو اور لوگوں کو ان کی تعلیم دو، کیوں کہ میں تو اس دنیا سے اٹھا لیا جاؤں گا۔

رسول اللہ ﷺ جب تک باحیات تھے آپ کے ذریعہ سے دین کی تعلیم جاری تھی اور صحابہ کرامؓ آپ سے استفادہ کرتے تھے۔حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعد بھی دین کی تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔اسی سے دین زندہ رہ سکتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک وقت آئے گا جب کہ یہ علمی تسلسل ٹوٹ جائے گا اور علمِ دین کے حاملین کم سے کم تر ہو جائیں گے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ حاکم،المستدرک:۳/ ۵۱۲

۲۔ حاکم،المستدرک، ۳/ ۵۱۲

تعلموا العلم و علموہ الناس، و تعلموا الفرائض و علموھا الناس و تعلموا القراٰن وعلموہ الناس فانی امرء مقبوض و العلم سیقبض و تظھر الفتن حتی یختلف اثنان فی فریضۃ لاَ یجدان احداً یفصل بینھما[1]

علم سیکھو اور اس کی لوگوں کو تعلیم دو، فرائض سیکھو اور اس کی لوگوں کو تعلیم دو، قرآن سیکھو اور اس کی لوگوں کو تعلیم دو۔ اس لیے کہ میں تو اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔ایک وقت آئے گا جب کہ علم اٹھا لیا جائے گا اور طرح طرح کے فتنے نمودار ہوں گے۔صورت حال یہ ہوجائے گی کہ کسی حکم کے بارے میں دو آمیوں میں اختلاف ہوگا تو انہیں کوئی ایسا آدمی نہ ملے گا جو ٹھیک ٹھیک ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

یہ حدیث اس بات کی ترغیب دیتی ہے کہ ہر نسل اپنی اگلی نسل تک اللہ کا دین منتقل کرنے کی کوشش کرے اور اس سلسلہ کو کبھی بند نہ ہونے دے۔ اس حدیث میں اور بعض دوسری احادیث میں اس سلسلہ میں غفلت کے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے، وہ یہ کہ اس سے علم دین کے حاملین پیدا ہونے بند ہو جائیں گے اور امت کا اختیار و اقتدار ان افراد کے ہاتھوں میں چلا جائے گا جو دین سے جاہل اور بے خبر ہوں گے۔ وہ خود بھی راہِ راست سے بھٹکیں گے اور دوسروں کو بھی گم راہ کریں گے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان اللّٰہ لاَ یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ من الناس و لکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یترک عالماًاتخذ الناس رؤسا جھالاً فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلّوا و اضلّوا[2]

اللہ تعالیٰ علم کو اچانک لوگوں کے سینوں سے کھینچ کر نہیں نکالے گا، بلکہ علماء کو ختم کر کے علم کو اٹھا لے گا۔ جب وہ کسی عالم کو باقی نہیں رکھے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا رئیس اور سردار بنا لیں گے،ان سے مسائل پوچھے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے۔ خود بھی گم راہ ہوں گے اور دوسروں کو گم راہ کریں گے۔

---

[1] دارمی، مقدمۃ، باب الاقتداء بالعلماء-دار قطنی، کتاب الفرائض، ص۴۵۹

[2] بخاری، کتاب الاعتصام، باب ما یذکر من ذم الرأی الخ۔مسلم، کتاب العلم، باب رفع العلم الخ

امام نووی فرماتے ہیں:

فيه التحذير من اتخاذ الجهال رؤساء[۱]	اس میں جاہلوں کو اپنا سردار بنانے سے احتراز کی تعلیم دی گئی ہے۔

اس میں امّت کو ہدایت ہے کہ دین کی تعلیم میں غفلت نہ برتی جائے، اس کے جو تباہ کن نتائج اور نقصانات ہوں گے ان سے باخبر فرمایا گیا ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ کسی کو علم کی دولت سے آراستہ کرنا اس پر صدقہ کرنا ہے۔حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

افضل الصدقة ان يتعلم المرأ المسلم علما ثم يعلمه اخاه المسلم[۲]	سب سے اچھا صدقہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کوئی علم حاصل کرے اور اپنے مسلمان بھائی کو اس کی تعلیم دے۔

کسی محتاج کو صدقہ و خیرات دینا اس میں شک نہیں کہ کارِ ثواب ہے،لیکن مال کے صدقہ سے زیادہ قیمتی علم کا صدقہ ہے۔مال سے انسان کی مادی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور علم سے اس کا دین اور دنیا دونوں سنور سکتے ہیں۔اس پہلو سے علمی احسان سب سے بڑا احسان ہے۔

ایک اور حدیث میں تعلیم کو صدقہ جاریہ قرار دیا گیا ہے۔حضرت ابوہریرہؓ ہی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الّا من ثلاثة الّا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له[۳]	جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے سب اعمال ختم ہو جاتے ہیں۔ سوائے تین اعمال کے۔ صدقہ جاریہ، یا وہ علم جس سے بعد میں فائدہ اٹھایا جائے یا صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔

---

۱ شرح مسلم:۲ /۳۴۱

۲ ابن ماجہ،مقدمہ،باب ثواب معلم الناس الخير۔ قال المنذری: اسناده حسن، الترغيب و الترهيب :۱ / ۵۴

۳ مسلم،کتاب الوصیۃ،باب مایلحق الانسان من الثواب بعد وفاته

امام نووی فرماتے ہیں۔اس حدیث سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اس میں اسے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے پر ابھارا گیا ہے اور اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ تعلیم،تصنیف و تالیف اور توضیح وتشریح کے ذریعہ سے دوسروں کو اس کا وارث بنایا جائے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے علوم کا انتخاب ہونا چاہیے جو زیادہ سود مند اور نفع بخش ہوں[1]

مساجد ــــ علمی مراکز

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں باقاعدہ تعلیمی اداروں کا وجود تو نہیں تھا، لیکن آپ نے مساجد کو تعلیمی مراکز کی حیثیت عطا کی اور مساجد میں جمع ہو کر کتاب اللہ کو پڑھنے پڑھانے کی فضیلت بیان فرمائی۔حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے ایک لمبی روایت نقل کی ہے۔اس کے بعض جملے اسی سے متعلق ہیں۔آپ نے فرمایا:

ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللّٰه یتلون کتاب اللّٰه و یتدارسونه بینهم الا نزلت علیهم السکینة و غشیتهم الرحمة و حفتهم الملئکة و ذکرهم اللّٰه فی من عنده[2]

اللہ تعالیٰ کے گھروں (مساجد) میں سے کسی گھر میں جب لوگ جمع ہوکر اللہ کی کتاب کی تلاوت اور اس کی درس و تدریس کرتے ہیں تو ان پر ضرور سکون قلب نازل ہوتا ہے، رحمت ان پر چھا جاتی ہے، فرشتے انہیں گھیرے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنے مقربین کے درمیان کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں مسجد نبوی مسلمانوں کا ایک علمی مرکز بن گئی تھی۔ جہاں دین سیکھا اور سکھایا جاتا، علمی مذاکرے ہوتے اور اس کی حکمتوں اور باریکیوں پر غور وخوض ہوتا تھا۔اسی طرح کی ایک مجلس کا ،حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ذکر فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی میں دو مجلسیں ہو رہی تھیں۔ ایک میں بعض صحابہ ذکر و دعا میں مشغول تھے اور دوسری میں علمی مذاکرہ ہو رہا تھا۔آپ نے فرمایا:

---

[1] شرح مسلم: ۴۱/۲
[2] مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن

کلاهما علی خیر و أحدهما افضل من صاحبه، اما هٰؤلاء فیدعون اللّٰه و یرغبون الیه، فان شاء اعطاهم و ان شاء منعهم، و اما هٰؤلاء فیتعلمون الفقه و العلم و یعلمون الجاهل، فهم افضل، و انما بعثتُ معلما قال ثم جلس فیهم[1]

یہ دونوں ہی گروہ کارِ خیر انجام دے رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک دوسرے سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ پہلی مجلس کے لوگ اللہ تعالیٰ سے دعا اور اس سے آہ وزاری میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ چاہے تو انہیں دے گا اور چاہے تو نہیں دے گا لیکن دوسری مجلس والے فقہ اور علم حاصل کر رہے ہیں اور جاہلوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ یہ ان سے افضل ہیں۔ اس لیے کہ میں بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ راویِ حدیث کہتے ہیں کہ پھر آپ اس دوسری مجلس میں تشریف فرما ہوئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں مساجد میں علمی مجلسیں ہوتی تھیں۔ آپ نے خالص عبادت کی مجلسوں پر انہیں ترجیح دی۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ 'انما بعثت معلما' مطلب یہ کہ میں دین کی تعلیم و تبلیغ کے لیے بھیجا گیا ہوں اس لیے جو لوگ اس عمل میں مصروف ہیں وہ مقصدِ بعثت کو پورا کر رہے ہیں۔ پھر اس طرح کی ایک مجلس میں بہ نفس نفیس شریک ہو کر اپنی مسرت اور اپنی ترجیح کا عملاً اظہار فرمایا۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

من جاء مسجدی هٰذا لم یأت الا لخیر یتعلمه او یعلمه فهو بمنزلة المجاهد فی سبیل اللّٰه و من جاء لغیر ذٰلک فهو بمنزلة الرجل ینظر الی متاع غیره.[2]

جو شخص میری اس مسجد میں صرف کارِ خیر کے لیے آتا ہے یعنی اس لیے کہ وہ یا تو خود دین کا علم حاصل کرے یا دوسروں کو اس کی تعلیم دے تو اس کا مقام مجاہد فی سبیل اللہ کا ہے۔ جو شخص اس کے سوا کسی دوسرے مقصد (جیسے فضول گفتگو) سے آئے تو اس کی حیثیت اس آدمی کی سی ہے جو (حسرت اور افسوس سے) دوسروں کے مال و اسباب کو دیکھتا ہے۔ (کہ وہ تو ثواب لوٹ رہے ہیں اور یہ اس سے محروم ہے)۔

---

[1] دارمی، مقدمہ، باب فی فضل العلم والعالم

[2] مشکوۃ المصابیح، کتاب الصلوۃ، باب المساجد بحوالہ ابن ماجہ و بیہقی شعب الایمان

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں مساجد تعلیم وتعلّم کے مراکز بنی ہوئی تھیں۔اسی مقصد سے ان مراکز میں آنے کی آپ نے ترغیب دی۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی مساجد کی یہ حیثیت باقی رہی۔ اس کی تائید حضرت ابوہریرہؓ کے ایک دل چسپ واقعے سے ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ مدینہ کے بازار میں جاکر انہوں نے لوگوں سے کہا رسول اللہ ﷺ کی میراث تقسیم ہو رہی ہے حیرت ہے کہ تم لوگ اپنا حصہ لینے نہیں جا رہے ہو۔لوگوں نے سوال کیا کہ کہاں تقسیم ہو رہی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مسجد نبوی میں۔ لوگ جلدی جلدی مسجد پہنچے۔ حضرت ابوہریرہؓ ان کی واپسی تک وہیں رکے رہے۔ جب وہ واپس ہوئے تو پوچھا کہو کیا ملا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم مسجد نبوی گئے تھے وہاں تو کوئی میراث تقسیم نہیں ہو رہی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے پوچھا تم لوگوں نے آخر وہاں کیا دیکھا؟ ان لوگوں نے جواب دیا:

رأينا قوما يصلون و قوما يقرؤن القرآن و قوما يتذاكرون الحلال و الحرام	وہاں کچھ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں، کچھ قرآن پڑھ رہے ہیں اور کچھ لوگ حلال و حرام پر بحث و مذاکرہ کر رہے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا۔ بھلا ہو تم لوگوں کا! یہی تو اللہ کے رسول ﷺ کی میراث ہے[1]

تذکروں میں آتا ہے کہ مسجد نبوی میں حضرت جابر بن عبداللہ کا حلقہ درس تھا، جن سے لوگ استفادہ کرتے تھے[2]

خیال ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد مسجد میں اور صحابہ کرام کے بھی علمی حلقے قائم رہے ہوں گے۔ صحابہ کے بعد تابعین کے دور میں بھی مساجد کو یہ مقام حاصل رہا۔ بڑے بڑے تابعین کے حلقہ ہائے درس مساجد میں موجود تھے۔

---

[1] رواہ الطبرانی فی الاوسط باسناد حسن۔ الترغیب والترھیب: ۱/ ۵۸

[2] ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابہ: ۱/ ۲۱۳

ان ہی مقاصد کی تکمیل کے لیے بعد میں مساجد کے علاوہ اسلامی علوم کے مستقل مراکز اور مدارس وجود میں آئے۔ ان کے ذریعہ سے علم کی بیش بہا خدمات انجام پائیں۔ احادیث میں ان کی طرف بھی ترغیبی اشارے موجود ہیں۔ اوپر حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت گزر چکی ہے کہ 'جو لوگ مسجد میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے اور اس پر مذاکرہ و مباحثہ کرتے ہیں ان پر سکون نازل ہوتا ہے اور فرشتے انہیں اپنے احاطہ میں لیے رہتے ہیں'۔ اس حدیث کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں کہ 'اسی حکم میں مدرسہ اور رباط وغیرہ بھی آتے ہیں۔ حدیث میں مسجد کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ آپ کے زمانے میں مساجد ہی میں تعلیم و تعلم کا عمل انجام پاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی دوسری جگہ اس مقصد سے اجتماع ہو تو یہ شرف و منزلت اسے حاصل نہ ہو گی۔ چناں چہ اسی سلسلہ کی ایک اور روایت کے الفاظ عام ہیں۔ اس میں خاص مسجد کا ذکر نہیں ہے۔ یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا:

لَا یقعد قوم یذکرون اللّٰہ عز وجلَّ الا حفتھم الملائکۃ غشیتھم الرحمۃ و نزلت علیھم السکینۃ و ذکر ھم اللّٰہ فی من عندہ[1]

جب کچھ لوگ کسی جگہ بیٹھ کر اللہ عز وجل کا ذکر کرتے ہیں (اس میں تعلیم و تعلّم بدرجہ اولیٰ داخل ہے) تو فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں اور رحمت ان پر چھا جاتی ہے، ان پر سکون نازل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا اپنے ملائکہ مقربین میں ذکر کرتا ہے۔

علم کی تدوین و توسیع میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمات بہت نمایاں ہیں۔ وہ اپنے ایک مکتوب میں جعفر بن برقان کو لکھتے ہیں:

اما بعد فمر اھل الفقہ والعلم من جندک فلینشروا ماعلمھم اللّٰہ عز و جل فی مجالسھم و مساجدھم[2]

امابعد! تمہاری جماعت میں جو اہل علم و فقہ ہیں انہیں حکم دو کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو علم دیا ہے اسے وہ اپنی مجلسوں اور مسجدوں میں پھیلائیں۔

---

[1] مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن الخ مع شرح النووی: ۲/ ۳۴۵

[2] جامع بیان العلم: ص ۱۹۷

گورنر مدینہ ابوبکر بن حزم کو لکھتے ہیں، مجھے ڈر ہے کہ علم و علماء ختم ہوتے چلے جائیں گے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بھی احادیث تمہیں ملیں ان سب کو ضبط تحریر میں لے آؤ۔ امام بخاری اس کے ذیل میں غالباً حضرت عمر بن عبد العزیز کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

و ليفشوا العلم و ليجلسوا حتى يعلم من لاَ يعلم فان العلم لاَ يهلك حتى يكون سرا[1]

انہیں علم پھیلانا چاہیے اور اس کے لیے مجالس میں بیٹھنا چاہیے تاکہ جس کے پاس علم ہے وہ بے علم کو تعلیم دے۔ اس لیے کہ علم اسی وقت ختم ہوگا جب کہ وہ بند رہے اور پھیلایا نہ جائے۔

یہ تفصیلات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم سے بے توجہی اور غفلت کو ختم کیا۔ دین کی بنیادی تعلیم کو ہر مومن مرد اور عورت کے لیے لازم قرار دیا۔ اس میں بصیرت اور گہرائی پیدا کرنے کی تحریک پیدا کی، اس کے لیے جدوجہد کی ترغیب دی، علم کو خاص طبقات تک محدود رکھنے سے منع فرمایا اور اسے عام کرنے اور پھیلانے پر زور دیا۔ علم کا وسیع تصور دیا۔ دینی علوم کے ساتھ سماجی علوم کو اس کا صحیح مقام عطا کیا اور انسان کے مادی اور روحانی تقاضوں کی تکمیل کی طرف متوجہ کیا۔ مساجد کو مراکز علم بنایا، ان کی بنیاد پر بعد میں بڑے بڑے علمی ادارے وجود میں آئے اور علم کی دنیا میں عظیم انقلاب رونما ہوا۔ مسلمانوں کے اندر مختلف دینی اور سماجی علوم کے ماہرین پیدا ہوئے اور صدیوں تک دنیائے علم پر ان کی حکم رانی رہی۔ آج بھی آپ کی تعلیمات پر عمل ہو تو آپ کی امت کے ہاتھ میں علمی قیادت ہوگی اور ہر محاذِ علم پر دنیا کی صحیح راہ نمائی ہو سکے گی۔ یہ سب اس نبیِ امی کا احسان ہے، جس سے دنیا کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم۔ مع فتح الباری: ۱/ ۱۴۰

(سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، جنوری - مارچ ۱۹۸۷ء)

☆☆☆

اصحابِ صفہ
(تعلیمی اور معاشی جائزہ)

صفہ کی تعریف اور تعیین

صفہ دراصل مسجدِ نبوی سے متصل اس جگہ کو کہا جاتا ہے، جسے چھپر ڈال کر رہائش کے قابل بنا دیا گیا تھا۔ یہاں وہ غریب اور نادار مسلمان قیام کرتے جن کا مدینہ میں گھر دار نہیں تھا۔ عربی کے مشہور لغت لسان العرب میں صفہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

الصفة هو موضع مظلّل كان ياوى اليه المساكين[1]	صفہ وہ سایہ دار جگہ ہے جہاں مساکین رہا کرتے تھے۔

علامہ ابن اثیر نے اصحاب صفہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

هم فقراء المهاجرين ومن لم يكن لـه منزل يسكنه فكانوا يأوون الى موضع مظلّل فى مسجد المدينة يسكنونه[2]	اس سے مراد فقراء مہاجرین اور وہ لوگ ہیں جن کے پاس رہنے کے لیے گھر نہیں تھا۔ یہ سب لوگ مسجد نبوی میں ایک سایہ دار جگہ میں سکونت اختیار کرتے تھے۔

ایک حدیث میں حضرت طلحہ بصریؓ، جو خود بھی مہاجر تھے، فرماتے ہیں:

---

[1] ابن منظور: لسان العرب، مادہ ص،ف،ف
[2] ابن اثیر: النہایۃ فی غریب الحدیث ۲/ ۲۶۷

كان الرجل منا اذا قدم المدينة فكان له بها عريف نزل على عريفه و ان لم يكن له عريف نزل الصفة[1]

ہم میں سے کوئی شخص مدینہ آتا اور وہاں اس کا کوئی واقف کار ہوتا تو وہ اس کے ہاں ٹھہرتا اور جس کا کوئی واقف کار نہ ہوتا وہ صفہ میں قیام کرتا۔

یہ صفہ مسجد نبوی کے پچھلے حصہ میں شمال کی طرف تھا۔[2]

اصحابِ صفہ کی تعداد

اصحابِ صفہ کی تعداد کا ٹھیک ٹھیک تعین مشکل ہے۔حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اصحابِ صفہ میں ستر (۷۰) افراد کو اس حال میں دیکھا ہے کہ ان کے پاس تن ڈھکنے کے لیے پورا لباس نہیں تھا۔(عرب کے رواج کے مطابق دو چادروں میں سے) اوپر کی چادر تو نہیں ہوتی تھی، البتہ صرف تہ بند یا ایک کپڑا ہوتا، جسے وہ اوپر کرکے اپنی گردن میں باندھ لیتے تھے۔مختصر ہونے کی وجہ سے وہ ان کی پنڈلیوں کے نصف تک پہنچ پاتا تھا۔یہ لوگ اپنے اس کپڑے کو سمیٹ کر نماز پڑھتے تھے تاکہ بے ستری نہ ہو۔[3]

حضرت ابوہریرہؓ کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اصحاب صفہ کی تعداد ایک وقت ستر (۷۰) سے زیادہ تھی۔حضرت ابو ہریرہؓ سن ۶ ھ میں اسلام لائے۔یہ اس کے بعد کا ذکر ہے۔اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس سے پہلے کب اور کتنے افراد نے صفہ میں قیام کیا۔[4]

---

[1] حاکم، المستدرک: ۳ / ۱۵

[2] ابن تیمیہ مجموع الفتاویٰ: ۱۱ / ۳۸، طبع جدید

[3] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب نوم الرجال فی المساجد

[4] امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اصحابِ صفہ کی تعداد ہمیشہ ایک نہیں رہی، بلکہ وقتاً فوقتاً بڑھتی گھٹتی رہی ہے۔کبھی یہ دس یا اس سے بھی کم ہو جاتے تھے،کبھی بیس،تیس اور اس سے بھی زیادہ ہو جاتے تھے،کبھی ان کی تعداد ساٹھ، ستر تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ ان کی مجموعی تعداد چار سو، =

حصولِ علم کی ترغیب

اصحابِ صفہ کو مسجد نبوی سے بالکل متصل قیام کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ کے ارشادات کو براہ راست سننے اور آپ کی ہدایات سے استفادہ کے بظاہر دوسروں سے زیادہ مواقع حاصل تھے۔ ذیل کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی ان کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص توجہ فرماتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ ان کے سامنے علم دین کی اہمیت واضح فرماتے اور اس کے سیکھنے سکھانے کی ترغیب دیتے۔ چناں چہ حضرت عقبہ بن عامرؓ بیان فرماتے ہیں کہ ہم مسجدِ نبوی کے صفہ میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور (قرآن کی ایک ایک آیت سیکھنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے) فرمایا: تم میں سے کون چاہتا ہے کہ بطحان یا عقیق (مدینہ سے قریب ہی دو وادیوں کے نام ہیں) جائے اور کسی گناہ یا قطعِ رحم کا ارتکاب کیے بغیر بڑے بڑے کوہانوں والی دو اونٹنیاں لے کر آئے۔ ہم نے عرض کیا: حضور! یہ تو ہم

= بلکہ اس سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے ان سب کے نام جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں شیخ ابوعبدالرحمٰن السلمی کی کتاب تاریخ اہل الصفۃ نمایاں ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے شیخ کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک محدث کی حیثیت سے بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ فتاویٰ ابن تیمیہ ۱۱/۴۱-۴۲۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ابوعبدالرحمٰن السلمی سے پہلے ابوسعید بن الاعرابی نے اصحاب صفہ کے نام جمع کیے تھے۔ موخر الذکر نے اپنی کتاب میں ان ہی کے نہج کو اپنایا اور بعض ناموں کا اضافہ کیا۔ ان کے بعد ابونعیم نے 'حلیۃ الاولیاء' کے شروع میں ان دونوں کتابوں کو جمع کر دیا ہے۔ فتح الباری: ۱۱/۲۲۵۔ نیز ملاحظہ ہو: ۱/۳۶۱۔ حاکم نے مستدرک میں ۳۶/ اصحاب صفہ کے نام دیے ہیں۔ ان میں حضرت ابوعبیدہؓ، عمار بن یاسرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، بلال بن رباحؓ اور حضرت خبابؓ جیسے اکابر صحابہ بھی ہیں۔ (ملاحظہ ہو المستدرک: ۳/۱۸) ابھی حال ہی میں ایک مخطوطہ کسی نامعلوم مصنف کا شائع ہوا ہے۔ اس میں اصحاب صفہ کے ۱۰۸/ نام درج ہیں۔ اس مخطوطہ کے محشّی نے تین ناموں کا اور اضافہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو نشرۃ الجامعۃ السلفیۃ بنارس، فروری ۱۹۸۷ء۔ ظاہر ہے، یہ تعداد بھی اوپر کے اندازے سے بہت کم ہے۔

میں سے ہر شخص چاہے گا۔آپ نے فرمایا:

افلا یغدو احدکم الی المسجد فیعلم او یقرء اٰیتین من کتاب اللّٰہ خیر لہ من ناقتین و ثلاث خیر لہ من ثلاث و اربع خیر لہ من اربع ومن اعدادھن من الاِبل[۱]

ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ تم میں سے کوئی شخص مسجد جائے اور کسی کو تعلیم دے یا اللہ کی کتاب سے خود دو آیتیں پڑھے، یہ اس کے حق میں دو اونٹنیوں سے بہتر ہے، تین آیتوں کا پڑھنا تین اونٹنیوں سے اور چار آیتوں کا پڑھنا چار اونٹنیوں سے، بلکہ جتنی آیتیں وہ پڑھے گا اتنی اونٹنیوں سے بہتر ہے۔

مطلب یہ کہ قرآن مجید کی چند آیتوں کا پڑھنا اور پڑھانا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے زیادہ گراں بہا اور قیمتی ہے۔

آخرت کی کام یابی کی بشارت

اصحاب صفہ نہایت عسرت اور تنگ دستی کی زندگی گزارتے تھے۔آپ انہیں صبر کی تلقین فرماتے اور اجر و ثواب کی خوش خبری سناتے۔حضرت فضالہ بن عبیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھاتے تو اصحابِ صفہ بھوک کی نقاہت کی وجہ سے گر پڑتے۔ان کی یہ حالت دیکھ کر بدوی سمجھتے کہ ان پر جنوں کا اثر ہے۔رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ان کی طرف متوجہ ہوتے اور فرماتے:

لو تعلمون ما لکم عند اللّٰہ لَاحببتم ان تزدادوا فاقۃ و حاجۃ[۲]

اگر تمہیں یہ معلوم ہوجاتا کہ اللہ کے پاس تمہارے لیے کیسی کچھ نعمتیں ہیں تو چاہتے کہ تمہارا فقر و فاقہ اور بھی بڑھ جائے۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ آج اصحاب ثروت آرام اور راحت کی زندگی گزار رہے ہیں اور تم تکلیفیں برداشت کر رہے ہو،لیکن قیامت کے روز جنت کی آسائشیں ان

۱۔ مسلم، فضائل القرآن، باب فضل قرأۃ القرآن فی الصلوۃ، الخ

۲۔ ترمذی، ابواب الزہد، باب ما جاء فی معیشۃ اصحاب النبیؐ۔ مسند احمد: ۶/ ۱۸-۱۹

کے حصہ میں بہت بعد میں آئیں گی اور تم ان سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جاؤ گے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ضعفاء مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا[1] ان کی غربت کا یہ عالم تھا کہ کسی کے پاس پورا تن ڈھانکنے کے لیے کپڑے نہیں تھے۔ بے ستری سے بچنے کے لیے سب ایک دوسرے کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک قاری ہمیں قرآن سنا رہے تھے۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ قاری نے فوراً سکوت اختیار کر لیا۔ آپؐ نے سلام فرمایا۔ دریافت کیا کہ تم لوگ کیا کر رہے تھے؟ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ) یہ ہمارے قاری ہیں، جو قرآن سنا رہے تھے اور ہم سن رہے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

الحمد للّٰه الذی جعل من امتی من امرت ان اصبر نفسی معهم	اللہ کا شکر ہے، اس نے میری امت میں ایسے افراد پیدا فرمائے کہ مجھے ان کے ساتھ جمے رہنے کا حکم دیا گیا۔

اس کے بعد آپ مساوات برتتے ہوئے ہم لوگوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ پھر اشارہ سے فرمایا کہ تم لوگ حلقہ بنالو۔ اس سے سب حضرات آپ کے سامنے ہو گئے۔ میرے خیال میں آپ نے میرے علاوہ کسی کو پہچانا نہیں۔ آپ نے فرمایا:

ابشروا یا معشر صعالیک المهاجرین بالنور التام یوم القیامة، تدخلون الجنة قبل اغنیاء الناس بنصف یوم و ذٰلک خمس مأة سنة[2]	اے فقراء مہاجرین! تمہارے لیے قیامت کے دن پورے نور کی بشارت ہے۔ تم دولت مندوں سے آدھا دن پہلے جنت میں جاؤ گے۔ یہ آدھا دن پانچ سو سال کے برابر ہوگا۔

---

[1] ضعفاء مہاجرین سے مراد بظاہر اصحاب صفہ ہیں۔ اس لیے کہ جیسا کہ اوپر ذکر آیا، ان کا مرکز صفہ ہی تھا۔ دوسرے یہ کہ خود ابوسعید خدریؓ گو مدنی تھے، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اصحاب صفہ میں شامل تھے۔ امام ذہبی کہتے ہیں: **یروی أن أبا سعید کان من اهل الصفة**۔ تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۴۱

[2] ابوداؤد، کتاب العلم، باب فی القصص

دنیوی فتح و نصرت کی خوش خبری

کبھی آپ یہ خوش خبری سناتے کہ تکلیف کے یہ دن جلد ہی ختم ہو جائیں گے اور فارس اور روم کی سلطنتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی۔ حضرت عرباض بن ساریہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کے پاس صفہ میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اس وقت ہم غربت کی وجہ سے مختصر سے لباس میں ہوتے[1]

آپؐ ارشاد فرماتے:

لو تعلمون ماذخر لکم ما حزنتم علی ما زوی عنکم و لیفتحنّ لکم فارس و الروم[2]	اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے کیا کچھ چھپا رکھا ہے تو آج تم جن چیزوں سے محروم ہو اس پر تمہیں غم نہ ہوگا اور وہ وقت ضرور آئے گا جب کہ فارس اور روم کے دروازے تمہارے لیے کھول دیے جائیں گے۔

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ حضرت طلحہ بصریؓ بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اصحاب صفہ کو روزانہ ایک مد (ایک پیمانہ) کھجوریں دو آدمیوں کے کھانے کے لیے عنایت فرماتے تھے۔ پہننے کے لیے کتان کا بہت ہی موٹا کپڑا عطا فرمایا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ ہم لوگوں کو لے کر آپ دن کی کوئی نماز ادا فرمائی۔ جب آپ سلام پھیر کر فارغ ہوئے تو اصحاب صفہ نے دائیں بائیں سے زور سے کہا کہ کھجوروں نے ہمارے پیٹ جلا کر رکھ دیے ہیں۔ (مطلب یہ کہ ان کے مسلسل استعمال کی وجہ سے معدہ میں اس قدر حدت ہو گئی ہے کہ ناقابل برداشت ہو رہی ہے)۔ یہ (موٹے) کپڑے بھی پھٹ رہے ہیں۔ یہ سن کر آپ منبر پر تشریف لے گئے۔

---

1. حدیث میں 'حوتکیہ' کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی مختصر لباس کے آتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ 'حوتک' نامی کسی شخص کی طرف یہ کپڑا منسوب ہو۔ (النہایۃ فی غریب الحدیث) لیکن اصحاب صفہ کے حالات کے پیش نظر پہلے ہی معنی قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں۔
2. مسند احمد: ۴/۱۲۵

حمد و ثنا کے بعد خود آپ کو دین کی راہ میں جو تکلیفیں اٹھانی پڑیں ان کا ذکر کیا۔اسی ذیل میں فرمایا کہ ایک وقت مجھ پر اور میرے ساتھی (غالباً حضرت بلالؓ مراد ہیں) پر وہ بھی گزرا ہے کہ دس سے زیادہ دنوں تک 'اراک'[۱] کے پھل کے علاوہ ہمارے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ہم اپنے بھائیوں انصار کے پاس آئے۔ان کی زیادہ تر غذا کھجور ہی ہے۔ انھوں نے اسی سے ہماری خدمت کی۔خدا کی قسم!اگر میں اس حیثیت میں ہوتا کہ تمھیں گوشت اور روٹی کھلا سکوں تو یہی پیٹ بھر کھلاتا۔ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ تمہارے سامنے صبح ایک برتن آئے گا اور شام کو دوسرا برتن۔(یعنی صبح ایک کھانا ہو گا اور شام کو دوسرا کھانا) اصحاب صفہ نے سوال کیا کہ کیا اس وقت ہم بہتر حالت میں ہوں گے یا آج ہم بہتر حالت میں ہیں۔آپ نے فرمایا: آج تم بہتر حالت میں ہو، اس لیے کہ تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔اس وقت باہم دشمن بن جاؤ گے اور ایک دوسرے کی گردن کاٹو گے۔[۲]

اس میں ایک طرف آپ نے دنیا کی فتح و کام رانی کی خوش خبری سنائی اور دوسری طرف اس کے بعد معاشرہ میں جو خطرناک رجحان ابھرے گا اس کا ذکر فرمایا،تا کہ اس سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

وعظ و تذکیر

اوس بن اوس حذیفہ ثقفیؓ ایک واقعہ کے ذیل میں بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں صفہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور آپ ہمیں واقعات سنا رہے تھے اور نصیحت فرما رہے تھے۔[۳]

---

۱ 'اراک' ایک خاردار درخت کا نام ہے۔ اس کے پتے اونٹ کی غذا کے کام آتے ہیں۔اس میں انگور کے خوشوں کی طرح پھل آتے ہیں۔

۲ رواہ الحاکم وقال الذہبی صحیح۔ المستدرک مع التلخیص: ۳/ ۱۵۔امام احمد نے یہ حدیث مختصراً روایت کی ہے۔مسند: ۳/ ۴۸۷۔

۳ مسند احمد: ۴/ ۸،۹۔

علمی سوال و جواب

ان مجلسوں میں، خیال ہوتا ہے کہ دین سے متعلق سوالات بھی ضرور ہوتے ہوں گے اور آپ ان کے جوابات بھی عنایت فرماتے ہوں گے۔اس کا ثبوت ابن الاسقع کی ایک روایت سے ملتا ہے ۔فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مہاجرین کے صفہ میں تشریف لائے۔ ایک شخص نے آپؐ سے سوال کیا کہ قرآن میں سب سے بڑی (عظمت والی) آیت کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا: آیت الکرسی۔[1]

صحابۂ کرام کے ذریعے سے تعلیم

جو صحابۂ کرام دین کا زیادہ علم رکھتے،معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض افراد اصحاب صفہ کو اس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ چناں چہ اسی نوعیت کا ایک واقعہ حضرت عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ میں اہلِ صفہ میں سے بعض لوگوں کو قرآن مجید اور کتابت کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ان میں سے ایک نے ایک کمان تحفہ کے طور پر مجھے دی۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا:

رجل اهدى اليّ قوساً ممن كنت اعلمه الكتاب و القرآن و ليست بمال فارمى عنها فى سبيل الله

جن لوگوں کو میں کتابت اور قرآن کی تعلیم دیا کرتا تھا ان میں سے ایک نے ایک کمان تحفہ میں مجھے دی ہے۔ اس کی کوئی مالی اہمیت نہیں ہے، لیکن میں اس کے ذریعہ سے اللہ کے راستے میں تیر اندازی کروں گا۔

یہ سن کر آپ نے فرمایا:

ان كنت تحبّ ان تطوّق طوقًا من النار فاقبلها[2]

اگر تم چاہتے ہو کہ آگ کا طوق تمہاری گردن میں ڈال دیا جائے تو اس ہدیہ کو قبول کر لو۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الحروف و القراءات

[2] ابوداؤد، کتاب البیوع، باب فی کسب العلم۔ ابن ماجہ، ابواب التجارات، باب الاجر علی تعلیم القرآن۔ فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم پر اجرت لی جا سکتی ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ اور بعض =

معاشی نظم

امت کے مہمان

اصحاب صفہ کا کوئی خاص ذریعۂ معاش نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ خود ان کی معاش کا نظم فرماتے اور دوسروں کو اس کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اصحاب صفہ کے معاش کی ذمہ داری اسلامی ریاست پر تھی یا سادہ لفظوں میں وہ پوری امت کے مہمان تھے[1] حضرت ابوہریرہؓ ان کے تعارف میں فرماتے ہیں:

أهل الصفة أضياف الاُسلام لاَ يأوون على أهل و لاَ مال ولاَ على احد، اذا أتته الصدقة بعث بها اليهم و اذا أتته هدية أرسل اليهم و أصاب منها و أشركهم فيها[2]

اہل صفہ (اہل) اسلام کے مہمان تھے۔ نہ تو ان کا گھر تھا نہ ان کے پاس مال تھا اور نہ وہ کسی کے گھر ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس کہیں سے کوئی صدقہ آتا تو ان کے پاس بھیج دیتے تھے (خود تناول نہ فرماتے)، لیکن اگر ہدیہ پیش ہوتا تو ان کے پاس بھیجتے، خود بھی تناول فرماتے اور ان کو بھی اس میں شریک فرما لیتے۔

= دوسرے ائمہ نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ بعض دوسری روایات کی بنیاد پر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اس روایت کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ عبادہ بن صامتؓ کو ہدیہ قبول کرنے سے غالبًا اس لیے منع کیا گیا کہ ان کے پیش نظر اس کا معاوضہ نہیں تھا، بلکہ وہ صرف اجر و ثواب کی نیت سے یہ خدمت انجام دے رہے تھے، لیکن اگر پہلے سے یہ معاوضہ طے ہو جاتا تو اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بعض حضرات کے نزدیک اگر کسی جگہ قرآن کی تعلیم دینے والا کوئی موجود نہ ہو تو قرآن جاننے والے پر اس کی تعلیم فرض ہو جائے گی۔ اس صورت میں اس کے لیے اجرت کا لینا صحیح نہیں ہے، لیکن اگر تعلیم کا نظم موجود ہو اور تعلیم دینا اس پر فرض نہ ہو تو وہ اجرت لے سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ خطابی، معالم السنن: ۳/۹۹-۱۰۰۔ فقہاء احناف میں متاخرین نے یہ محسوس کر کے کہ اگر اجرت نہ دی جائے تو قرآن مجید کی تعلیم ہی متاثر ہو جائے گی، اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھی جائے ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۵/۴۶-۴۸۔

[1] ترمذی کے الفاظ زیادہ واضح ہیں: کان اهل الصفة أضياف أهل الاُسلام۔ ابواب القیامۃ: ۲/۷۱

[2] بخاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی الخ۔ ترمذی، حوالہ سابق۔

رسول اللہ ﷺ کی خاص توجہ

حضرت ابوہریرہؓ نے ایک طویل واقعہ بیان کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عسرت اور تنگی کے باوجود، رسول اللہ ﷺ اصحاب صفہ کا کس قدر خیال فرماتے تھے۔ یہ واقعہ آپ کا ایک نمایاں معجزہ بھی ہے۔ فرماتے ہیں: خدا کی قسم، حالت یہ تھی کہ میں بھوک کی وجہ سے زمین پر گر پڑتا تھا اور پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتا تھا۔ ایک روز میں بھوک سے پریشان ہو کر لوگوں کی گزرگاہ میں بیٹھ گیا۔ حضرت ابوبکرؓ ادھر سے تشریف لائے تو میں نے ان سے ایک آیت کا مطلب پوچھا۔ اس سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ انھیں میری حالت کا اندازہ ہو جائے اور وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے جا کر کچھ کھلا دیں، لیکن انہوں نے میری اصل ضرورت محسوس نہیں کی اور روانہ ہو گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ جب حضرت عمرؓ کا وہاں سے گزر ہوا تو میں نے ان سے بھی اسی مقصد کے تحت آیت کا مطلب دریافت کیا۔ انہیں بھی میری ضرورت کا احساس نہ ہو سکا اور وہ آگے بڑھ گئے۔ (بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا مفہوم بیان کر کے یہ حضرات خاموش ہو گئے) لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فوراً محسوس فرما لیا کہ میں بھوک سے پریشان ہوں۔ فرمایا: ابوہریرہ میرے ساتھ چلو۔ میں چل پڑا۔ آپ گھر کے اندر تشریف لے گئے اور اجازت لے کر میں بھی داخل ہوا۔ آپ نے دیکھا، دودھ کا ایک پیالہ رکھا ہوا ہے۔ دریافت فرمایا: یہ کہاں سے آیا ہے؟ گھر والوں نے جواب دیا: فلاں صاحب یا صاحبہ نے آپ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا ہے۔ آپ نے مجھ سے فرمایا: ابوہریرہ جاؤ، اصحاب صفہ کو بلا لاؤ۔ یہ بات اس وقت مجھے اچھی نہیں لگی۔ میں نے سوچا کہ اس تھوڑے سے دودھ کا اصحاب صفہ کے درمیان کیا ہو گا؟ اس وقت تو مجھے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ بہرحال آپ کے حکم کی تعمیل میں اصحاب صفہ کو بلا لایا۔ جب سب آ گئے اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو آپ نے مجھ سے فرمایا کہ دودھ ان کو پیش کرو۔ میں ان میں سے ایک ایک کو یہ پیالہ دیتا جاتا تھا اور وہ پوری طرح سیراب ہو کر پیالہ میرے حوالے کر دیتا تھا۔ جب سب

لوگ پی چکے تو پیالہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ پیالہ ہاتھ میں لے کر آپ مسکرائے اور فرمایا۔اب ہم اور تم دو باقی رہ گئے ہیں۔ بیٹھو اور پیو۔ میں نے بھی اسی میں سے پیا۔ آپ نے فرمایا اور پیو، میں نے اور پیا۔ آپ یہی فرماتے رہے اور پیو۔ میں نے عرض کیا۔ اب تو بالکل گنجائش نہیں ہے۔ آپ نے پیالہ ہاتھ میں لیا اور جو دودھ بچا تھا وہ نوش فرمالیا[1]

حضرت ابوہریرہؓ غالباً اصحابِ صفہ ہی کا ذکر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ لوگ ـــ ایک روایت میں ہے کہ ان کی تعداد سات تھی ـــ بھوکے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک ایک کھجور عنایت فرمائی[2]

انصارِ مدینہ کو ہدایت

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ انصار مدینہ کو حکم فرماتے تھے کہ وہ ان کی میزبانی کریں اور انہیں کھانا کھلائیں۔حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رات ہوتی تو رسول اللہ ﷺ انصار میں سے ایک ایک کے ساتھ اصحاب صفہ میں سے دو ایک کو روانہ فرما دیتے، تاکہ اپنے ساتھ انہیں کھانا کھلائیں اور خود رسول اللہ ﷺ گھر پر جو کچھ موجود ہوتا طلب فرماتے اور اصحاب صفہ میں سے جو رہ جاتے ان کے ساتھ تناول فرماتے[3]

مدینہ کی خاص پیداوار کھجور تھی۔ یہ اہل مدینہ کی ایک عام غذا بھی تھی۔انصار حسب حیثیت کھجور کے خوشے لاکر مسجد نبوی میں لٹکا دیا کرتے تھے۔ یہ اصحاب صفہ کے کام آتے۔روایت میں آتا ہے:

كان اهل الصفة ليس لهم طعام	اہل صفہ کے لیے کھانا نہیں ہوتا تھا۔ ان
فكان احدهم اذا جاع أتى الى القنو	میں سے جب کسی کو بھوک لگتی تو وہ اسی خوشہ

---

[1] بخاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبیؐ الخ۔ ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ ۲/ ۷۱۔

[2] ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ: ۲/ ۷۰۔ ابن ماجہ، ابواب الزہد، باب معیشۃ اصحاب النبیؐ۔

[3] حافظ ابن حجرؒ نے اس مفہوم کی کئی ایک روایتیں نقل کی ہیں۔ فتح الباری ۱۱/ ۲۲۵

فضربه بعصاه فيسقط البسر و التمر فياكل

کے پاس آتا اور اپنی چھڑی سے مار کر جو کچی پکی کھجوریں گرتیں وہ کھا لیتا۔

بعض لوگ جنھیں اس طرح کے امور خیر سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی، ان سے بے احتیاطی بھی ہو جاتی تھی۔ وہ خراب قسم کی کھجوریں لاکر ٹانک دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نصیحت فرمائی:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿٢٦٧﴾

(البقرۃ:۲۶۷)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین میں سے تمہارے لیے نکالا ہے اس میں سے بہتر حصہ راہ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بری سے بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو حالاں کہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے تو تم ہرگز اسے لینا گوارا نہ کرو الاّیہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ، تمہیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے۔

اس تعلیم کے بعد لوگ بہتر سے بہتر چیز اصحاب صفہ کو پیش کرتے تھے[۱]

انصار میں وہ غریب اور نادار اصحاب بھی تھے جو قرآن کے ماہر تھے اور محنت مشقت کر کے اصحاب صفہ کی خدمت کرتے تھے۔ اس کا کچھ حال حضرت انسؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے، جس میں انہوں نے ان ستر (۷۰) قاریوں کا ذکر کیا ہے جو بئر معونہ کے حادثہ میں شہید ہوئے تھے۔ فرماتے ہیں:

جاءَ الناس الى النّبىﷺ فقَالوا ان ابعث معنًا رِجالاً يعلمون القراٰن و السنة فبعث اليهم سبعين رجُلاً

کچھ لوگ نبیﷺ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ آپ کچھ ایسے افراد کو، جو قرآن وسنت کی تعلیم دیں[۲] ہمارے ساتھ بھیجیں۔ آپ نے

۱۔ ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ۔

۲۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قبائل نے دشمن کے خلاف مدد طلب کی تھی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری: ۷/ ۲۷۰-۲۷۱

من الْانصار يقال لهم القرّاء، فيهم خالي حرام، يقرؤن القرآن و يتدارسون باللّيل يتعلّمون و كانوا بالنهار يجيئون بالماء فيضعونه في المسجد و يحطبون فبيعونه و يشترون به الطعام لِأهل الصّفة و للفقراء

انصار میں سے ستر آدمیوں کو، جنھیں (قرآن کے عالم ہونے کی وجہ سے) قاری کہا جاتا تھا، ان کے ساتھ بھیجا۔ ان ہی میں میرے ماموں حرام بھی تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ رات میں قرآن پڑھتے ،ایک دوسرے کو سناتے (مذاکرہ کرتے)اور سیکھتے تھے اور دن میں باہر سے مسجد میں پانی لا کر رکھتے، لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور بیچتے،جو آمدنی ہوتی اس سے اہل صفہ اور فقرا کے لیے کھانا خرید کر لاتے۔

رسول اللہ ﷺ کو اس حادثہ کا شدید صدمہ پہنچا اور آپ نے ایک ماہ تک نماز فجر میں دعاء قنوت پڑھی اور ان مجرم قبائل کے لیے بد دعا فرمائی۔[1]

قرآن مجید میں ان انصار صحابہ کی مہارت، ہوسکتا ہے صفہ سے مستقل تعلق اور استفادہ ہی کا نتیجہ ہو۔

مہاجرین کا تعاون

مہاجرین بھی اپنی طاقت کی حد تک اصحاب صفہ کی خدمت کیا کرتے تھے۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کو مساکین سے بڑی ہمدردی تھی۔ رسول اللہ ﷺ انہیں 'ابوالمساکین'فرماتے تھے۔ وہ اصحاب صفہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں بھوک پیاس کی تکلیف برداشت کر کے بھی رسول اللہ ﷺ کا فیضِ صحبت حاصل کرتا تھا۔ بھوک کی وجہ سے کبھی زمین سے چپک کر پڑ جاتا تھا۔کسی سے کسی آیت کا مطلب اس خیال سے دریافت فرماتا کہ وہ میرا مقصد بھانپ جائے اور مجھے ساتھ لے جا کر کھانا کھلائے۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سے جب اس قسم کا سوال کرتا تو وہ پہلے مجھے اپنے ساتھ لے جاتے اور اپنی بیوی سے کہتے: اسماء! کچھ ہمیں کھلاؤ۔

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الرجيع۔ مسلم، كتاب الْإمارة، باب ثبوت الجنة للشهيد و اللفظ لمسلم۔

اس کے بعد وہ آیت کا مطلب بھی بیان کرتے۔ بعض اوقات وہ ہم لوگوں کو اپنے ساتھ گھر لے جاتے، وہاں کچھ نہ ہوتا تو گھی کی خالی کُپّی توڑ کر سامنے رکھ دیتے۔ اسی کو ہم چاٹ لیا کرتے تھے[۱]

اس سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کا ایک بہت ہی مؤثر واقعہ بخاری اور دیگر کتب حدیث میں مذکور ہے۔ اس سے اس نظم پر بھی روشنی پڑتی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اصحابِ صفہ کے سلسلے میں فرمایا تھا۔ حضرت عبد الرحمٰن بن ابوبکرؓ فرماتے ہیں:

إن أصحاب الصفة كانوا أناسا فقراء و إن النبي ﷺ قال من كان عنده طعام اثنين فليذهب بثالث و ان أربع فخامس او سادس	اصحاب صفہ فقرا تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا جس کے ہاں دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے کو ان میں سے لے جائے اور چار آدمیوں کا کھانا ہو تو پانچواں یا چھٹا ان میں سے لے جائے۔

اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہمارے والد ابوبکرؓ اپنے ساتھ تین آدمیوں کو اپنے گھر لے آئے اور خود رسول اللہ ﷺ دس افراد کو اپنے ہم راہ لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نماز عشاء سے فارغ ہونے کے بعد گھر یہ تاکید کر کے کہ مہمانوں کو کھانا کھلا دیا جائے، کسی ضرورت سے نبی ﷺ کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ کافی تاخیر سے ان کی واپسی ہوئی۔ انہوں نے دیکھا کہ مہمانوں نے کھانا نہیں کھایا ہے تو گھر والوں پر برہم ہونے لگے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ تو ڈر سے ایک کونے میں چھپ گئے، لیکن بیوی نے بتایا کہ مہمانوں نے آپ کے بغیر کھانا کھانے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے براہ راست ان سے کھانا کھا لینے کی درخواست کی، لیکن انہوں نے اس وقت بھی یہی کہا کہ ہم آپ ہی کے ساتھ کھائیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ (غصہ کی حالت میں تھے) قسم کھا کر کہا: میں اس وقت نہیں کھاؤں گا، لیکن مہمانوں کا اصرار بڑھا تو قسم کا کفارہ ادا کیا اور کھانے میں شریک ہوگئے۔ کھانے میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت عطا فرمائی کہ مہمانوں کے کھانے کے بعد بھی جوں کا توں بچا رہا، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا۔ صبح یہ کھانا رسول اللہ ﷺ

۱؎ بخاری و ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب جعفر بن ابی طالب

کی خدمت میں بھیجا گیا تو بہت سے لوگوں کو کھلایا گیا۔[1]

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ دو ایک اصحاب صفہ کو اپنے ساتھ لے جا کر کھانا کھلانے کی ہدایت انصار اور مہاجرین میں سب ہی صاحب حیثیت افراد کو تھی۔

ریاست کی آمدنی میں اصحاب صفہ کا حق

رسول اللہ ﷺ کے پاس جو مال غنیمت وغیرہ جمع ہوتا تھا اس میں آپ اصحاب صفہ کی ضروریات کو مقدم رکھتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ گھر کے لیے پانی بھرتے بھرتے سینہ میں درد ہو جاتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا کہ چکی چلانے سے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ اس وقت قیدی آئے ہیں۔ خدمت کے لیے ان میں سے ایک غلام عنایت فرمایا جائے۔ آپ نے جواب دیا۔

و اللّٰہ لَا اعطیکما و احرم اهل الصفة تطوی بطونهم لَا اجد ما انفق علیهم و لٰکنی ابیعهم و انفق علیهم اثمانهم

قسم خدا کی، یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تمہیں خادم فراہم کر دوں اور اصحاب صفہ کو جن کے پیٹ فاقہ سے پچکے پڑے ہیں، محروم کر دوں۔ میں غلاموں کو فروخت کر کے ان کی قیمت اصحاب صفہ پر خرچ کروں گا۔

پھر آپ ان کے گھر تشریف لے گئے اور انہیں سوتے وقت تسبیح پڑھنے کا حکم دیا۔ فرمایا: یہ تسبیح تمہارے لیے غلام سے بہتر ہے۔ (یہی تسبیح "تسبیح فاطمہؓ" کے نام سے مشہور ہے۔)[2]

---

[1] بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب الصبر مع الاہل و الضیف۔

[2] مسند احمد: ۱/۱۰۶-۱۰۷۔ امام بخاری نے بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے، البتہ اصحاب صفہ کا ذکر ترجمۂ باب میں کیا ہے: کتاب فرض الخمس، باب الدلیل علی ان الخمس لنوائب رسول اللّٰہ ﷺ و المساکین و ایثار النبیؐ اهل الصفة والارامل حین سالته فاطمة و شکت الیه الطحن و الرحیٰ ان یخدمها من النبی فوکلها الی اللّٰہ۔

عام صدقات و خیرات

عام صحابہ بھی صدقات و خیرات میں اصحاب صفہ کا خیال رکھتے تھے۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ حضرت حسنؓ کی پیدائش کے بعد رسول ﷺ نے فرمایا کہ ان کے سر کے بال اتروا کر اس کے وزن کی چاندی صدقہ کر دی جائے۔ چنانچہ یہ رقم اصحاب صفہ پر خرچ کی گئی۔ حضرت امام حسینؓ کی پیدائش پر بھی اس پر عمل ہوا[1]

معاشی حالت بتدریج بہتر ہوتی چلی گئی

مسجد نبوی کے اس صفہ میں غریب و نادار صحابہ قیام فرماتے تھے۔ان کا قیام حسب حالات مختصر یا طویل ہوتا تھا۔لیکن غالباً ان میں سے کسی کا بھی وہاں مستقل قیام نہیں رہا۔امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں جو مہاجرین آتے، ان میں غریب بھی ہوتے اور دولت مند بھی، بیوی بچوں والے بھی ہوتے اور بے شادی شدہ بھی۔ان میں سے جس کسی کو رہائش کی سہولت نہ ہوتی وہ یہاں قیام کرتا تھا۔سارے اہلِ صفہ ایک ہی وقت میں یہاں جمع نہیں ہو گئے تھے۔ ان میں سے جس کی شادی ہو جاتی وہ بیوی کے ساتھ دوسری جگہ رہتا ،یا جسے مکان کی سہولت حاصل ہو جاتی وہ وہاں منتقل ہو جاتا۔اس طرح ان کی آمد ورفت جاری رہتی تھی۔کبھی تعداد بڑھ جاتی اور کبھی گھٹ جاتی[2]

اسی طرح ان میں سے بعض تبلیغی مقاصد کے لیے بھیجے گئے، بعض نے جہاد میں شرکت کی اور بعض نے حکومت کے مناصب اور ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اسلامی ریاست کے استحکام کے ساتھ ان کی معاشی حالت بھی بہتر ہوتی چلی گئی۔ حضرت ابوہریرہؓ، جو اصحابِ صفہ میں بہت نمایاں ہیں اور جنہوں نے ان کے زیادہ تر حالات بیان کیے ہیں، بعد کے دور میں نسبتاً خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ ایک مرتبہ کتان کا رنگین جوڑا

---

۱ مسند احمد:۶/ ۳۹۰-۳۹۱

۲ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۱/ ۴۱

پہنے چادر کے ایک کنارے سے ناک صاف کر رہے تھے۔ انہیں اپنا پرانا زمانہ یاد آ گیا اور ساتھیوں سے اس کا ذکر کیا[1]

اسلامی ریاست کے استحکام کے بعد اصحاب صفہ کی معاشی حالت میں جو فرق رونما ہوا اس کا جائزہ خود ایک مستقل موضوع ہے۔اس پر الگ سے تحقیق کی ضرورت ہے۔

اصحاب صفہ کا مقام و مرتبہ

اصحاب صفہ کے متعلق بعض حلقوں میں اس طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں کہ صفہ ہی میں ان کا مستقل قیام ہوتا تھا،صرف طبعی ضروریات ہی کے لیے وہ باہر نکلتے تھے، فقر و فاقہ ان کی پہچان تھا،کسب معاش کا کوئی طریقہ انہوں نے نہیں اپنایا۔ کاسۂ گدائی ان کے ہاتھوں میں ہوتا۔ ان پر وجد اور بے خودی کی کیفیت طاری رہتی، اس کے لیے وہ نغمہ وسرور سے کام لیتے۔ وہ دوسرے صحابۂ کرام سے افضل تھے۔

امام ابن تیمیہؒ نے اس طرح کے خیالات کی سخت تردید کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اہل صفہ کسب معاش کے لیے سعی کرتے تھے۔ جب اس کے مواقع نہ ہوتے تو ان کی حیثیت 'ضیوف اسلام' کی ہوتی اور رسول اللہ ﷺ اپنی طرف سے جو ممکن ہوتا، ان کے کھانے پینے کا نظم فرماتے۔ بیش تر حالات میں وہ اپنی ضروریات پوری نہیں کر پاتے تھے، اس لیے ان کی مدد کی جاتی تھی۔

جہاں تک سوال کرنے کا تعلق ہے صریح احادیث موجود ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے شدت سے منع فرمایا ہے۔ ہاں آدمی حکومت سے مطالبہ کرسکتا ہے کہ اس کی ضروریات کی تکمیل کرے، یا ایسے صاحبِ ثروت کے سامنے اپنی حاجت رکھ سکتا ہے جو نیک اور صالح ہوں، عام گداگری کی اجازت نہیں ہے۔ اہلِ صفہ ہوں یا دوسرے صحابہ کرام، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو سوال کرتا پھرتا ہو یا زنبیل لیے گھومتا ہو۔

---

[1] بخاری، کتاب الاعتصام، باب ما ذکر النبیؐ وحض علی اتفاق اھل العلم الخ۔ ترمذی، ابواب الزہد، باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبیؐ

یہ خیال غلط ہے کہ اصحاب صفہ کسی دوسرے دینی کام کے لیے بھی باہر نہیں نکلتے تھے۔رسول اللہ ﷺ کے غزوات میں دوسرے صحابہ کرامؓ کے ساتھ اہلِ صفہ نے بھی شرکت کی اور جہاد میں حصہ لیا۔

یہ کہنا کہ صحابۂ کرام میں سب سے اونچا مقام اہلِ صفہ کا تھا، سراسر غلط اور گم راہی ہے۔ اس امت میں سب سے زیادہ فضیلت خلفاء اربعہ: حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کو حاصل ہے۔ ان کے بعد عشرۂ مبشرہ کا مقام ہے۔ ان میں سے کوئی اہلِ صفہ میں سے نہیں تھا، سوائے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے کہ انہوں نے صفہ میں چند دن قیام کیا تھا۔ عشرۂ مبشرہ کے بعد اصحابِ بدر کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے۔ ان میں بعض اہلِ صفہ بھی تھے۔

یہ بات کہ ان کی مجلسوں میں نغمات پڑھے جاتے تھے، وہ دف وغیرہ استعمال کرتے تھے اور ان پر وجد و سرور اور بے خودی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، بلکہ صحابہ و تابعین میں سے کسی سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔[1]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔فتاویٰ ابن تیمیہ، جلد ۱۱ ص ۳۷ تا ۶۰ اور آگے۔

(سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، اکتوبر-دسمبر ۱۹۸۷ء)

☆☆☆

کتابیات

کتاب میں جہاں قرآن مجید کی آیات آئی ہیں، ان کے نیچے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کے علاوہ جن کتبِ مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے، حواشی میں ان کے نام، جو کتاب ایک سے زیادہ جلدوں میں ہے اس کی جلد اور صفحات کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہاں موضوع کے لحاظ سے کتاب اور مصنف کا پورا نام، سنِ وفات اور کتاب کے پیشِ نظر نسخے کے مطبع اور سنِ طباعت کی تفصیل دی جا رہی ہے۔ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب و ابواب کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں، ان کے مطابع وغیرہ کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

۱- قرآن مجید: منزل من اللّٰه

تفسیر

۲- آلوسی: شهاب الدین السید محمود البغدادی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی، ادارة الطباعة المنیریة مصر/ دار الکتب العلمیة، بیروت لبنان، ۱۹۹۴ء

۳- ابن عطیة: ابو محمد عبد الحق بن غالب بن عبد الرحمن بن عطیة الاندلسی الغرناطی، المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، من مطبوعات دولة قطر، ۲۰۰۷ء

۴- ابن کثیر: ابو الفداء عماد الدین اسماعیل بن کثیر الدمشقی، تفسیر القرآن العظیم، تحقیق: الدکتور سید محمد السید وغیره۔ دار المعرفة بیروت ۱۹۹۲ء، دار الحدیث القاهرة، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء

۵- بیضاوی: القاضی ناصر الدین عبد الله بن عمر البیضاوی الشافعی، انوار التنزیل و اسرار التاویل (تفسیر بیضاوی) دار الکتب العلمیة بیروت، لبنان ۱۹۸۸ء۔

۶- خازن: علاؤ الدین علی بن محمد بن ابراهیم البغدادی، لباب التاویل فی معانی التنزیل (تفسیر خازن) مطبعة التقدم العلمیة مصر، ۱۳۴۹ھ/ دار الکتب العلمیة بیروت لبنان، ۱۹۹۵ء۔مع لباب التاویل فی معانی التنزیل للبغوی۔

۷- رازی: فخر الدین محمد بن عمر بن الحسین بن الحسن بن علی التمیمی البکری الرازی الشافعی، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) المطبعة العامرة الشرفیة مصر، ۱۳۰۸ھ، دار الکتب العلمیة بیروت، لبنان، ۱۹۹۰ء۔

۸- رشید رضا: تفسیر القرآن الکریم (تفسیر المنار) دار المنار مصر، ۱۳۶۵ھ

۹- زمخشری: ابو القاسم جار الله محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، مطبع مصطفی البابی الحلبی مصر، ۱۹۷۳ء

۱۰- طبری: ابو جعفر محمد بن جریر، جامع البیان عن تاویل آی القرآن، المطبعة الکبریٰ مصر کے قدیم نسخہ ۱۳۲۹ھ کی نئی طباعت دار المعرفة، بیروت، لبنان ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء۔
طبع جدید: مطبع بیروت ۱۹۷۸ء، تحقیق: محمود محمد شاکر، احمد محمد شاکر، دار المعارف مصر، ۱۹۶۹ء۔ ابتدائی ۱۶/ جلدیں پیش نظر ہیں۔
۱۱- قرطبی:ابو عبد الله محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الانصاری القرطبی، الجامع لاحکام القرآن،الهیئة المصریةالعامة ۱۹۸۷ء/دار الکتب العلمیة بیروت، لبنان ۱۹۸۸ء
۱۲- ماوردی: ابو الحسن علی بن حبیب البصری، النکت والعیون (تفسیر الماوردی)، تحقیق: خضر محمد خضر، مطابع المقهوی الکویت ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء

حدیث

۱۳- ابن عبد البر، ابو عمر یوسف بن عبد الله بن محمد القرطبی المالکی، جامع بیان العلم و فضله، دار الکتب الاسلامیة القاهرة، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء
۱۴- ابن ماجه: ابو عبد الله محمد بن یزید بن عبد الله القزوینی، سنن ابن ماجه
۱۵- ابو داؤد: سلیمان بن اشعث السجستانی، سنن ابی داؤد۔
۱۶- احمد بن حنبل الشیبانی، المسند، المطبعة المیمنیة، مصر ۱۳۱۳ھ۔
شرح و تحقیق: احمد محمد شاکر، دار المعارف مصر ۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۹ء۔ نامکمل۔ ابتدائی بیس جلدیں پیش نظر ہیں۔دار اِحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان ۱۹۹۴ء
۱۷- بخاری: ابو عبد اللّٰہ محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللّٰہﷺ و سننه و ایامه (صحیح بخاری)۔
۱۸- بیهقی: ابو بکر احمد بن الحسین بن علی، شعب الایمان۔ دائرة المعارف النظامیة، حیدر آباد دکن
۱۹- ترمذی: ابو عیسٰی محمد بن عیسٰی، جامع الترمذی۔
۲۰- حاکم: ابو عبد اللّٰہ محمد بن عبد اللّٰہ النیسا بوری، المستدرک علی الصحیحین، دائرة المعارف العثمانیة، حیدر آباد دکن، ۱۳۳۴ھ
۲۱- خطیب: ولی الدین محمد بن عبد الله الخطیب التبریزی، مشکاة المصابیح، تحقیق: سعید محمد اللحام، دار الفکر بیروت لبنان ۱۹۹۱ء
۲۲- دارمی: عبد اللّٰہ بن عبد الرحمن الدارمی السمرقندی، سنن الدارمی، تحقیق: فؤاد احمد الزمری، خالد السبع العلمی، دار الکتاب العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء
۲۳- سخاوی: شمس الدین ابو الخیر محمد بن عبد الرحمن بن محمد بن ابی بکر بن عثمان بن محمد السخاوی، المقاصد الحسنة فی بیان کثیر من الاُحادیث المشتهرة علی الألسنة، طبع هند۔

۲۴- طبرانی: ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی الشامی الطبرانی، المعجم الصغیر، دار الکتب العلمیة، بیروت۔
۲۵- علی متقی هندی: کنز العمال من سنن الاقوال و الافعال، دائرة المعارف العثمانیة، حیدر آباد ۱۹۶۴ء۔
۲۶- مالک بن انس الاصبحی، المؤطا۔
۲۷- مسلم بن حجاج القشیری النیسا بوری، صحیح مسلم،
۲۸- منذری، زکی الدین بن عبد القوی المنذری، الترغیب والترهیب من الحدیث الشریف، تحقیق: ابراهیم شمس الدین، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، ۱۹۹۶ء
۲۹- نسائی، ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی، سنن النسائی۔

شروح حدیث

۳۰- ابن حجر، الحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، مطبع مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء، دار الفکر بیروت، لبنان، ۱۹۹۶ء
۳۱- خطابی، ابو سلیمان احمد بن محمد، معالم السنن، المطبعة العلمیة حلب، ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء
۳۲- عینی، بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد، عمدة القاری شرح صحیح البخاری، مطبع مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء
۳۳- قسطلانی، احمد بن محمد بن ابی بکر بن عبد الملک بن احمد بن حسین بن علی القسطلانی المصری الشافعی، ارشاد الساری فی شرح صحیح البخاری، مطبع: نول کشور، کان پور ۱۲۸۴ھ
۳۴- مناوی، محمد المدعو بعبد الرؤف، التیسیر بشرح الجامع الصغیر۔
۳۵- نووی، محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف، شرح صحیح مسلم، دار الریان للتراث قاهرة، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء

سیرت، تاریخ و تذکرہ

۳۶- ابن الاثیر: عز الدین ابو الحسن علی بن محمد الجزری، أسد الغابة فی معرفة الصحابة، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان ۱۹۹۵ء
۳۷- ابن الاثیر: الکامل فی التاریخ، تحقیق: ابو الفداء عبد الله القاضی، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان ۱۹۹۵ء
۳۸- ابن حجر: الحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی، الإصابة فی تمییز الصحابة، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵ء

۳۹- ابن حجر: تهذیب التهذیب، تحقیق: مصطفی عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیة بیروت، لبنان ۱۹۹۴ء
۴۰- ابن سعد: ابو عبد الله محمد بن سعد بن منیع الزهری، الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت۔
۴۱- ابن عبد البر: ابو عمر یوسف بن عبد الله بن محمد القرطبی المالکی، الاستیعاب فی معرفة الأصحاب، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵ء۔
۴۲- ابن عبد البر: الدرر فی اختصار المغازی والسیر
۴۳- ابن العماد: عبد الحی بن احمد بن محمد ابن العماد العکری الحنبلی، شذرات الذهب فی أخبار من ذهب، دار ابن کثیر دمشق بیروت، ۱۹۸۸ء
۴۴- ابن قیم: شمس الدین ابو عبد اللّٰه بن محمد بن ابی بکر الحنبلی الدمشقی، زاد المعاد فی هدی خیر العباد، تحقیق: شعیب الأرنؤوط، عبد القادر الأرنؤوط، طبع بیروت ۱۹۸۷ء
۴۵- ابن کثیر: ابو الفداء عماد الدین اسماعیل، البدایة والنهایة۔ دار الریان مصر، ۱۹۸۸ء
۴۶- ابن کثیر: السیرة النبویة، تحقیق مصطفیٰ عبد الواحد، دار المعرفة بیروت، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء
۴۷- ابن هشام: ابو محمد عبد الملک، السیرة النبویة، تحقیق: مصطفی السقا وغیره، دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان، ۱۹۹۴ء۔ تحقیق: محمد محی الدین عبد الحمید، طبع القاهرة، مصر
۴۸- حلبی: ابو الفرج نورالدین علی بن برهان الدین ابراهیم بن احمد الحلبی، انسان العیون فی سیرة الامین المامون المعروف بالسیرة الحلبیة، دار المعرفة بیروت، لبنان۔
۴۹- دیار بکری: حسین بن محمد الحسن الدیار بکری، تاریخ الخمیس فی أحوال انفس نفیس۔
۵۰- ذهبی: شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذهبی، تاریخ الاسلام (السیرة النبویة) تحقیق: الدکتور عمر عبد السلام تدمری، دار الکتاب العربی، بیروت لبنان، ۱۹۹۴ء
۵۱- ذهبی: تذکرة الحفاظ، دائرة المعارف العثمانیة، حیدر آباد ۱۳۳۳ھ
۵۲- زرقانی: ابو عبد الله محمد بن عبد الباقی بن یوسف بن احمد بن شهاب الدین بن محمد، شرح الزرقانی علی المواهب اللدنیّة بالمنح المحمدیة، دار الکتب العلمیة، بیروت لبنان، ۱۹۹۶ء

۵۳- طبری، ابو جعفر محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان ۱۹۹۷ء
۵۴- مقریزی، تقی الدین احمد بن علی بن عبد القادر بن محمد المقریزی الشافعی الاثری، إمتاع الأسماع بما للرسول من الأحوال والأموال و الحفدة و المتاع۔

فقہ وفتاویٰ، حکمت دین وفرق

۵۵- ابن تیمیة، تقی الدین ابو العباس احمد بن تیمیة الحرانی، مجموع فتاویٰ شیخ الإسلام، جمع و ترتیب: عبد الرحمن بن محمد بن قاسم العاصمی، دار العربیة بیروت، لبنان ۱۳۹۸ھ
۵۶- ابن تیمیة: منهاج السنة النبویة فی الرد علی الشیعة والقدریة، المطبعة الکبریٰ الأمیریة، بولاَق، مصر ۱۳۲۱ھ
۵۷- ابن عابدین، محمد أمین بن عمر بن عبد العزیز، رد المحتار علی الدر المختار، المطبعة العثمانیة، مصر ۱۳۲۷ھ
۵۸- غزالی، ابو حامد محمد بن محمد الغزالی، احیاء علوم الدین، دار الکتب العربیة الکبری مصر، ۱۳۳۴ھ

لغات

۵۹- ابن الأثیر، مجد الدین ابو السعادات المبارک بن محمد الجزری، النهایة فی غریب الحدیث و الأثر، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان۔
۶۰- ابن منظور، ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری، لسان العرب، دار صادر، بیروت، لبنان ۱۹۹۴ء
۶۱- نووی: محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی، تهذیب الأسماء واللغات، ادارة الطباعة المنیریة، مصر۔

مصنف کی بعض تصانیف جن کا حوالہ کتاب میں آیا ہے

۶۲- اسلام کی دعوت
۶۳- تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث
۶۴- غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق
۶۵- معروف ومنکر
(مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی)